ناول

ہڑپا

طاہرہ اقبال

طاہرہ اقبال نے ایک متمول زمین دار گھرانے میں جنم لیا۔ ان کا تعلق ضلع ساہیوال کے ایک دُور افتادہ گاؤں سے ہے جہاں بجلی کی سہولت بھی میسّر نہ تھی۔ انھوں نے پرائیویٹ طور پر تعلیم حاصل کی اور کالج کو اپنی زندگی میں پہلی بار بطور لیکچرار ہی دیکھا۔ پروفیسر ڈاکٹر طاہرہ اقبال پچھلے تیس برس سے اپنے تدریسی فرائض کو بہترین انداز سے سرانجام دے رہی ہیں۔ ان کی زیرِ نگرانی ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعدد مقالہ جات پایۂ تکمیل کو پہنچے۔ طاہرہ اقبال اُردو افسانے اور ناول کا ایک معروف نام ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کا بنیادی موضوع پنجاب کا دیہات ہے۔ خصوصاً کسان عورت، خانہ بدوش عورت کے مسائل، جاگیرداری نظام میں جکڑا زرعی معاشرہ اور نچلے طبقے کے شب و روز کی حقیقی عکاسی اُن کی تحریروں کا وصف ہے۔ انھوں نے ایک منفرد اسلوب میں دیہی تہذیب کی منظر کشی کرتے ہوئے مقامی بولیوں کے ذخیرۂ الفاظ کو اُردو زبان کا حصہ بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ صاحبِ اسلوب ادیب ہیں۔ صرف ''نیلی بار'' ہی ان کو بڑے ناول نگاروں کی صف میں لاکھڑا کرتا ہے۔ یہ ناول تو طاہرہ اقبال کی شناخت بن چکا ہے۔ بقول مستنصر حسین تارڑ'' کاش مجھ میں بھی اتنی صلاحیت ہوتی کہ میں ''نیلی بار'' کے پائے کا کوئی ناول لکھ سکتا۔ لیکن یہ تو صرف طاہرہ کے نصیب میں تھا۔'' ان کے ناول ''گراں'' کو انقرہ یونیورسٹی شعبہ اُردو نے پی ایچ ڈی اُردو کے نصاب میں شامل کیا ہے۔ افسانوں کے مجموعے ''زمیں رنگ'' اور ناول ''گراں'' کو اکیڈمی آف لیٹرز نے 2014ء، 2019ء کی بہترین کتب کا ایوارڈ بھی دیا۔ پروین شاکر ٹرسٹ کی جانب سے بھی ''گراں'' کو بیسٹ فکشن ایوارڈ دیا گیا۔ ''گنجی بار'' جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کے ایم اے کے نصاب میں بھی شامل رہی۔ کئی افسانوں کے تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ ان کے فن اور شخصیت کے حوالے سے مختلف جامعات کے شعبہ اُردو ایم فل، ایم اے اور بی ایس کی سطح پر مقالات کروا چکے ہیں جن کی تعداد پچیّس سے زائد ہے۔ تخلیق کے علاوہ اُن کا تحقیقی کام بھی قابلِ قدر ہے۔ ایچ ای سی سے منظور شدہ جرائد میں ریسرچ پیپرز شائع ہونے کے علاوہ ''منٹو کا اسلوب'' منٹو پر لکھی کتابوں میں ایک اہم کتاب قرار پائی ہے۔ ان کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ''پاکستانی اُردو افسانہ، سیاسی و تاریخی تناظر میں'' ایک وقیع اور ضخیم تحقیقی و تنقیدی کام ہے۔ یہ دونوں مقالے پاکستان اور انڈیا میں چھپ چکے ہیں۔ طاہرہ اقبال کئی برس روزنامہ خبریں اور روزنامہ جنگ میں باقاعدگی سے کالم لکھتی رہی ہیں۔

ناول

طاہرہ اقبال

جہلم۔ پاکستان
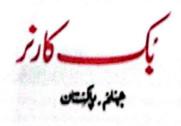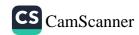
Harappa
by Tahira Iqbal
Jhelum: Book Corner. 2023
430p.
1. Novel - Fiction
ISBN: 978-969-662-474-5

بانی مہتمِ اعلیٰ: شاہد حمیدؔ
ناشرین: گگن شاہد * اَمر شاہد

اشاعت: فروری 2023ء
کتاب: ہڑپا (ناول)
مصنفہ: طاہرہ اقبال
لفظ خواں: میاں محمد ارشد
سرورق مصورہ: پرادیکشا بوتھ (بھارت)
سرورق ڈیزائن: ابوامامہ
تزئین و زیبائش: ہادیہ
خطّاط: احمد علی بھٹہ، محمد شکیل طلعت
کمپوزنگ وصفحہ سازی: محمد عمر فاروقی
کتابت: نُوری نستعلیق، علوی نستعلیق
مطبع: مکتبۂ جدید پریس، لاہور
ناشر: بک کارنر
ویب سائٹ: www.bookcorner.com.pk

بک سٹور: بک کارنر شوروم، بالمقابل اقبال لائبریری، اقبال لائبریری روڈ، جہلم، پاکستان 49600
00 92 544 278051, 00 92 544 614977 00 92 314 4440882, 00 92 321 5440882
bookcornerjlm /bookcornershowroom /bookcorner
bookcornerjhelum info@bookcorner.com.pk

بنائے ہوئے کو بگاڑتی اور بگاڑے ہوئے کو سنوارتی

ہڑپا فطرت کے نام

فہرست

ہڑپا فطرت

فیوڈل معاشرے سے حالتِ جنگ میں

ڈاکٹر طاہرہ اقبال سے میری پہلی ملاقات بہت عرصہ قبل لاہور میں ہوئی تھی، تاریخ اور سال یاد نہیں۔ الحمرا میں کوئی ادبی کانفرنس تھی، وہاں میں نے بھی پڑھا اور طاہرہ اقبال نے بھی۔ وہ اپنی از حد شیریں آواز میں افسانہ پڑھ رہی تھیں۔

نرم گفتار طاہرہ اقبال مگر ایک گرم اور گرمجوش قلم رکھتی ہیں۔ بلوچوں سے ہمدردی رکھنے کے ساتھ ساتھ پنجابیوں کی بے گناہی ثابت کرنے کا روایتی پنجابی علم بلند کیے طاہرہ وہاں سے ہر طرح کی ون یونٹی زیادتیوں سے انکار کرتی جاتی ہے۔ اقرار کرے گی بھی تو اُسے ایک فرد کی خطا کاری قرار دے کر بقیہ پانچ دریاؤں کو بَری قرار دے گی۔

ایک عام دیہی فیوڈل زندگی کی پروردہ طاہرہ اسی دیہی زندگی کی شاخوں، تنوں اور جڑوں کو کاٹنے کے لیے بڑی ہوتی گئی۔ آپ تصور کر سکتے ہیں کہ اس کے پاس کتنا مواد، کتنے عنوانات اور کتنے موضوعات ہوں گے۔

وہ اپنے حواسِ خمسہ سے محسوس ہی نہیں کرتی، بہت عمیق مشاہدہ بھی کرتی ہے۔ گہرا، کھرا اور بے نقاب مشاہدہ۔

''سنگت'' کے بلوچستان میں طاہرہ اقبال کو خوب پڑھا جاتا ہے، احترام، دلچسپی اور توجہ سے۔ میں نے احباب کو اس کے افسانوں اور ناولوں پر بحثیں کرتے دیکھا ہے۔ ''کمال'' کا لفظ اُن سے یوں بار بار ادا ہوتا ہے جیسے اُن کا تکیہ کلام ہو۔ دل کرتا ہے طاہرہ کے نام کے ساتھ ''کمال'' لگا یا جائے مگر تہذیبوں کی نازکیاں، باریکیاں بھیانک جنگل بن کر مانع ہوتی ہیں۔ وہ چاہے نہ چاہے، مانے نہ مانے مگر سچ یہ ہے کہ طاہرہ اقبال سنگت اکیڈمی آف سائنسز کی پنجاب شاخ کی اعزازی سربراہ ہے، آج بھی، کل بھی۔

افسانے کی گل پاشی کرنے والی اِس مصنفہ نے اپنی اولین فصل کا نام ''سنگ بستہ'' رکھا۔ 216 صفحات پر مشتمل کہانیوں کا یہ مجموعہ 1999ء میں شائع ہوا۔ طاہرہ بہت مقامی رنگ دے کر جبر کے آفاقی نظام کو اکھاڑنے کے لیے لکھتی ہے۔ ''گنجی بار'' اس کی مثال ہے۔ اکثر ایسا لگتا ہے کہ طاہرہ اقبال قاری کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ لائے بغیر سماج پہ زبردست طنز کر جاتی ہے۔ نامعلوم و نامحسوس طور پر وہ فیوڈل نظام کا تمسخر اڑاتی ہے۔ یہ مجموعہ 2008ء میں چھپا۔ فیوڈل نظام کی دشمنی نے اُس کی دوسری کتاب ''ریختت'' کا روپ دھار لیا جو 2003ء میں شائع ہوئی۔ ''زمیں رنگ'' 2014ء میں آئی۔

شارٹ سٹوری کی ایک ایک وادی، ایک ایک کہسار سے واقف یہ فنکار کبھی کبھی اپنی تخلیقیت کو اس نسبتاً تنگ قالب میں رکھنے سے بے بس ہو جاتی ہے۔ ارے یہ تو ناول جتنی کہانی بن گئی۔ ایک شارٹ سٹوری اور ایک ناول کے بیچ کی چیز: ناولٹ!!

میرا کہنا ہے کہ طاہرہ کا افسانہ ہی ناولٹ ہوتا ہے، گو کہ وہ خود دو ناولٹس کا تذکرہ کرتی ہے: ''مٹی کی سانجھ'' (2009ء) اور ''رئیسِ اعظم''۔ یہ بھی 2009ء کا زمانہ ہے۔

اُس کی مرضی کچھ بھی کہے، میں اس کے ہر ناول کو ٹرایالوجی بنانے کی فرمائش کرتا رہتا

ہوں۔ وہ جس کیریکٹر کو بیان کر رہی ہوتی ہے تو اسے اس قدر گہرائی میں بیان کرتی ہے کہ جذبات تلے دفن شدہ قاری ساتھ رہنے کو اپنی ہلکان گھوڑی کو چابکیں مارتا جاتا ہے۔

اُس کے ایک ناول کا نام ''نیلی بار'' ہے۔

وہ بے علمی کی شدید ترین مخالف ہے۔ اُسے دیہی جامد زندگی میں ارتعاش لانے کی فکر ہوتی ہے۔ طاہرہ اقبال پسماندگی کی بہت مخالف ہے اور یہ ساری نشانیاں جاگیرداریت کی ہیں۔ لہٰذا طاہرہ اقبال فیوڈل ازم کی شدید ترین مخالف ہے۔ خواہ وہ اس نظام کو توڑنے کی بات کرے نہ کرے مگر وہ اس مکروہ نظام کی ایک ایک تہ، ایک ایک سلوٹ میں جا کے اپنا مائیکروسکوپ لگا آتی ہے۔ اتنی باریک بینی سے وہ جاگیرداری کے بخیے ادھیڑتی رہتی ہے کہ رشک آتا ہے۔ وہ یہ محنت بہت ایمانداری سے کرتی ہے اور بہت ہی باوقار انداز میں اپنی بات کہانی کے کرداروں کے حوالے کرتی جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال سماج کی ساری بیماریوں کے لیے اس جاگیردار کو ذمہ دار دکھاتی ہے۔ اُس جاگیرداری نظامِ پیداوار کے نیچے بے کراں حبس و بے بسی میں بلبلاتی، بدترین توہم پرستی اور عقیدت پرستی میں مبتلا عوام کی روحیں ہمہ وقت پیر، خلیفہ اور مرشد تخلیق کرتی جاتی ہیں۔ عوام اپنے گھڑے ہوئے اِس پیر کو ظاہری باطنی سپر پاوری کی خود طاقتیں دے بیٹھتے ہیں اور پھر اپنی ہی دستبردار شدہ چھوٹی خواہشوں کے حصول کے لیے اس کے سارے ناجائز احکامات، خوابوں، تعبیروں اور پیش گوئیوں کے آگے ذبح ہونے کو قطار اندر قطار گردنیں لمبی اور ننگی کیے لیٹ جاتے ہیں۔

طاہرہ اقبال جب اس جاگیرداری سماج پر بے دردی سے نشتر زنی کرتی ہے تو اُسے جاگیردار کی خدمت گار دو اور قوتیں بھی نظر آتی ہیں: بیوروکریسی اور سیاست دان۔ فیوڈل کی مرضی کا تھانے دار، اے سی اور پٹواری اُس کے نظام کی بوسیدگی کے لیے ستون و پیوند بنے رہتے ہیں۔ پھر وہی جاگیردار شہر میں تاجر و افسر طبقہ کے شوٹنگ اور ڈانسنگ کلبوں میں حصہ دار ہوتا ہے اور اُس کے اِن سب فاضل پرزوں کا مجموعی خرچہ کسان برداشت کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال اِس جاگیردار، اِس پیر، اِس اے سی، تھانے دار اور شہر کے تاجر و بیوروکریٹ کے گھر میں جھانکتی ہے تو پھر عورت کی بدترین مظلومیت اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ بدترین طبقاتی نظام میں ''آقا عورت'' اور ''غلام عورت'' دونوں برباد زندگیاں گزارتی ہیں۔ آپ ہڑپا ناول دیکھ لیں۔ ملک افتخار، صنوبر، بڑی بی بی وغیرہ کی یہ کہانی فیوڈل جائیداد اور وراثت کی کہانی ہے۔ ہر ایک موضوع بہت باریکی اور ہنرکاری سے بیان کیا گیا ہے۔

ناول میں اس کے تخلیقی فقرے کسی بھی رائٹر کو صدقے واری کرنے کو مجبور کرتے ہیں۔ طاہرہ اشکوں سے لکھتی جاتی ہے اور ہم پڑھتے ہوئے اشک باری اور دانت اور مٹھیاں بھینچنے میں اُس کی پیروی کرتے جاتے ہیں۔ طاہرہ کو کسان کمیٹی کی تاعمر صدر ہونا چاہیے اور اگر یہاں واقعتاً کوئی کمیونسٹ پارٹی ہوتی تو وہ اُس کی سربراہ ہوتیں۔

فیوڈل ازم کے مارے دیہات میں اگر ایک طرف چودھری یعنی وڈیرہ اپنے حواریوں کے ساتھ موجود ہے تو اُن کے بالکل الٹ جانب غربت کے کھڈے کی تہہ میں پڑے تباہ حال انسان نما جاندار ہیں۔ آپ چاہیں تو انھیں کسان، ہاری یا راھک کہیں، چاہے تو کھیت مزدور کہہ دیں۔ ایسے لوگ جن کی بکریوں کے دودھ سے لے کر اُن کی عصمت وعزت تک سب کچھ اس چودھری کے حوالے ہے، مشقت، ہتک، نیم شکمی، بے خوابی۔ کہیں کہیں دیکھو تو اِن انسان نما لوگوں سے جانور زیادہ معتبر زندگی گزارتے ہیں۔

طاہرہ اقبال ایک روشن فکر لکھاری ہے۔ اُسے سماج بالخصوص دیہی سماج پہ مسلط فیوڈل ازم کی چیرہ دستیاں بیان کرنا آتا ہے۔ وہ بہت بہادری کے ساتھ رواجوں، رسموں اور روایتوں پہ بلڈوزر پھیرتی ہوئی اپنی کہانی کا راستہ بناتی جاتی ہے۔ وہ اِس نظام سے نفرت کرتی ہے۔ اسے تبدیل ہوتا دیکھنا چاہتی ہے۔ ہمارے ماہنامہ ''سنگت'' میں اُس کا ہر بھیجا ہوا افسانہ معزز و محترم جگہ پاتا رہا ہے۔ ایسا افسانہ جس کی دو خصوصیتیں ہوتی ہیں۔

ایک تو یہ کہ آپ اُس افسانے کو دو مرتبہ پڑھنے پہ مجبور ہیں۔ پہلی مرتبہ تو اس لیے کہ کہانی مزیدار اتنی ہوتی ہے کہ رُک کر سوچنے کے لیے نہ دماغ آمادہ ہوتا ہے اور نہ دل کرتا ہے۔ طاہرہ پڑھنے والے کو شروع کے دو ہی فقروں میں قابو کر لیتی ہے اور یہی بھرپور کمان وہ پوری تحریر پڑھنے کے بعد زندگی بھر جاری رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اسے زبان پہ، بیان پہ بھرپور کمان حاصل ہے۔ قاری تو پھر نرم و گداز پنجوں کی گرفت میں آ ہی جاتا ہے۔ موضوعات بھی اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ شروع میں خالصتاً جنسی ذائقے میں ملبوس لگتے ہیں۔ بے باک، لذت سے بھرے۔ بس روانی سے پڑھتے جاؤ، بغیر رکاوٹ کے، بغیر وقفہ کے۔ کیا بے باک لکھتی ہے! کیا چاشنی بھرا اسٹائل ہوتا ہے! سیدھی باتیں، بغیر عبایہ اوڑھائے ہوئے الفاظ۔ اس حد تک کہ میرے رسالے کے بہت ہی مومن صفت قاری جب اس کے افسانوں کا تذکرہ کرتے ہیں تو ادبی لفاظی اور اصطلاحات کے نقابوں، فصیلوں میں چھپ کر کرتے ہیں۔ اولین فقروں میں ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ طاہرہ کے افسانے نے موصوف کے محض کانوں کی رنگت ہی گاڑھی نہیں کر دی بلکہ اُس کی آنکھوں میں ''آنکھ چرائی'' بھی بھر دی ہے۔ یہ جو پاکدامنی کی دھاک ہے نا، یہ ریاکاری کے پے در پے اور مسلسل بلیدانوں کے بغیر قائم رہ ہی نہیں سکتی۔ طاہرہ اقبال کے افسانوں پر چلتے چلاتے میں یونہی سرسری طور پر تبصرہ کرنے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ اگلے نے یہ افسانہ صرف ایک بار پڑھا ہے۔ بھئی ڈلغ کی دیگ میں اوپر کی چسکیوں کا مزہ بھی ہوتا ہے مگر اُس تہہ میں لگی ہوئی نیم جلی، نیم ٹھوس شدہ کرنڈی کو چبائے بغیر آپ کو ''ڈلغ شناس'' کہا ہی نہیں جا سکتا۔ طاہرہ اقبال کے افسانے کو ایک دفعہ پڑھنا اُسے نہ سمجھنے کے مترادف ہے۔

دیہی زندگی کرخت زندگی ہوتی ہے۔ کھردری جیسے ڈی ہائیڈریٹ شدہ مریض کی زبان۔ شدید جیسے ضیاء الحق کے کوڑے، سچی اصلی جیسے جون میں سبّی کا سورج اور حتمی پکی دو ٹوک جیسے بادشاہ کا فرمان۔ دیہی زندگی سے متعلق ہونے والے مشرقی بلوچستانی کے لیے

اُس کے پنجابی الفاظ ومحاورے بالکل مشکل نہیں ہوتے۔ چنانچہ، پہلی بار تو کہانی، الفاظ، محاوروں اور زبان کے مزے لینے کے لیے پڑھو۔ بھئی وہ لکھتی نہیں گاتی ہے۔

ہاں، مگر چاشنی کے سارے رنگوں میں مشکل اور نامانوس پنجابی الفاظ کے در آنے سے بھنگ بوریوں کے حساب سے ڈل جاتی ہے۔ رنگ اور بھنگ گتھم گتھا ہوجاتے ہیں۔ اس قدر خوفناک یدھ پڑجاتی ہے کہ قاری اپنی ''اوقات'' میں واپس آجائے۔ بس غصہ سے چیخ نکل جاتی ہے:

کی کری جاناں اے

کی کری جاناں اے

ہم نے بار بار اُس کی توجہ اس طرف دلائی۔ وہ اگر ہر پیراگراف میں گن کر 20 فیصد پنجابی الفاظ اردو میں بدل سکے تو میں اسے سو روپے انعام دوں گا۔ اسے خود بھی اس کا احساس ہے۔ ہم دونوں متفق ہیں کہ پنجابی الفاظ شامل کرنے ضروری ہیں مگر یہ خیال بھی رکھنا چاہیے کہ نمک بہت زیادہ نہ ہوجائے۔ بالخصوص جب آپ قاری کو ایلورا اور اجنتا کے مناظر میں غرق کر چکے ہوں۔

ایک پہر یا ایک روز کے وقفے کے بعد دوبارہ پڑھو اُس کی گہرائی ناپنے کو۔ آپ کو جنس میں نفسیات، دیہات میں معاشیات اور سماج میں پولیٹکل اکانومی کی تہیں دکھائی دیں گی۔ میرا اُس کے نئے قاری کے لیے ایک مشورہ یہ ہے کہ اس کا ہر افسانہ اور ناول دو بار پڑھا جائے۔

اُس کی تحریر کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگلے ہفتہ دس دن تک وہ اور اس کے کردار آپ کے ساتھ ساتھ رہتے ہیں، آپ کے ذہن کے کندھے پہ سوار، آپ کی ساری سوچوں پہ مسلّط وہ آپ کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ ہمارا تجربہ ہے کہ اس کا افسانہ ایک شخص پڑھ کر اپنے پورے حلقۂ احباب میں اُسے دہراتا رہتا ہے۔

طاہرہ اقبال کی کہانیاں میری تو گردن کو سامنے کی طرف سے دبوچے رہتی ہیں۔ پڑھتے ہوئے ہر جگہ حتماً کہہ دیتا ہوں کہ یہاں افسانہ ختم ہونا چاہیے مگر وہ کلائمیکس پر کلائمیکس دیتی جاتی ہے اور یوں وہ اسے میرے وہم وگمان سے بھی بلند، کوہِ شاشان کی چوٹی پر پہنچا دیتی ہے۔

طاہرہ پنجاب کے دیہات کی قصہ خوانی کرتی ہے۔ دیہات اُس کی کہانی کے ٹیک سنگھ کا ٹوبہ ہے۔ سچی، کھری، بے حجاب اور حقیقی سچی کہانیاں۔ اگر وہ اپنی کہانیوں کے سچی ہونے کا خود دعویٰ نہ بھی کرتی تب بھی ملاوٹ کی بدبو کہیں نہ کہیں تو نظر آتی۔ نہ مبالغہ، نہ لاف زنی، نہ قسمیں، نہ تسلیاں۔ مجھے اس کی کہانیوں میں ایک فیصد بھی ''گوئبلزی'' نظر نہیں آتی۔ وہ حقائق میں کوئی خوامخواہ والی ڈرافٹنگ، کرافٹنگ نہیں کرتی۔ طاہرہ اقبال، اپنے کرداروں سے فطری زبان بلواتی ہے۔ اُس کے ہاں اگر مگر والی، اشاروں کی گفتگو ہوتی ہی نہیں۔ برملا اور spontaneous گفتگو۔ کبھی جادوگری سے کسی کے کان کے نیچے تھیلا لٹکا کر وہاں سے انڈہ نہ نکالا۔ بس فطری بے نقاب دیہی سچائیاں ہیں حتیٰ کہ اس نے تو الفاظ، اصطلاحات، استعارات، ضرب الامثال اور بھرپور سُچی دعائیں اور گالیاں تک سب خالصتاً دیہات کے استعمال کیے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ پورے کے پورے فقرے پنجابی کے استعمال کرتی ہے۔ یہ کتنا بڑا رسک ہے۔ اس کے قارئین کی واضح اکثریت غیر پنجابیوں کی ہے مگر حیرت ہے کہ محض شہری اردو والوں پر ہی پنجابی الفاظ کی یہ آمیزش گراں گزرتی ہے، بقیہ لوگ کسی نہ کسی طرح تو دیہات سے وابستگی رکھتے ہیں۔ جہاں الفاظ مختلف ہوسکتے ہیں مگر دیہی فیوڈل زندگی کے مظاہر تو وہی ایک سے ہوتے ہیں۔ طاہرہ! مگر تم مایوس نہ ہونا۔ اپنی ماں کی بولی کا حق ادا کرتی رہنا۔ تمھاری زبان والے بے شک تمھیں کم پڑھیں مگر ''بلوچ'' تمھیں پڑھتا ہے اور بہت تکریم سے پڑھتا ہے۔

طاہرہ عورت کو بیان کرتی ہے۔ عام اور سرسری نہیں بلکہ تفصیل کے ساتھ، وضاحت

کے ساتھ، آنکھ سے بھی اور دُور بین خوردبین سے بھی۔ وہ نہ صرف پامال، کچلی، مسلی ہوئی عورت کو موضوع بناتی ہے بلکہ وہ تو رانی، مہارانی، چودھرانی اور بیگم صاحباؤں کو بھی لکھتی ہے۔ مگر اُس کی عورت ہُوبہو شاہ لطیف کی عورت جیسی ہے۔ کراہیت، بے جوڑ کی شادیاں اور جمالیاتی تمناؤں، آرزوں کی قاتل جاگیرداریت میں بھی بغاوت کنندہ عورت۔ اپنی محرومی، پسماندگی، جہالت، بے حیثیتی اور بے بسی سے خوب شناسا عورت مگر متحرک، متجسس، نبردآزما اور ایک بھرپور زندگی جیتی عورت۔ ادراک والی عورت، جو خود پر ہونے والے جبر کو سونگھ، ناپ اور تول سکنے کی حس رکھتی ہے۔ نہ وہ آمنّا کہتی ہے نہ صدقنا۔ ظلم کے سامنے کیا صبر کیا شکر؟ طاہرہ کی عورت غیر منظم ہوتی ہوئی بھی اپنی نجات کے لیے نبرد آزما ہے۔

(اُس کے ناول ہڑپا میں فیوڈل گھر میں بیٹی صنوبر کا کردار بہت دلسوز ہے۔ وہ بالغ ہو رہی ہے اور اُس عمر کے ساتھ ساتھ جسمانی تبدیلیاں گھر کی بڑی کو بری لگتی ہیں۔ یہ نارمل انسانی تبدیلیاں اُس سخت گیر بڑی بی کو برائی، گناہ اور بدی لگتی ہیں۔

چنانچہ جسمانی تبدیلیوں کے ساتھ جو نفسیاتی نئی چیزیں آتی ہیں، وہ تو ایک باقاعدہ رہنمائی مانگتی ہیں مگر یہاں اس کے برعکس جسمانی تبدیلیوں کو برائی کے بطور طعنے دے دے کر ان نفسیاتی نئی چیزوں کو بھی سختی سے دبا دیا جاتا ہے۔)

اُس سماج میں عورت محکومی اور قطار اندر قطار پابندیوں میں گھری ہوئی ہے۔ اُس کے لیے گھر گھر نہ تھا بلکہ وہیں گھر میں اسے دنیا کی ہر روشنی سے محروم رکھ کر ذہنی، جسمانی اور سماجی طور پر ایک جانور جیسا رکھا گیا تھا۔

وہ جاگیرداری سماج میں المناک بیگانگی کو بہت المناک انداز میں دکھاتی ہے۔ ہڑپا ناول میں جاگیردار کے دونوں بیٹوں کا قتل، تیسرے کی پیدائش، بڑھاپے میں جوانی والی حرکات.... طاہرہ جاگیرداری نظام کی مُدوائف ہے، ہر کراہ کا مطلب اور تشریح جانتی ہے۔ ہر مغرور فقرے کی تہہ میں چھپی ڈپریشن کو چھان نکالتی ہے۔ جاگیردار کی اوطاق اور اس کا

گھر بڑے پیمانے کے ''سازش خانے'' ہیں۔ ایک dull اور بے ذائقہ زندگانی کے اندر کتنے واقعات وہاں پیدا ہونے والے جائز اور ناجائز اولاد پیدا ہونے کی طرح رونما ہوتے رہتے ہیں۔ طاہرہ ہر واقعہ کی فنکارانہ انداز میں تخلیق کرتی ہے اور اسے بہت ناز کی اور باریکی سے پال پوس کر بڑا کرتی جاتی ہے۔ ہر موڑ ایک سبق، ہر اُتار ایک عبرت اور ہر چڑھاؤ آرٹسٹک۔

جاگیردار کے بند گھر میں جب نیا زمانہ ٹھوکر مار کر داخل ہوجاتا ہے تو نقشہ ذہن میں لائیے کہ کیا ہوگا۔ غرور، غیرت غارت۔ زندگی بھر جو بولا گیا، ساری تھوک چاٹنی پڑتی ہے۔ زندگی بھر جو کچھ منع کیا اور جس کا حکم دیا اُس سب کا الٹ اپنے گھر میں۔ ہڑپا پڑھیے، طاہرہ کس مہارت سے یہ سب کچھ اپنے ناول کے پیرہن کی جھالر میں ٹانکتی جاتی ہے۔

طاہرہ اقبال اپنی بات کو دلچسپ بناتی جاتی ہے۔ ''ہڑپا'' اس کی عادت کے مطابق بے شمار متوازی کہانیوں کے ساتھ ساتھ چلتی ہے اور مجموعی طور پر یہ فیوڈل دور میں موجود ''خوف'' کی کہانی ہے جس میں اُس سماج کا ہر فرد مبتلا ہوتا ہے۔ موت کا خوف، happening کا خوف، باوجہ خوف، بلاوجہ خوف....

آریا نام کے ہڑپا کے پہرے دار کے ساتھ دیہاتن لڑکی چنّاں کی محبت کی شدت کو طاہرہ سے زیادہ بہتر لکھنے والا اس پورے خطے میں نہیں ملے گا۔

طاہرہ اقبال عورت کو موضوع بنا کر فیوڈل ازم پہ کوڑے بازیاں کرتی ہے۔ اُس کی تحریر میں ہر ایک فقرے کے پیچھے ہتھیاروں کا انبار نظر آئے گا، میں نے کچھ فقرے چُنے ہیں جو ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں:

* ''میں آپ ہی آپ تو کنجری نہیں ہوگئی، بنانے والوں نے بنایا'' یا
* ''کنجری آپ ایک ذات ہے۔''

طاہرہ کے قلم کی بیان شدہ عورت بہت شدت سے محبت کرتی ہے۔ بہت شدت سے

وفا کرتی ہے اور وہ بہت شدت سے محنت کی زندگی گزارتی ہے۔ طاہرہ عورت کو وقار بخشتی ہے۔ اُس کی طرفداری کرتی ہے۔ اُس کا وقار اور گھمنڈ اور ego بچا کر رکھتی ہے۔ اُس کے ناول ''ہڑپا'' کا یہ خوبصورت ٹکڑا تو دیکھیے:

''بالی بالی۔''

اُسے لگا وہ ادھورا نام پکار رہی ہے۔ اس آواز پر تو کوئی دوسری بالی باہر نکل آئے گی۔ بالی کمہارن، بالی ونجارن، بالی ماچھن، بالی موچن، بالی نائین۔ کوئی بھی بالی ہو سکتی ہے۔

یہاں نام کے ساتھ پیشہ پکارا جانا ضروری ہوتا ہے۔ چند مروج ناموں کی شناخت کے لیے پیشہ یا رشتہ ضروری ہے۔

چناں نے سوچا۔ نہ کمہاری خود برتن چاک پر چڑھاتی ہے، نہ موچن خود جوتے سیتی ہے، نہ جولاہی خود تانے بانے تنتی ہے۔ اُن کے مرد یہ سب کرتے ہیں تو اُن کے مردوں کے پیشے اُنھیں بھی ادھار پر مل گئے ہیں۔

لیکن بالی تو واحد ہے جو خود اپنے پیشے کے ساتھ پکاری جاتی ہے۔ یہ پیشہ کسی مرد کا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ واحد پیشہ ہے جو بالی کے لیے وقف ہے۔ ورنہ درزی، باورچی، دستکار، ہر زنانہ پیشے میں بھی مرد گھس آتے ہیں۔

لیکن بالی اپنے پیشے کی خود مالک ہے۔

''بالی نی بالی کنجری۔'' یا

پنجاب کے خانہ بدوش لوگوں (پکھی) میں اس نے زبردست چیزیں نوٹ کیں۔

مثلاً:

* اُن کی زندگیوں کے اس قدر سکون کی وجہ شاید یہی ذاتی ملکیت سے دستبرداری تھی۔ گھر، مکان، بستی، شہر، سبھی سے شخصی ملکیت کی دستبرداری۔

* طاقت کا ترازو عورتوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہی شاید دنیا کی پُرسکون ترین معاشرت ہے۔
* بیوی کا شوہر سے پٹنا اِس معاشرت میں اتنا ہی ضروری جتنا ضروری مباشرت۔
* لڑکیاں کالکیں کبھی نہیں مرتیں، اُن تک کبھی بددعا نہیں پہنچتی۔ اُن کو تو مخاطب ہی مرجانیے کے ساتھ کیا جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی نہیں مرتیں۔ مرتے تو لڑکے ہیں جنھیں مخاطب ہی جیون جوگے کے خطاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ پھر بھی مرجاتے ہیں۔

وہ اگر بہت ہی بولڈ انداز میں جنسی معاملات پہ لکھتی ہے تو اتنے ہی گداز سے وہ محبت پہ بھی لکھتی ہے۔

وہ صرف عورت کی اناٹومسٹ ہی نہیں، سائیکاٹرسٹ بھی ہے۔ عورت کے ہر نشوونما پاتے عضو کے ساتھ اِس کی نفسیات بھی پیچیدہ ہوتی جاتی ہے۔ طاہرہ اقبال اِن امور میں تفصیلات کی ماسٹر ہے۔

اچھا ہوا کہ اُس نے اپنے ناول ''ہڑپا'' کی بنیاد دراوڑ اور آریا پر نہیں رکھی، ورنہ اس کے ناول کی بنیادی خشت ہی ٹیڑھی رکھی جاتی۔ آرکیالوجی نے ساری تھیوری ہی جھٹلا دی ہے۔ طاہرہ نے یہ خوبصورت پیراگراف ہمیں دیا: ''اری ہڑپا کے جنڈ بکائنوں کی چمگادڑ۔ یہ بس کہانی ہے۔ یہاں کوئی آریا نہیں آیا۔ کوئی تباہی نہیں آئی۔ جب ہاکڑا سوکھ گیا تو تیرے لگتے لانے یہاں آ گئے۔ یہاں راوی رخ بدل گیا تو ادھر گنگا جمنا کو نکل گئے۔ پر تو یہیں رہ گئی۔ نہیں مارا تمھارے آبا واجداد کو کسی نے۔ آپ ہی مرے ہیں۔ باری باری، اگر اکٹھے مارے گئے ہوتے نا تو یہاں بے شمار ہڈیاں کھوپڑیاں اکٹھی ملتیں۔ اگر مارا بھی ہے تو مارنے والے کہیں اور نکل گئے۔ میں نہ آریا ہوں نہ ہی تجھے مار رہا ہوں۔ جا اپنے ریوڑ کو سائے میں لے جا، مرجائے گا، دھوپ میں پگھل کر۔''

پری ہسٹاریکل دور کا اس سے خوبصورت اور مختصر اظہار شاید ہی ممکن ہو۔ آگے دیکھیے

کہ وہ کلاسز کو ایک فقرے میں کیسے سمو دیتی ہے:

* "خود غرضی اور لوبھ شاید پکے مکانوں میں بستے ہیں۔"

ذرا دیہی عام انسان کے بارے میں طاہرہ کا گہرا مشاہدہ تو دیکھیے:

"ان دیہاتیوں کو سونگھنے، سننے، مٹی اور عناصر فطرت میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی اور یہاں حیات کرتے جانداروں کے اذہان اور ارادے کی ہر حرکت کو وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی سمجھ جانے کی عجب خو قدرت نے بخشی ہے۔ نقشِ قدم سے وجود کی ہر کیفیت اور سانس کی ہر حرکت کی شناخت تک فضا ہوا کو سونگھ کر وہ بتا سکتے ہیں کہ اردگرد کون موجود ہے یا گزر گیا ہے۔ یہ خراٹے کون لے رہا ہے اور سانس کی گرمی جو ہوا میں گھلی ہے تو یہ کس کی ہے۔ یہ چھینک یا ہنکورا کس نے مارا ہے۔ ان کے محسوسات نابیناؤں سے تیز ہوتے ہیں کہ انھیں فطرت کی گھٹی ملی ہے۔ خارج سے مصنوعی اَن دیکھا اَن جانا کچھ بھی ٹھونسنے کی قبولیت ہی نہیں ہے۔"

طاہرہ نے جدید نو آبادیاتی پسماندہ فیوڈل ملک کی بیوروکریسی کو بھی ادھیڑ کے رکھ دیا۔ ایسا لگے جیسے وہ خود بہت عرصہ پنجابی بیوروکریسی میں رہ چکی ہو۔

اسی طرح اس نے پاکستان کے عدالتی نظام کا باریکی سے ڈائی سیکشن کیا۔ سزا سے پہلے جیل، بدنامی، مفلسی اور آٹھ دس سال بعد فیصلہ کہ ملزم بے گناہ ہے۔

ہماری ممدوحہ باریک بیانی میں کمال کرتی ہے۔ جس طرح روسی ناولوں میں منظر نگاری بہت طویل ہو جاتی ہے، طاہرہ کا ناول بھی اپنے تفصیلی بیان سے بوریت کی حدوں تک دھکیل دیتا ہے مگر اہم اس لیے ہے کہ شاید یہ تفصیلات بہت سی جگہوں پہ نہ مل پائیں۔ اسی ناول میں وہ این جی اوز کا جو نقشہ بیان کرتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ سچ ہے بلکہ بہت عمیق مشاہدے پہ مبنی ہے۔ اسی طرح جدید دور میں میڈیا کے کردار پہ خوبصورت صفحات موجود ہیں۔

طاہرہ اقبال تیسری دنیا میں فاشزم کا بھی زبردست مطالعہ رکھتی ہے۔

اسٹیبلشمنٹ کس طرح اپنی سیاسی پارٹی کھڑی کرتی ہے اور کس طرح اسے اقتدار میں لاتی ہے، اس ناول میں کمال باریک بینی سے بیان ہوئی ہے۔

ایک اچھا مشاہدہ دیکھیے:

''قہقہہ احساسِ برتری کا تحکمانہ اظہار، برتری اور تضحیک کے احساس کی سرخوشی!''

ہڑپا ناول میں دوسرے تمام ناولوں، افسانوں کی طرح رائٹر اپنے بے شمار کرداروں کو آگے چل کر لاوارث نہیں چھوڑتی۔ اُس نے کوئی کیریکٹر فراموش نہیں کیا۔ چھوٹے سے چھوٹے کرداروں کو بھی انجام تک پہنچا کے چھوڑا۔

ہڑپا ناول کا ٹائٹل بہت سادہ مگر بہت خوبصورت ہے۔ ٹائٹل کو دیکھ کر ہی کتاب کے متن کا اندازہ ہونے لگتا ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد مری

پیش لفظ

دُنیا کا مشکل ترین کام خود اپنے متعلق کچھ کہنا ہے، خصوصاً اپنی کسی تحریر کا تعارف کروانا۔ ادیب جو لکھ رہا ہوتا ہے اُس میں بہت کچھ ایسا بھی درج ہو رہا ہوتا ہے جسے وہ خود نہیں لکھتا، بس لکھا جا رہا ہوتا ہے۔ کیوں اور کیسے، تخلیق کار کے پاس اس کا جواب اکثر نہیں ہوتا۔ کچھ لکھنے والے شاید باقاعدہ پلاٹ کردار گھڑتے ہوں گے لیکن بیشتر ایسا نہیں ہوتا۔ کہانی اور کردار اپنی مہار اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھتے ہیں اور تخلیق کار کو اپنے پیچھے پیچھے چلنے کا حکم صادر کرتے ہیں۔ تخلیق کار کے دماغ میں کبھی کا گونجتا ہوا کوئی جملہ، دیکھی ہوئی کوئی صورت، گزرا ہوا کوئی منظر یا واقعہ اُسے انگلی سے پکڑ کر قلم کی نوک سے خود کو اظہار دینے لگتا ہے۔ پھر پتا نہیں کب یہ سب بھی اُس کی گرفت سے نکل جاتے ہیں اور کسی خود کار نظام کے تحت کام کرنے لگتے ہیں۔ شروع ادیب کرتا ہے، خود کو ختم تحریر آپ کرتی ہے۔

ہڑپا میری تہذیب ہے۔ جڑوں اور خمیر میں رچی بسی فطرت۔اس کا رنگ رس، کردار اور رہتل اس مٹی کی وہ امانت ہے جسے وہ نسل در نسل اپنے وسنیکوں کو منتقل کرتی ہے بلکہ مستعار دیتی ہے۔ ایک خاص دورانیے کے لیے جنھیں یہ ملتی ہے۔ وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ دراصل وہی اس سب کے مالک ہیں، پھر یقین دلا کر، اطمینان کروا کر ہڑپا اُنھیں خود میں سمو لیتا ہے اور انہی کی مٹی سے فاسفورس سے کچھ اور صورتیں وجود میں آ جاتی ہیں، اسی سلسلے کا چلن ہڑپا ہے۔

ہڑپا بہت صدیوں سے بلکہ روزِ آفرینش سے یہی کر رہا ہے۔ اس کا برتاؤ یکساں ہے۔ دو منطقے ہیں، ایک پر زیادہ مہربان ہو جاتا ہے۔ بالائی منزل کی تختی والی موٹی اینٹوں اور سر ڈھکی نالیوں والی کشادہ اور پُرتعیش بستیاں بسا دیتا ہے اور دوسرے کے لیے ان کشادہ بستیوں سے بہہ نکلے کچرے مچرے میں بھیگنا مقدر کر دیتا ہے۔ ہڑپا فطرت کا وہ چکر ہے جو مقدر بن کر انسانوں پر انسانوں کی صورت میں وارد ہوتا ہے۔ ہڑپا اُس فطرت کی رگِ جاں ہے جو سدا جیتی ہے، پلتی ہے اسی لہو سے جو ہڑپا کو سجاتے سنوارتے اور رہنے کے لیے پہلے سے زیادہ اچھا بنا دیتے ہیں۔ ہڑپا انھیں کھل کھیلنے کا موقع فراہم کرتا ہے لیکن گھات میں لگی رہتی ہے۔ ہڑپا کی وہ جبلّت جو اس سب حُسن، جوانی، طاقت، دولت، اقتدار کے چکر کو جاری رکھنے کی امین ہے۔ جس کے زائیدہ موت اور زوال ہیں۔ زندگی اور عروج کو بہر حال اُسے آگے منتقل کرنا ہے اور وہ اپنے اس منصب کو رخ اور شکلیں بدل بدل کر استعمال کرتی ہے۔ یہ کرداری ناول انہی شکلوں اور رخوں کی بڈ بیتی ہے، جس کے سبھی ابواب اس کے کرداروں کے ناموں پر مشتمل ہیں۔

یہ ہڑپا کی منہ زور فطرت کی کہانی ہے جو نگلتی اور پھر اُگلتی ہے، حُسن، جوانی، طاقت، اقتدار، دولت۔ یہ ناول انہی سب کا میدانِ کارزار ہے۔

بے شمار پگڈنڈیاں اَن گنت قدموں کے نشان، منزل در منزل چڑھی بستیاں اور

قبریں، جن میں بستا خوف یہاں کی جیون کتھا ہے۔ والدین کے خوف سے خدا کے خوف تک، پانے کی حرص سے کھونے کے ڈر تک میں جکڑا بچہ جمورا، مثبت کو نگلتی ہوئی منفیت، تعمیر کو ڈھاتی ہوئی تخریب، زندگی کو نوالہ بناتی موت۔ یہ ناول اسی ہڑپائی فطرت کی کارگزاری ہے۔ پھر ہر شکست، ہر موت میں سے سر اٹھا کر جی اٹھنے کی جو خُو ہے وہی اس ہڑپا کی بقا ہے۔

طاھرہ اقبال

آباد ہڑپا

چناں

چناں کولگتا اِن پہرے داروں سے اُس کی نفرت اِتنی ہی پرانی ہے جتنے پرانے ہڑپا کے یہ کھنڈرات ہیں جن میں بوڑھے خمیدہ کمر، کھوکھلے تنوں والے چھال اُدھڑے اُوکاں اور جنڈ بکائن آدھوں آدھ دفن ہیں، جن کی دھول لتھڑی شاخیں چھتریاں تانے بھر بھری زمین میں منہ کے بل دھنسی ہوئی ہیں اور جن کی گہری گپھاؤں میں چناں اپنی بکریوں سمیت چھپ جایا کرتی ہے۔ صدیوں پرانی دھول سے اٹااٹ ان جنڈ بکائنوں کے کلاوہ بھر، تنوں کے گرد پختہ بینچ بنے تھے چناں کو اِن پر بیٹھ کر جٹائیں کھجانے اور اُس کی بکریوں کو ان پر پچھلی ٹانگیں ٹکا کر ٹیشاں اور پتے چرنے میں بڑی سہولت رہتی تھی۔ نہ وہ خود گارڈوں کی سیٹیوں سے ڈرتی نہ ہی اُس کی بکریوں کو وہ کبھی سنائی دیتیں وہ گھنی شاخوں کی بوجھل چلمنوں سے کھنڈروں میں اُڑتی دھول کے پردوں میں لپٹی بھیڑ کو دیکھتی یہاں نت نئی مخلوقات بھر آتی تھیں۔ گورے کالے گیہوں رنگے جو ایک بار نظر آتا دوبارہ کم ہی دِکھائی پڑتا، سوائے ان منحوس چہرہ پہرے داروں کے جو گھوڑوں جیسی ٹاپوں والے سیاہ بوٹوں پر سوار دگڑ دگڑ

چھتناروں میں گھسے چلے آتے۔
مینڈھیاں گندھے چٹلے سے اچھال کر اُسے باہر پٹختے چناں اُن کے ہاتھ کاٹ کھاتی اور کھنڈروں میں بل کھاتی پکی پٹڑی پر بھاگ نکلتی جس کے دونوں اطراف مہیب ٹیلوں کے منہ بند سلسلے رواں تھے، جن میں صدیوں پرانے مدفون منوں مٹی اوڑھ کر سوتے تھے۔

نک کٹی، ٹھگنی، کالی بھدی

سیاہ بوٹوں کے گھوڑوں پر سوار گالیاں بکتے جھکتے پہرے داروں کے کئی چھانٹے اور جھانپے، لاتیں کھاتی چناں تونوگزے کے مزار میں گھس کر منت کے مکھانوں پر جھپٹتی اور بک بھر بھر نگلتی اور اُس کی بکریاں تب تک کئی پھلائیاں اور بکائنیں چونڈ چکی ہوتیں۔ کئی بار چرواہے اور بھک منگے اُسے دبوچ بھی لیتے، وہ دھول کے سمندروں بہتے موجیں مارتے نشیبوں میں لڑھکتی کبھی چوڑی بوسیدہ اینٹوں والے بالائی شہر میں گرتی کبھی زیریں بستی، کبھی طبقہ بالا کی رہائش گاہوں میں مچلتی، کبھی نچلے طبقے کے مکانوں میں لوٹتی، کبھی بازار، کبھی منڈی، کبھی زمین دوز نالیوں میں اوندھاتی تو کبھی اندھی باؤلی میں کود جاتی، جیسے چکنی مٹی کی کوئی ڈھلانی ڈھیم، جسے ہڑپا کے بت تراشوں نے خام سی گھڑت دی ہو، جو زمینوں کے صدیوں برابر بوجھ تلے پڑی گھس پھس گئی ہو۔

دھول کا موجیں مارتا سمندر جوار بھاٹے اُٹھاتا لہریں موجیں اُڑاتا مدفونوں کے مہیب ٹیلوں سے ٹکراتا، جیسے کبھی راوی کے منہ زور پانی ان ٹیلوں ٹبوں میں منہ بند عظیم الشان عمارتوں سے ٹکرائے تھے، دامن میں اُترتی گہری کھائیوں میں، کھدائی شدہ آثاروں میں، سنگلاخ تاروں میں لپٹے کھنڈروں میں، بھدی نک کٹی مورتی سی چناں آثاروں آثار بہتی، پہرے دار صدیوں پرانی دھول کے سیلابوں میں لپٹے ڈنڈوں اور بندوقوں کی ٹوہیں دے دے کر اُسے باہر نکالتے۔ مہینوں کے اَن دُھلے بال، گدڑھیں بھری چندھی آنکھیں، سنک

اُبلتی چپٹی ناک جیسے انہی آثاروں کی کوئی شبیہ جو وزنی اینٹوں تلے دبی رہ گئی ہو اور اب صدیوں بعد کھدائی میں تیشوں کدالوں کی ضربیں کھا کھا کر باہر نکلی ہو۔ کہیں سے بھری کہیں سے چٹخی، دلی ملی سی....

بالائی شہر کی تختی والے آثاروں کے قریب نل پر کپڑے دھوتی بستی کی عورتیں اُسے دھتکارتیں "گندی شوہدی، کالی، ٹھگنی۔"

معبد گاہ کے آثاروں والے ٹیلے سے نیچے اُترتے قبرستان میں پانی، مٹی، روڑ ڈالتی عورتیں روڑوں کے بک اور ڈھیلے اُس کی سمت اُچھالتیں۔

"ہٹ ہٹ دُور دفع بے وضو پلید قبرگھستان کی بے حرمتی نہ کر۔"

پرانے ڈاڑھی والے جنڈ بکائنوں کے گرد پختہ بینچوں پر نوزائیدہ بچوں کو دُودھ پلاتی اور ہر گزرتے سیاح کے سامنے ہاتھوں کے کشکول پھیلاتی نوجوان مائیں زرد بوسیدہ پتوں کی مٹھیاں بھر بھر اُس کی سمت اُچھالتیں۔

"دُور پرے دُور دفع ہمارے بچوں پر نحس سایہ نہ ڈال۔"

کھنڈروں سے بہت نیچے بچھے کھیتوں میں ہل چلاتے کسان گُھرکتے، جیسے پوری کائنات اُسے ان کھنڈروں سے باہر دھکیلنے پر تُلی ہو اور یہ پہرے دار تو شاید یہاں تعینات ہی اسی کام کے لیے کئے گئے ہوں لیکن جب اُنھیں کوئی گوری چمڑی والا دِکھائی دے جاتا تو پھر وہ اُسے وہیں آثاروں میں پھینک پھانک اُس کے پیچھے لگ جاتے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں آثارِ قدیمہ کی تاریخ دُہراتے جوابَ چناں کو بھی زبانی یاد ہو چکی تھی چناں اپنے دھول لباس میں لپٹی، اوڑھنی کی بوسیدگی میں اُن کی سچی جھوٹی انگریزی پر ہلکے ہلکے قہقہے پھوڑتی، بھوتنی سی جیسے پانچ ہزار سال سے انہی ٹیلوں میں کہیں دھنسی پڑی رہی ہو اور ابھی دھونے، مانجھنے والی ہو جب کوئی گورا پوچھتا صدیوں پرانی اس کول اور دراوڑ نسل کے کچھ باشندے کیا اب بھی اس علاقے میں بستے ہیں تو گارڈ "یس سر یس سر" گردن ہلاتے ہوئے

چناں کا چہرہ یوں نوچ کر اُن کے سامنے پیش کرتے جیسے وہ بھی سیکڑوں سالہ پرانی تہذیب کے آثاروں سے نکلا ہوا کوئی ظروف ہو اور اگر اُن کے بس میں ہوتا تو وہ اُسے بھی آثارِ قدیمہ کی گراں قیمت پر اِن گوروں کے ہاتھوں بیچ ڈالتے جس طرح وہ اپنی جیکٹ کی جیبوں میں بھرے ان ٹھیکریوں ہڈیوں اور اینٹوں کے ٹکڑے اُنھیں لال ہرے نوٹوں کے عوض بیچا کرتے تھے جن کے ساتھ کے کئی ثابت پیالے رکابیاں مٹکے ڈول کھلونے مورتیاں گھوگو گھوڑے چناں کے اپنے کوٹھے کی پرچھتی پر سجے تھے اور بستی کے ہر گھر میں استعمال ہو رہے تھے۔ جنھیں چرواہے اور بھیک مانگنے والے بچے اُٹھا لاتے اور گوروں کو دِکھا دِکھا کر دس روپے کا نوٹ مانگتے پھرتے پہرے داروں کو ان کی یہ حرکات پسند نہ آتیں وہ اُنھیں اپنے موٹے موٹے ڈنڈوں کی ٹوہوں کے ساتھ گوروں سے دور پرے رگیدتے رہتے۔ اس بستی کے سارے گھر بھی انہی موٹی چوڑی لال اینٹوں سے بنے تھے جنھیں گارڈ سات ہزار برس پرانی کہتے تھے۔ اُن کے تو بس میں ہوتا تو وہ چناں کا پورا گھر ہی ان گوروں کے ہاتھوں فروخت کر ڈالتے اس کی اندھی ماں سمیت کہ اس ہزاروں سال پرانی تہذیب کا یہ بھی کوئی عجوبہ ہے۔ کئی بار تو وہ پھٹ پڑی۔

"ایسے تو ہمارے گھر میں بھی بھرے پڑے ہیں۔"

"تمہارا گھر کدھر ہے۔"

سیاح اُس کی جانب متوجہ ہو جاتے پہرے دار ڈنڈے سونت کر اُس کے پیچھے لپکتے۔

"کم ذات گدھی! سودا ہی خراب کر دیتی ہے۔"

اور اُسے اُس کے ریوڑ کے ہمراہ کسی جھنڈ میں دفن کر آتے۔ یہاں کی ہر شے زمین برد تھی جن کے آثار سرزِمین نظر آتے لیکن جڑیں صدیوں پرانے ٹیلوں میں گہری گہری پھیلی ہوئی تھیں۔ ہر شے ہر چہرہ اِک اسرار ملے وقت کی مٹھی میں ساکت و جامد تھا۔ کون جانے یہ

مدفون بستی کب بسی کب اُجڑی، کیوں بسی کیوں اُجڑی بس قیافے اور تخمینے۔ انسان نے کب مل کر خوبصورت تہذیبیں بنائیں اور خود ہی ان تہذیبوں کو برباد کیا۔ تعمیر اور تخریب کے رنگوں میں گندھے ہوئے اس انسان نے کیا کچھ بنایا اور پھر بگاڑ دیا۔

آثاروں والے ٹیلے سے نیچے قبرستان کے میدان میں اس بستی کے بچے ہر روز گھروندے بناتے اور پھوڑتے تھے، صبح سے شام ہو جاتی۔ لڑکے کھرپے سے مٹی کھود کھود کر ڈھیر لگا دیتے۔ لڑکیاں ٹوٹے ہوئے ٹھیکروں میں پانی بھر بھر لاتیں۔ لڑکے پیروں سے مٹی گوندھتے، لڑکیاں ہاتھوں سے ایک محل تعمیر کرتیں جس کی چار دیواری بھی ہوتی۔ کمرے بھی کرسیاں، چارپائیاں، بھڑولے، تنور، جانوروں کا باڑا جس میں سخت گوندھی چکنی مٹی سے بھینس، بیل، بھیڑ، بکریاں کئی گھڑتیں اور باوے بناتیں۔ لڑکے گھاس کھود کر لاتے اور مٹیا محل کے باہر اگاتے، فصلوں کے سٹے ٹانڈے گاڑتے اس کھیت کو پانی لگاتے۔

پورا گھر سامان سمیت باڑا جانور کھیت کھلیان جب سب تیار ہو جاتا تو پھر اس کی ملکیت کے لیے وہ لڑ پڑتے۔ گھروندے بنانے تک تو وہ سب یکمشت ہوتے لیکن تعمیر مکمل ہونے کے بعد پھر مل کر اس میں کبھی نہ کھیلتے۔ اپنی تعمیر اپنے ہی پیروں تلے روندتے، گھروندہ ٹوٹنے لگتا گھوگو گھوڑے پھوٹنے لگتے۔ لڑکیاں اپنے گھروندوں کے تحفظ کے لیے مزاحم ہوتیں وہ اُنھیں اچھال اچھال پرے پھینکتے۔ لڑکیاں اونچے سروں میں بین ڈالنے لگتیں۔ دھول کی مٹھیاں بھر بھر بالوں میں اُڑاتیں۔

پھر وہ سارے پاگل بھوتنوں کا سا روپ اختیار کر جاتے، پیروں تلے اپنی محنت کو روندتے، دھول اُڑاتے اور مل کر گاتے:

ہاتھوں سے بنایا تھا پیروں سے ڈھایا ہے

دھول آسمانوں کو چڑھتی، بنانے یا توڑنے والوں کی شناخت مشکل ہو جاتی۔ حملہ آوروں اور محافظوں میں تمیز نہ رہتی۔ بس ایک گاڑھی کچی دھول کا طوفان جس میں لپٹے بے

شناخت بھوتنے اتنی گرد اُٹھاتے کہ پتا ہی نہ چلتا کہ گھروندے بچا رہے ہیں کہ ڈھا رہے ہیں لیکن جب دھول چھٹتی تو سب ملیامیٹ ہو چکا ہوتا۔ اگلے روز وہ پھر سے وہی سب بنانے لگتے جو پچھلے روز ڈھا چکے تھے۔ بالکل اسی انداز کے بیل گائے، مورتیاں اور برتن آلات جیسے ہڑپا کے عجاب گھر کی الماریوں میں بند ہیں۔ پہرے داروں کے خوف سے گھروندوں کے ان کاریگروں میں سے بیشتر نے عجائب گھر کے اندر کبھی داخل ہونے کی جرأت بھی نہ کی تھی۔ لیکن اسی طرح کے جانور بھانڈے ٹینڈے اور انسان ان کے اِرد گرد موجود تھے۔ وہ اُنہی کی نقل بناتے جنھیں پہرے دار پانچ ہزار قبل کی شکلیں قرار دیتے تھے۔

سب بنا چکنے کے بعد سب ڈھا دیتے اگلے دن کے لیے کچھ بھی کبھی محفوظ نہ رکھتے اور دھول کے گاڑھے بادلوں میں لپٹے جھوم جھوم کر گاتے۔

"ہتھاں نال بنایا سی پیراں نال ڈھایا اے"

چنی اپنے ریوڑ کے ہمراہ چوڑی چوڑی بنیادوں اور بھربھری اینٹوں والے آثاروں میں انے وا اُڑتی دھول کی تنی طنابوں میں اُتر جاتی۔ بھربھری بنیادوں پر اچھلتی اپنے ریوڑ کو چھمکیں مار مار کھنڈروں کے اندر بھگاتی، دھول آسمانوں کو چڑھتی اور وہ زور زور سے الاپتی۔

"ہتھاں نال بنایا سی پیراں نال ڈھایا اے"

جونہی پہرے دار دھول کے شامیانوں میں بوٹوں کے گھوڑے دوڑاتے اور سونٹے لہراتے ہوئے اُس کے پیچھے لگتے وہ ون، اوکاں کے کھوکھلے تنوں میں چھپ جاتی اُس کی بھیڑیں تنوں کے گرد گھومتے بینچ پر استراحت کرتیں اور بکریاں پچھلی ٹانگیں جما کر اور اگلی ٹانگیں ہوا میں اُٹھا کر شاخیں چونڈتیں اور چناں ہڑپا کے ان کھنڈروں کی جھوٹی سچی کہانی اپنے ریوڑ کو سناتی جو پہرے داروں سے روز سن سن کر اُسے ازبر ہو چکی تھی۔ جہاں کی

لڑکیاں چناں کی ہم شکل ہوتی تھیں جہاں پکی اینٹوں کے مکان بنتے تھے۔ سیڑھیوں والے چوبارے اور سر ڈھکی ہوئی پکی نالیاں اُساری جاتی تھیں جن میں بھری امرا کی رہائش گاہوں کی غلاظتیں غربا کی نشیبی بستیوں کی سمت بہادی جاتی تھیں۔ اور چناں جیسی لڑکیاں باؤلیوں سے پانی کی کوری جھجھریاں بھرتی تھیں، آویاں تپاتی تھیں، ظروف بناتیں، تانیاں تنتیں، جانوروں کا چمڑا سکھاتیں اور اس سے کترنیں کاٹتیں جن کے جوتے بنتے آپ گندی رہتیں لیکن مہارانیوں کی غلاظتیں دھو کر ان کا سنگار کرتیں۔ پہرے دار گوروں کو یہی سب بتاتے تھے۔

چناں سوچتی یہ سب تو آج بھی ہوتا ہے تو پھر پانچ ہزار برس پہلے جو سب کہانیوں کی طرح بتاتے ہیں آج اُس کی اصل کیوں نہیں دکھا دیتے لیکن جب کوئی گورا سوال کرتا ہے:

"کیا پرانی دراوڑ اور کول نسل کے لوگ اب بھی یہاں بستے ہیں۔" تو پھر کوئی پہرے دار بوٹ کی نوک سے دھکیل کر اُسے گورے کے حضور پیش کر دیتا ہے۔

"یس سر یس یہ.... یہ دیکھیے.... دیکھیے سر! بالکل یہی ناک نقشہ یہی قد بت انہی مورتیوں کی ہم شکل یہی تو ازلی نسل ہے۔ اس مرحوم تہذیب کی...."

گورے اپنے کیمرے کی روشنیاں کئی زاویوں سے اُس پر ڈالتے اور تجسس سے اُس کے سراپے کا جائزہ لیتے۔

پہرے دار اپنی بخشش مزید بڑھاتا۔

"سر لباس بھی یہی.... یہی ان سلی چادر Its Called دھوتی۔"

گورا دوبارہ اپنا کیمرہ سیدھا کر لیتا اُس کے بس میں ہوتا تو وہ چناں کو مٹھی میں دبوچ کر اپنے چرمی بیگ میں چھپا لیتا اور یورپ لے جا کر آثارِ قدیمہ کے داموں فروخت کر دیتا۔

چناں سوچتی شاید پانچ ہزار برس پہلے بھی یہاں کسی کا نام چناں ہوگا۔ اسی لیے تو

پھرے دار اُسے دکھا دکھا کر پیسے وصولتے ہیں۔ اگر چاند پانچ ہزار سال پہلے موجود تھا تو پھر کوئی چناں بھی ہوگی۔ اگر تاج موجود تھے تو پھر تاجاں بھی ہوگی۔ اگر اس وقت لوگوں کو بخت پر یقین تھا تو پھر کوئی بکھاں بھاگاں بھی ہوگی۔ اگر سات کی گنتی تھی تو پھر کوئی ستاں بھی ہوگی۔ کوئی لکھاں بھی ہوگی۔ لاکھ پر اُسے تھوڑا شک تھا پتا نہیں لاکھ کی گنتی اُس وقت کی کوئی چناں گن سکتی ہوگی کہ نہ جیسے اب وہ نہیں گن سکتی۔

اگر قدرت کا چرخہ ہزاروں برس سے یونہی گھومتا اور تانے بانے بنتا رہا ہے۔ تو پھر کوئی امیراں بھی ہوگی اور کوئی کنیزاں بھی ہوگی۔ اور یہ سارا کچھ پانچ ہزار سال سے یونہی چلا آ رہا ہے تو نجانے کتنے ہزار سال مزید ایسے ہی چلتا رہے گا۔ یہ سارے نام جو آج مروج ہیں اس وقت بھی موجود ہوں گے۔ اگر بیل گائے عورت مرد اسی شکل میں تھے تو پھر نام بھی یہی ہوں گے۔

وہی نام جو ہڑپا کے جنڈ بکائنوں کے تنوں پر یہاں آنے والے سیاح کھود جاتے ہیں۔ اس کھنڈر بستی کے صدیوں پرانے درختوں پر اپنے نام لکھ کر شاید ان میں زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جن کی جڑوں کے نیچے ایک عالیشان تہذیب دفن ہے۔ جس کی لکھائی کو کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ شاید یہی نام ایک گم شدہ لکھائی میں لکھے گئے ہوں گے۔

پتھروں کی سلوں پر خود کو ہمیشہ محفوظ رکھنے کو یہ اسما کھودے گئے ہوں گے۔ سلیں تو محفوظ رہ گئیں لیکن دنیا نے اُن کی لکھت بھلا دی۔ یہ جوان صدیوں پرانے تنوں پر اَن گنت نام کھودے جاتے ہیں تو کہیں ان کی بھی لکھت نہ بھلا دی جائے۔ ایک تنے پر بے شمار لکھے ہوئے نام ایک نام کے اوپر پھر کئی نام۔ ایک نام کے ہزاروں انسان کیسے شناخت ہوں گے۔ بس نام ہی نام۔ نت نئے بدلتے انسانوں کی پکار وہی چند نام۔

وقت کی عجب چال کہ ناموں کی لکھت اور معنی ہی بدل ڈالتا ہے یوں پھر وہ نئے ہو جاتے ہیں۔ کتنے ملک، شہر، قصبے، گاؤں، گھر، قوم، قبیلے، نسلیں، پیڑھیاں ایک دوسرے پر

چڑھے ہوئے زمانے در زمانے جیسے آسمان اور زمین تہہ بہ تہہ.... بس لکھت بدل جاتی ہے اور ناموں کی بولیاں بدل جاتی ہیں۔

یہی سب پہرے دار گوروں کو بتاتے تھے ویسے تو وہ ہر اُس شخص کو بتاتے تھے جوان کی مٹھی میں کوئی چھوٹا بڑا نوٹ تھما جاتا تھا لیکن گوروں کو بتاتے ہوئے وہ ایسے پُرجوش ہو جاتے جیسے ایک ایک منظر واقعہ اور تعمیر و تخریب انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے۔ وہ انہی مدفونوں میں پانچ ہزار برس سے بس رہے ہیں اور وقت کی ہر ہر کروٹ کا مشاہدہ اپنے حافظوں میں محفوظ رکھتے رہے ہیں۔

سر، میم! اس وقت آپ کے قدموں تلے جہاں آپ کو کھڑے ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ پانچ ہزار سال قبل کی ایک انتہائی ترقی یافتہ تہذیب دفن ہے۔ پانچ ہزار سال پرانی اینٹیں، محلات، بازار، برتن، اناج، ہڈیاں سب آپ کے پیروں تلے موجود ہے۔ جو سب اس زمین اسی مٹی میں سانس لے رہا ہے۔ یہ مٹی جو نہ کبھی بانجھ ہوتی ہے نہ ہی مرتی مٹتی ہے۔ ہر مرنے مٹنے والے کو خود میں سمو لیتی ہے اور پھر اپنے وجود سے دوبارہ سب پیدا کر دیتی ہے۔

اپنے سینے پر ہر شے کو اگاتی، بناتی، اسارتی، مورتیں اور شکلیں دیتی اور پھر سب مٹا دیتی، ڈھا دیتی ہے۔ پھر سے پیدا کرنے کے لیے لیکن سارے نقشے اپنے سینے میں محفوظ رکھتی ہے۔ دوبارہ بنانے کے لیے کبھی کچھ بھولتی نہیں ہے۔ چنی کو اپنا پسندیدہ مصرعہ یاد آیا:

"ہتھاں نال بنایا سی پیراں نال ڈھایا اے"

"سر! یہ دیکھیے یہ مہریں ہیں سرکاری محکموں کی مہریں اب تک انھیں پڑھا نہیں جا سکا لیکن جلد پڑھ لیا جائے گا۔" چناں کو لگتا وہ اُنھیں پڑھ سکتی ہے یہ ویسے ہی نام ہیں جو ہر روز یہاں آنے والے سیکڑوں سیاح درختوں کے تنوں پر گود جاتے ہیں کہ یہ درخت سیکڑوں برس

جیتے ہیں تو اُن کی کوکھ میں وہ بھی جیتے رہیں گے۔

چناں کو پہرے داروں کی سنائی ہوئی کہانیاں اب زبانی یاد ہو چکی تھیں۔ بعض اوقات تو چناں کو لگتا وہ خود اس کہانی کا حصہ بن چکی ہے۔ جب پہرے دار اُسے پانچ ہزار قبل والی نسل کی باقیات کہہ کر گوروں سے نوٹ بٹورتے ہیں تو اسے بھی یقین ہو جاتا ہے کہ پانچ ہزار برس قبل یہ جو امراء کی رہائشوں والے محلے میں باؤلی کے آثار موجود ہیں تو وہ اسی سے گھڑے بھرتی تھی۔ جن کی سطح پر ریت کے ذرات چمکتے ہیں اور سیاہ روشنائی سے پھول بوٹے لکھے ہوئے ہیں جیسے آج بھی لکھے جاتے ہیں۔ ان گھڑوں کا ٹھنڈا میٹھا پانی یہ پہرے دار پی جاتے ہوں گے اور اپنی تلواروں اور سونٹوں سے اُس کے مٹکے پھوڑ دیتے ہوں گے۔ جیسے اب اس کی بکریوں کے تھن خالی کر جاتے ہیں اور انھیں آثاروں سے نیچے ٹیلوں کے عقب میں پھینک دیتے ہیں۔ اگر اُس وقت بھیڑ بکریاں موجود تھیں تو انھیں چرانے والی کوئی چناں بھی ہو گی۔ وہ بکریاں بھیڑیں انہی جنڈ بکائنوں کو چونڈتی ہوں گی پیٹ پھلاتی اور بھرے تھن مٹکاتی ہوں گی۔

انہی شاہی محلوں کے پہرے دار چوبی کھڑاؤں پر کسے ہوئے اس وقت کی کسی چنی کی بکریوں کے تھن ایک ہی ڈیک میں پی جاتے ہوں گے۔ کیونکہ وہ اپنے ریوڑ امرا کے لیے مختص چراگاہوں سے گزارنے کے جرم کی مرتکب ٹھہری ہو گی۔ سارا سبزہ اور جنگل، کیکر، صرنح، شیشم، شہتوت، پیپل، نیم، جنڈ اوکاں اور سارے دریا کنارے صرف اُن کی گائیوں، بیلوں اور ریوڑوں کے لیے مخصوص ہوں گے۔ اُن سرسبز بیلوں سے اپنے ریوڑ چرانے والی کسی چناں کو اُس وقت کے پہرے دار بھی سزا دیتے ہوں گے۔ جس طرح ابھی یہ چوبی کھڑاؤں پر سوار مشکی گھوڑوں سے پہرے دار اُسے چٹلے سے پکڑ کر بہت نیچے طبقۂ زیریں کی رہائش گاہوں کی سمت لڑھکا دیں گے اور اس کی بکریوں کے تھن خالی کر دیں گے اور بھیڑوں کی اُون تراش لیں گے تو پھر اس وقت بھی دریا کے یہ سبز کنارے امیروں

کے جانوروں کے لیے مخصوص تھے۔ گائیاں جو دودھ دیتی تھیں، بیل جو اُنھیں گابھن کرتے تھے۔ اُن کی کھیتیاں اُگاتے تھے اور سواریاں ڈھوتے تھے۔ اُدھر موہنجوداڑو اور مہر گڑھ سے قافلے آتے اور اجناس کا تبادلہ کرتے تھے۔

ایسا یہ پہرے دار گوروں کو بتاتے تھے۔ وہ بتاتے تھے:

''سر پہیہ ایجاد ہو چکا تھا۔ چرخی بھی کنوؤں سے پانی نکالنے کے لیے بنالی گئی تھی۔ سر یہ دیکھیں یہ، بالکل ہو بہو یہی عورتیں بالکل ایسی ہی پانچ ہزار سال پہلے یہ دیکھیے بالکل یہی ناک نقشہ اور یہی لباس۔

وہ چناں کو کھینچ کر پیش کر دیتے۔

''دیکھیے سر! یہی پھینی ناک کوتاہ پیشانی، کالی رنگت، لٹکتے ہونٹ بالکل یہی آپ موازنہ کیجیے۔'' ''سر! ہڑپا کی بھٹی میں پکی ان مورتیوں اور اس چہرے میں ذرا برابر فرق نہیں ہے۔ سر! ہو بہو وہی نسل۔ اب تک چلی آرہی ہے۔ یہ اس نسل کی آخری شکل ہے۔ جسے مشاہدہ کرنے کا سنہری موقع آپ کو مل رہا ہے۔''

''یوں آپ بذاتِ خود ایک عالیشان تاریخ کا حصہ بن رہے ہیں سر۔'' گورے گائیڈ کی مٹھی میں نوٹ دھنسا کر عجب فنتشی کے احساس کے ساتھ رخصت ہوتے کہ انھوں نے پانچ ہزار سال قبل کے کسی انسان کو خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا ہے۔

چناں کو یہ تو معلوم نہ تھا کہ یہ پانچ ہزار سال ہوتے کتنے ہیں لیکن پہرے داروں نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دنیا کی سب سے پرانی کوئی مخلوق ہے۔ جو بار بار پیدا ہوتی رہی ہے۔ تبھی تو اُن بھٹی کی پکی مورتیوں اور چناں میں رتی برابر فرق نہیں ہے۔ تو کیا جب مزید پانچ ہزار سال گزر جائیں گے تو اسی طرح چناں کی بھی مورتی بنا کر شیشوں کے پیچھے سجائی جائے گی۔ اور آج اسے دن رات دھتکارنے والے اور آثاروں سے کہیں دور رگیدنے والے گوروں کو بتائیں گے کہ یہ ہے چناں جو ہڑپا کی بستی میں پانچ ہزار سال پہلے ریوڑ

جہاں تھی تو پھر ابھی کیوں پوری دنیا اسے بے عزت کرنے کے درپے رہتی ہے۔
نوٹ جیب میں ڈالتے ہی پہرے داروں کو اُس کا ریوڑ کھنڈروں کی بوسیدہ بھربھری اینٹوں پر بھاگتا دوڑتا اور استراحت کرتا نظر آجاتا۔ ہڑپا تاراج ہوتا دکھائی دے جاتا۔ وہ گھوڑے کے سموں جیسے بوٹوں پر سوار دگڑ دگڑ ریوڑ کے پیچھے بھاگتے اور چنی کو چٹلے سے اچھال کر ٹیلے سے نیچے لڑھکا دیتے۔ جہاں کھنڈروں کے سرکاری نل پر کپڑے دھوتی اور سنک ابلتے بچوں کو گھونسے مار مار کر کھار سے نہلاتی مسلنیں اُس پر بک بھر بھر پانی پھینکتیں اور اسے کینٹین کی سمت دھکیل دیتیں۔
"جا دور دفع، کالی ٹھگنی، چھینی، گندی بھتی۔" خود اُن میں سے بیشتر ایسی ہی تھیں لیکن لٹکے ہوئے ہونٹوں والے کالے بھتنے دس بارہ بچے جن کر وہ معتبر ہو گئی تھیں۔

▪▪▪▪

بالی

چنی کو حسرت تھی کہ اُسے اتنی عزت ملے جتنی عزت یہاں بالی کو میسر تھی ڈھابے پر بیٹھی بالی پہرے داروں سے کوکے کولے پیتی جملے اچھالتی۔ اس کی موجودگی میں کینٹین کا کاروبار خوب بارونق ہو جاتا۔ وہ جب بھی اُٹھنے کو ہوتی تو چھوٹا چائے کے کپ کے ساتھ سیلے کیک رس یا پرانی مہک چھوڑتی برفی کا ٹکڑا رکھ کر لے آتا۔

''بیٹھ نا بالی تو یہاں بیٹھی اچھی لگتی ہے۔''

بالی جوتا اُتار کر چھوٹے کی کمر کا نشانہ لیتی۔ جو اکثر خطا جاتا۔ پھرتیلا لڑکا چھلانگ لگا کر بچ نکلتا۔

کینٹین پر سایہ فگن درخت پہرے داروں کی تاریخ کے مطابق پانچ ہزار سال پرانا جنڈ، اپنی مٹھیاں بھر بھر پتوں کی سارے میں بچھا دیتا۔ تو لالیوں اور گھوگیوں کی ڈاریں چگنے کو غوطہ لگاتیں۔ جن کا ٹھیک نشانہ لے کر کوئی چرواہا یا چھوٹا روڑا اچھالتا، جو اکثر تو چوک جاتا ڈارسیاں اس کی آواز کے ساتھ اُڑ جاتا اور کبھی کبھار کسی پرندے کا پنکھ یا ٹانگ توڑ

جاتے۔ پریا تابگ گھستی لالی یا فاطمہ وحشت ناک ڈیلے ایک پل میں سو بار گھماتی جیسے ان کے روڑے وٹے کھاتے ہوئے گھماتی تھی۔ چناں زخمی پرندے پر جھپٹتی۔ چناں اُس سے بھڑ جاتی اور پرندے کو کسی جھاڑی میں مارنے والا چرواہا چناں پر جھپٹتا۔ شکار ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر لڑکے پر ایسی ہی دیوانگی طاری ہو جاتی چھپنے کا موقع مل جاتا۔ جیسے شام گئے وہ گھروندوں کو پیروں تلے روندتے اور اپنا بنایا ہوا سامان پھوڑتے تھے اور ڈھول شامیانوں میں ایک دوسرے کو گراتے لتاڑتے تھے اور گھروندوں کو بچانے اور ڈھانے والوں میں تمیز ختم ہو جاتی تھی۔ دونوں ہی تباہی کے یکساں ذمہ دار بن جاتے تھے۔

چنی لڑکے کے بازوؤں اور گردن پر دانتوں اور ناخنوں سے جنگلی بلی کی طرح حملہ آور ہوتی۔ وہ اسے گھونسے مارتے ہوئے الگ ہو جاتا۔

''اپنی محلی سنبھال۔ اری ننگی ہوگئی ہے گندی....'' چنی اپنی دھوتی کا ٹکڑا دھول میں دبا ہوا باہر نکالتی اور ننگی جانگھوں پر لپیٹتے ہوئے دوبارہ حملہ آور ہوتی لیکن لڑکا چھلانگ لگا کر دوسرے ٹیلے پر کھڑا اسے ٹھینگا دکھاتا۔ منہ چڑاتا۔

''دیکھ لیا تیرا سب۔''

بالی آواز لگاتی۔

''دُر....دُر....دور''

اور جوتا اُتار کر لڑکے کی سمت اُچھالتی جوتا فاصلے پر گرتا۔ ''اوئے ماں کا پولا اُٹھا کر لا کے۔''

''پھر تو نہیں مارے گی نا۔''

نکا جوتا اُٹھا کر بغل میں چھپا لیتا۔

''نی چناں میرا پولا چھین کے لا اس حرامی سے۔''

چنی پھر بھڑ جاتی۔ اس کے ہاتھوں بازوؤں پر دانتوں کی قطاریں ثبت کر دیتی وہ چنی پر گھونسوں لاتوں گالیوں کی بارش کر دیتا۔ جوتا چلا کر مارتا جو چناں کے ریوڑ کو آثاروں سے نیچے کھائیوں میں دفن کرتا سیدھا کسی پہرے دار کے سینے کو مار کرتا۔ جو جوتے کو یوں کیچ کرتا جیسے جوتا گر گیا تو خود بالی اُس کے ہاتھوں سے گر جائے گی۔ جیسے جوتے کے قلبوت میں بالی خود مقید ہو کر اچانک اُس کے سینے سے ٹھک کر کے آن لگی ہو۔

آثاروں کے ٹیلوں سے بہت نیچے کھیتوں میں ہل چلاتے کسان ہاتھوں کی اوک بنا کر چلاتے۔

پولا کنجری دا۔

وچا بھر وے دے۔

▪▪▪▪

بالی کی کوٹھری کا دروازہ کھلا تھا اور وہ سرسوں کے تیل میں کپڑے کی واٹ بھگو کر ذرا ذرا دھنکا رہی تھی۔ واٹ کی چکنی گرم راکھ مٹی کے دیے میں قطرہ قطرہ ٹپکتی تھی اور تار کول سا کاجل تیار ہو رہا تھا۔ چناں نے لکڑی کا ٹرچو اس سیاہ چمکدار چکنی راکھ میں بھگو کر آنکھ میں پھیرا۔ گرم کاجل نے ڈیلا جلا کر رکھ دیا۔

''اری چنی نری جھلی۔ اندھی ہو جائے گی ماں کی طرح۔''

بالی نے گول گول شیشہ جڑے پھندنوں کو آخری بل دے کر پراندہ چھوڑ دیا۔

چنی چقندر کا رس ہونٹوں پر مل کر سوں سوں کرتی بالی کے شیشے میں خود کو دیکھنے لگی۔

''میں تیرے جیسی کب بنوں گی بالی۔''

''تو میرے جیسی نہ بنتی تو اچھا ہوتا لیکن میرے جیسی بن کر ہی ان سوروں کی کتلیاں توڑ سکتی ہے، ورنہ مفت میں بٹ جائے گی۔''

بالی اُس کی ایک ایک مینڈھی کھولنے لگی مہینوں کے ان دھلے چیکٹ بال ایسی بو اُٹھی جیسے کسی جانور کی دنوں دھوپ میں سڑتی ہوئی پرانی اوجری چر گئی ہو۔

بالی نے روپہلی بانکڑی والے گلابی شفون کے دوپٹے سے تیکھی گھوڑی والی ناک لپیٹی۔

''جا کھال میں ڈبکی لگا کر آ اُلٹی آتی ہے گندی مشک والی۔'' چنی کی پیٹھ میں دھموکا مارا تو دھول آنکھوں میں پڑ گئی۔

چنی کوٹھری کے کھلے در کی سمت بھاگی جیسے کھال میں ڈبکی لگاتے ہی وہ بالی جیسی حسین نظر آنے لگے گی۔

بالی نے آنکھ میں آئی رڑک کو درمیانی انگلی کی پور سے ملا اور پیچھے سے چنی کا چولا کھینچا۔

''مڑ سامنے مڑ اِدھر۔''

کندھے سے لٹکتی تنی پکڑ کر اوپر کھینچ لی۔

''چولا اوپر کر، اُٹھا اوپر اُٹھا۔ چورنی! میں کل سے ڈھونڈوں ہی ڈھونڈوں، کیا جانوں چور تو ناک تلے ہے۔''

چناں نے جھٹکے سے بوسیدہ کرتا نوچ کر گلے سے اُتارا سنہری ستاروں اور روپہلے موتیوں سے کڑھی تجوری کے خانوں جیسی بنیان دیے کی لاٹ میں جھلملائی اور قطرہ قطرہ ٹپکتا، چکنا کاجل دیے کو بھر کر کناروں سے بہنے لگا لیکن اب پوری واٹ آگ پکڑ چکی تھی اور جلے بنا بجھ نہ سکتی تھی۔

''ھائے سوکھی پھوکی کھجور کی گٹک بُری لگتی ہے ری چنی! کسی مرد کا ہاتھ پھروا.... دیکھی نہیں تو نے وہ شیشوں کے پیچھے تن کے کھڑی مورتیاں ایسی....'' بالی سینے سے کپڑا ہٹا کر اکڑی۔ جیسے سینے پر سجے امتیازی تمغے دکھا رہی ہو۔

"نی چنی نی ونتر چنی کدھر مر رہی۔ اجڑ تو کب کا باڑے میں تاڑا گیا۔ تو نک وڈی کیوں کھلی پھرتی ہے کوئی سوّر بھگیاڑ اُٹھا لے جائے اس انی بولی رات میں...."

بالی ہنسی تو جیسے کانوں میں پڑی سونے کی تاروں میں پروئے موتی باہم کھنکے۔

"ماسی تجھے انے تھم کو کیا پتا کہ انی بولی رات ہے، کہ روشن دن چڑھا ہے۔ تیرے لیے تو سب گھک مک کیوں اندھے دیدے ساڑتی ہے تیرے سامنے بھی بیٹھی ہوگی تو تجھے دکھے گی تھوڑی کہ کپڑوں میں ہے کہ الف اللہ۔"

بھاگاں محتاج چنی کو ٹٹو لنے کو بڑھی تو وہ در سے نکل کر پانی کے کھال میں اوندھا گئی۔ بالی نے چھت کی شہتری میں ٹھنسی سنگار والی پوٹلی باہر کھینچی تو ککھ کانے دھول چمگادڑوں کی بیٹھیں، پرندوں کے پر اور کچے انڈے بوٹ نیچے ٹپکے اور ٹوٹے۔

"تیرے پہرے سے کوئی بھیڑ بکری کبھی بچی بس سوّر، بھگیاڑ ادھر منہ نہ کرے تو نہ کرے اگر کرے تو پھر کون بچے کوئی نور کی چٹکی تو ہے نہیں تیرے موتیے میں ماسی۔"

بالی نے چھنگلیا کی ترچھی پور سے نینوں کے پیالے چمکیلے کاجل سے بھر لیے۔

"نور دیدوں میں نہ بچے پر دماغ کی بتی روشن کر جائے دھیے! روپوں کا رگ لگے تو نور پر پھری سیاہی اُترے۔ نہ روپے جڑیں نہ جالا اُترے پر بادل میں سورج چھپے تو روشنی اندر ہی اندر دمکے۔"

بھاگاں محتاج نے آنکھیں یوں رگڑیں جیسے نور کی پتلی پر تنے سفید جالے کو مل مل ہٹا دے گی۔ لیکن وہ تو پکا سفید پتھر۔ بھاگاں کیکر کی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی ٹوہتی کوتاہ چھت والی اندھی کوٹھری میں کچے فرش پر رکھی نیچی سی گھڑونچی پر دھرے گھڑے کے منہ سے مٹی کا پیالہ اُٹھا کر بھرنے لگی۔ کوری جھجری پر ریت کے سنہرے ذرے تاریکی میں جھلملائے جیسے کبھی کبھی محتاج بھاگاں کے اندھے نین کسی زاویے سے ذرا سی نور کی کرن میں جھلملا جاتے تھے۔ اور کسی منظر کی میلی سی لکیر دماغ کی لالٹین اجال دیتی تھی۔

"چالیس ورھے دیکھا ہے سب، ہر شے کا چوکھٹا ان اندھے دیدوں میں پورا پورا پھٹ ہے۔ ہر صورت اندر سنبھلی ہوئی ہے۔ یہی تین ساونیاں اور دو ھاڑیاں گزریں، عمروں کا دیکھا تو اندھا نہیں ہو گیا نا۔ ساری حیاتی کمتی انہی ڈھنڈاروں میں ایک ایک شے کا نقشہ روشن دن کی طرح آنکھ کی بند کوٹھی میں دھرا ہے۔ جیسے ان ڈھنڈاروں میں دفن صدیوں پرانی رہتل آج بھی جگتی ہے۔ یہ ڈھنڈار بھی اندھے دیدے جن میں سب دیکھا بند پڑا ہے۔"

انہی ڈھنڈاروں سے اٹ وٹا سر پر ڈھوڈھو کر کچے کوٹھے پکے کر لیے ٹٹ بھج جوڑ لی۔ مال منی والی چھپریاں بھی یہی اٹ وٹا لگا کر پکی کر لیں۔ تیری ماں کی میں ملویر تھی وہ میری میسر۔ دونوں کے سائیں ہڈحرام، آپ ہی ساری حیاتی کمتیں۔ دونوں مل کر ڈھنڈاروں کے جنڈ بکائنوں سے چھاپے چھوڑے وڈوڈ لاتیں اور باڑے کی کند بنا لیتیں.... کچھ بالن رکھ لیتیں۔

"توبہ ماسی اب تو کوئی پتا بھی توڑے تو پہرے دار پیچھے لگ جاتے ہیں۔"

بالی نے تانبے کے لش لش کرتے مونگر میں چہرہ دیکھا اور دنداسہ چبا کر سک پھینکا۔ چنی نے چبایا ہوا دنداسہ چپکے سے اُٹھا کر منہ میں رکھ لیا اور ہونٹ جیسے سی لیے۔ لیکن جب رنگ چڑھے گا تو پھر ہر کوئی دیکھے گا اور چرواہے آوازے کسیں گے۔

"کنجری اوئے کنجری۔"

کیونکہ اس بستی میں ہر دنداستہ ملنے اور کاجل لگانے والی لچی بدمعاش سمجھی جاتی ہے۔ سرے کی حد تک تو پھر بھی ناپسندیدہ اجازت ہو سکتی ہے۔ لیکن کاجل تو لچیاں لگاتی ہیں اور یہ نکی بنیان۔ نکی بنیان پہننے والی تو اس بستی میں کنجری کہلاتی ہے۔ اس لیے یہ صرف بالی ہی استعمال کرتی ہے۔ جو خود کو آپ کنجری بلاتی ہے۔ بھاگاں محتاج نے زور زور سے آنکھیں رگڑیں جیسے اس سیاہ پردے سے الجھن ہوتی ہو۔ اور اسے پھاڑ کر پھینکنا چاہتی ہو۔

"نہ دھیے نہ کوئی سُر سمجھ ہی نہ تھی۔ بھولے ویلے تھے جسے جو ملا برت لیا۔ پیالہ رکابی،

سرے دانی، گھو گو گھوڑے ڈھنڈاروں کے نلکے سے پانی کا گھڑا بھرنے جاتے جو جو ملتا اُٹھا لاتے۔ نہ کوئی پوچھتا نہ کوئی روکتا۔ بھولے ویلے، کیا خبر تھی کہ ایسا ویلا بھی آئے گا کہ گورے ٹھیکریوں کے بدلے بھی نوٹ دے کر جائیں گے وٹے روڑے کی بھی سنبھال ہو گی۔ ڈھینگر چھمک کی بھی پوچھ پڑتال ہو گی۔"

"ماسی تجھے تو ان ڈھنڈاروں کی کوئی وسنیک ملی ہو گی کبھی۔"

بالی نے لال رنگ کی نکی بنیان کی ڈھیلی ڈوری کسی، عجائب گھر کی الماریوں میں بند مورتیوں سی کسی تنی ہوئی تیکھی ترچھی، لال مرچ سی بالی، بالی کنجری۔

"ہاں ملیں نا.... ہڈیاں ملیں، کھوپڑیاں ملیں۔ میرے تیرے جیسی مورتیاں ملیں۔ جتنا پرانا اللہ اتنا ہی پرانا بندہ۔ نہ اللہ بدلا نہ بندہ بدلا۔ اللہ ایک تو بندہ بھی ایک۔ اللہ کی نسل نہیں چلتی بندے کی نسل چلتی ہے۔ جیسے درختوں کی قلمیں لگتی ہیں۔ آم کی قلم، سنگترے کی قلم، بندہ بھی اپنی قلمیں اُگاتا ہے۔ ایک سے لاکھ.... اللہ اسی بندے میں اُتر اپنی پچھات کرواتا ہے ذات ایک مورت ہزار ایک مر جائے تو دوسرا اس کی جگہ آن بیٹھے۔ ایک ہڈیاں گالے تو دوسرا ماس روپ ہنڈائے، آپ مٹی ہو کر اپنا جثہ دوجے کو ادھار دے جائے۔ پنڈا ہنڈ جاتا ہے پر جثہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ ماں بیٹی اور باپ بیٹے کے جثے میں جیتا ہے۔ بندہ مرتا کبھی نہیں۔ جے کر اللہ نہ مکے تو بندہ کیونکر مکے۔ وہ آپ بندے کی کوٹھی میں تو رہتا ہے۔

بھاگاں محتاج مٹی کے فرش پر ہاتھ مار مار کھڑ کانے لگی۔

"بس اسی میں سب چھپا بھی ظاہر بھی.... ہاں لیکن ابھی پکی پڑی ہے۔ مٹی میں پرانے سلوں کی سیاہی ملا لیا کر اور صرف اونٹ کی لید میں چکنی مٹی گوندھ کر سخت تلن دیا کر پورا سال کہیں نہیں جاتی۔

"تو ماسی جس کی کوئی بیٹی نہ ہو وہ تو پھر مر گئی نا۔ اس کا جثہ تو بے کار گیا۔ کسی نے نہ اوڑھا تو اس کی کوٹھی میں جو رب بستا ہے وہ پھر اپنا مکان بھی بدل لیتا ہو گا۔"

بالی نے گھوڑی والی ناک کی درمیانی کڑکری ہڈی میں پڑا بلاک جھنجھنایا جس کی سونے کی گھونگریاں کھن کھن بجیں۔

"نہیں وہ بھی جیتی ہے تو عین مین اپنی ماسی پر نہیں گئی۔ تیرا جثہ، تیری ٹور تیری آواز کسی اگلی پیڑھی میں پہچانی جائے گی۔ اور کوئی کہے گی "ہو بہو بالی۔"

بالی کھلکھلائی تو کانوں میں پڑی سونے کی تاروں میں پروئے رنگ برنگ موتی کھنکے۔ ہاں کہے گی۔

"گئی نا پھوپھی بالی کنجری پر.... ماسی کنجری سے کون انگ ساک بتائے بھلا۔"

بھاگاں محتاج نے اس کا جواب سننے کو توقف نہ کیا شاید منہ کھلتے نہ دیکھا ہو کہ بے نور آنکھوں کے چوکھٹے میں صرف دیکھی مورتیں محفوظ ہیں۔ ان دیکھی کی شبیہ بننے کے لیے دو چار ساونیاں مزید درکار ہوں گی۔

"کھوجیوں سے پوچھ۔ پیر کا کھرا پورے قبیلے کی ایک شناخت بن جاتا ہے پتا لگ جاتا ہے کہ یہاں سے کس کی ماسی، پھوپھی ملویر، پتریر، مسیر، پھوپھیر گزری ہے۔ لکھت پڑھت کی شناخت مٹ جاتی ہے۔ کھروں کی نہیں مٹتی۔ ان ڈھنڈاروں میں اگر مٹی کی تہوں میں کھرے ابھی باقی ہوں تو سب معلوم پڑ جائے گا کہ بار کے وسنیکوں کے کس ٹبر کے باپ دادے یہاں بستے تھے کبھی۔"

چناں اور بالی یکبارگی بولیں۔

"ہاں نا وہ جو ہمارے دادے سال میں ایک بار یہاں آ کر پکھیاں لگاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں ہمارے دادے آئے۔ تو کیا یہ وہی دادے ہیں۔" بھاگاں محتاج کے ماتھے پر سوچ کی تین لکیریں مزید گہری ہو گئیں۔ ہر ساونی یا ہاڑی آنے والے دادے پچھلی دو ھاڑیوں سے نہیں آئے تھے۔ اپنے پوتوں دوہتوں کے کسی اور قبیلے میں چلے گئے ہوں گے۔ اُن کی نسلیں کوئی ایک جگہ تھوڑی ہیں۔ ادھر ریاست میں کہ سندھ میں، ادھر لے کہ تھلوں میں۔

''ہاں وِنڑ! دوسا ؤنیاں لنگ گئیں دادے ہئے نہیں۔''

بھاگاں محتاج فکر میں پڑ گئی اور ایک پل میں فیصلہ کر لیا کہ اب کی بار دادے آئے تو ادھیارے والی کون سی بکری اُنھیں تحفے میں پیش کرے گی۔

خانہ بدوشوں کے یہ قبیلے جنھیں اپنا پورا شجرۂ نسب فر فر یاد ہوتا تھا جو سبق کی طرح اپنے بچوں کو بھی یہ روایت رٹاتے رہتے تھے۔ وہ ہر فصل میں کہیں سے اچانک اُتر آتے تھے۔ اور جانگلیوں کے یہ ٹبر جو اپنے کسی بڑے کے نام سے معروف ہوتے ہیں مثلاً کرمل کا ٹبر، وریام کا ٹبر، پہلوان کا ٹبر۔

اپنی زندگی میں تو وہ کرملی، وریاما اور پلو ہی کہلواتے رہے ہیں لیکن جب اُن پر سے نسلیں گزر جاتی ہیں تو پھر اپنے پورے پورے ناموں کا اعتبار حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ ان ناموں سے ایک پورا قبیلہ اپنی پکار کرواتا ہے۔ باروں کے یہ مسلی، کھوجے چوہڑے، جانگی باندے گولے اپنے آباؤ اجداد کے ناموں میں جیتے ہیں۔ اُن کے یہ دادے جو مسلسل سفر میں رہتے اور دو تین راتوں سے زیادہ کہیں قیام نہ کرتے۔

ان کے قافلے کی دھول، کتوں کے بھونکنے اور اونٹوں کے ڈکرانے کی آوازیں دور سے پتا بتا دیتیں کہ دادے آ رہے ہیں۔ وہ اپنے پوتوں دوہتوں کے قطار و قطار بنے کچے کوٹھوں کے سامنے پھیلے کھلے احاطے میں اپنے خیمے گاڑ دیتے۔

اُن کے خیمے پکھی واسوں کی پکھیوں کی نسبت زیادہ جدت کے حامل ہوتے کھلے کھلے بڑے بڑے شامیانے۔ ان کے چھکڑوں پر چارپائیاں بھی لدی ہوتیں۔ بستر اور برتن بھی۔ پکھی واسوں کی طرح کہیں مانگنے نہ جاتے کسی جٹ زمیندار کے دروازے پر بھی نہ جا بیٹھتے۔ وہ صرف اپنے پوتوں نواسوں سے دھڑلے سے لیتے جس بھی پہلے گاؤں میں اترتے تو پورے علاقے میں گونج پڑ جاتی۔

''دادے آ گئے دادے آ گئے۔''

آٹا دانا، بھینس گائے، بستر، اچھی نسل کے کتے، تحائف میں لے کر کسی اگلی بستی میں نکل جاتے۔ کبھی زبان سے کسی چیز کی فرمائش نہ کی۔ وہ تو اک شان سے اپنے پوتوں کے گھروں کے سامنے خیمہ زن ہوتے اور اُن کی میزبانی اک اعزاز سمجھی جاتی۔ تنوروں اور لوح پر موہ موہ کر پراٹھے دیسی گھی مکھن میں پکتے، چنے اور ثابت ماش کی رلویں دال چڑھتی۔ مرد خیموں والے احاطے صاف کرتے۔ رسوں کے لیے کھونٹے ٹھونکتے، بستر بچھاتے، ان پانی کا انتظام کرتے۔ وہ راجوں مہاراجوں کی طرح پدھارتے۔ اُن کے بیٹے ان کے اونٹوں گدھوں کتوں تک کی ٹہل سیوا کرتے۔

شاید یہ دادے انہی ٹھنڈاروں کے پرانے وسنیک تھے۔ چناں کو پہرے داروں کی زبانی کہی گئی کہانی یاد آئی۔

''سر! یہ یہاں کے باشندوں کے ہی باپے دادے تھے۔ کہاں سے آئے کہاں چلے گئے۔ تاریخ خاموش ہے لیکن یہ طے ہے کہ جس بستی سے دریا روٹھ گیا اس بستی سے یہ بھی منہ موڑ گئے۔ اور اُن کی تعمیرات کھنڈر بن گئیں۔ جدھر کو دریا مڑتا چلا گیا یہ بھی چلے جاتے رہے۔ تاریخ کا سچ یہی ہے کہ انسان فطرتاً خانہ بدوش ہے۔

▪▪▪▪

''ماسی! میرا جی بھی آوے کہ کسی میں، میں بھی جی جاؤں۔ پر جب کوئی کنجری ہوگئی تو پھر صرف کنجری رہ گئی۔ کوئی انگ ساک نہ رہا حالانکہ وہ کسی ماں باپ سے ہی پیدا ہوتی ہے پر بیٹی نہیں رہتی۔ بہن بھائی چاچے مامے پھوپھیاں ماسیاں سب ہوتے ہیں پر نہیں رہتے۔ جس روز کوئی کنجری ہوگئی اس روز سارے ساتھ چھٹ گئے صرف عورت اور مرد والا ازلی ساتھ رہ گیا جس پر کسی دین دھرم یا دیب کی مہر نہیں لگ سکتی۔

کنجری اپنی ذات میں اکلی۔''

کنجری آپ اک ذات ہے۔

کنجری آپ اک دھرم۔

چناں کھال کے پانی میں ڈبکی لگا آئی تھی اور چیکٹ بالوں سے میل بھرے قطرے مٹی کے فرش پر ٹپکتے تھے۔ آشوب زدہ آنکھوں سے لجلجا پانی بہتا تھا۔ گنگ ما سینہ مزید سکڑ گیا تھا۔ باں کے کوٹھے کے آلے میں رکھی آ تاروں سے اُٹھائی ہوئی الف ننگ مورتی جیسے اُسے دیکھ دیکھ مسکراتی ہو۔ اس نے ہاتھ مار مورتی اوندھا دی وہ بڑے بڑے پستانوں کے بل لیٹ گئی۔

چنی بڑبڑائی، "چھینی، نک کٹی، ٹھگنی۔"

"جب ماں مرے میں اکیلی رہ گئی۔ ساری رات ذرا سے وجود میں ڈر کرلاتا شوکتا دھاڑتا چیختا۔ پانی کی باریاں باندھنے والے چیخیں سن خود ڈر جاتے کہ شاید کوئی ڈھنڈاروں کی کافر چڑیل اندھی راتوں میں روتی ہے۔ سانپ، چوہے، بلے، کتے، بھیڑیے، دیو، بھگیاڑ، کتکلیوں والے سور بوھا بھن بھن جاتے۔ آخر بھج گیا ایک بار در ٹوٹ جائے تو پھر سؤروں کے ریوڑ کون روکے۔ میرے پاس بندوق پستول کوئی تھوڑی تھے۔

میں آپ ہی آپ تو کنجری نہیں ہو گئی، بنانے والوں نے بنایا۔ میں تو عورت مرد کے بیچ کو بھی نہ جانتی تھی۔ آٹھ دس سال کی نابالغ تھی کہ کچا گھڑا ٹوٹ گیا۔ پہلے گیدڑ، بجو، بلے، کتے سرنگ کھود کر شکار پر جھپٹے جب منہ سے لہو ماس لگ گیا تو بو ہر کہیں پھیل گئی پھر بھگیاڑ سؤر بھوکی پیاسی کو کھو مچھ جاتے تھے۔ ذرا بدن نے جان پکڑی تو آپ ہی من کو سمجھایا۔

یہ جو بھی کر جاتے ہیں اس میں ان کا فائدہ ہے اور میرا نقصان۔ جو نقصان کرتا ہے تو بھرتا بھی ہے۔ ایسا ہی ہے نا ماسی۔" ماسی کی بے نور آنکھوں سے آنسوؤں کے موتی تڑ تڑ ٹوٹتے تھے۔ دیکھ ماسی کوئی کسی کی دھڑ توڑے۔ پانی بھن لے۔ بھٹی چن لے، یا مال ڈنگر کھول لے یا دھی بہن نکال لے۔ تو پنچائیت ڈنٹ ڈالتی ہے نا بھرنا پڑتا ہے نا تو میرا جو

نقصان کر کے جاتے ہیں تو بھر کے بھی جائیں۔

جس دن کہا۔ میرا نقصان بھرو۔

جس بدن پر موت جاتے ہوئے سے جینے کے لیے اَن پانی بھی تو چاہیے اُسے جینے کو چوگا بھی دو۔ بس جس روز محنت کی مزدوری مانگی بس اُسی روز میں کنجری ہو گئی نہ مانگتی تو اندر خانے چاہے کچھ بھی ہوتی پر باہر خانے کنجری نہ کہلاتی۔ تو میں نے کہا چل منا اس سے پہلے کہ دوسرے تجھے کنجری مشہور کریں خود آپ کو آپ ہی کنجری کہہ دے۔ نہ راز کھلنے کا ڈر نہ بدنام ہونے کا خوف، جب ڈر اور راز کا پردہ آپ ہی اُٹھا دیا تو پھر بے عزت ہونے کا کھڑکا ہی نہ رہا۔ خود بے عزتی سر پر اُٹھالی تو وہی عزت بن گئی۔ وہی عزت جو ایک کنجری کو ملتی ہے جب مول چکانا پڑا تو قدر بھی بڑھ گئی۔ اب کوئی گالی نہیں دیتا۔ کیا دیں گے گالی۔

کنجری، لچی، بدمعاش۔

وہ تو میں نے آپ خود کو یہ نام دے دیے۔"

چنی کو لگا یہ کنجری کا پیشہ کتنا اونچا ہے۔ جو کنجری ہو گئی وہ بے خطر ہو گئی۔ یہ مورتیاں بھی کیا کنجریاں تھیں جو یوں ننگی منگی بے خطر کھڑی ہیں۔ کوئی انھیں نہ توڑتا ہے نہ پھوڑتا ہے۔ کس اکڑ سے کس شان سے کھڑی ہیں۔ ہے کسی میں جرأت انھیں پٹولے پہنانے کی۔ شاید ان میں بھی کوئی بالی ہو گی۔

"بالی کنجری۔"

▪▪▪▪

ڈھابے پر بیٹھی بالی نے جوتا اُتار کر کسی نکے پر اچھالا وہ اُچھل کر سامنے سے ہٹا تو جوتا چناں کے ڈھیلے ڈھالے تہہ بند میں اُلجھ گیا۔

"ادھر لا پولا۔"

''اوئے ادھر لا پولا۔'' بالی کڑکی۔ اُسی انداز میں جیسے یہاں کبھی کبھی چھوٹا تھانیدار آ کر بیٹھتا ہے تو نکے پر ایسے ہی کڑکتا اور گرجتا ہے۔ نکا چناں کی تہہ بند پھرول کر جوتا نکال بالی کی طرف بھاگا۔

چناں اپنی دھوتی جھاڑتی نکے پر جھپٹی لیکن وہ ایک ہی چھلانگ میں بالی کے قدموں میں بیٹھا اپنے چولے کے دامن سے جوتا صاف کر کے بالی کے پیروں میں پہنا رہا تھا اور پہنا کر جوتے کو چوم رہا تھا۔ چناں کو لگا بالی سنگ مرمر کی وہ دیوی ہے جو عجائب گھر کی الماریوں میں بھٹی کی پکی ہوئی مٹی کی مورتیوں سے الگ اک شان سے کھڑی ہے۔ جو کسی سنگ مرمر کے پہاڑ سے تراشی گئی ہے اور جس کی پوجا کی جاتی ہو گی۔ یہ بھٹی کی پکی ہوئی مورتیاں اس کی کنیزیں ہوں گی۔ یہ بالی بھی دراصل ڈھنڈاروں کے دھرم کی خدا ہے جس کی سب پوجا کرتے ہیں۔ اور اس کی کنیزیں.... چناں جیسی کئی ایک ہیں۔

بالی کسی پجاری کے ساتھ اُٹھ کر چلی گئی تھی۔ اپنی کوٹھری میں۔ شاید پوجا کروانے۔ کیا شاندار دیوی تھی۔ یہ بالی بھی۔ گلے میں ہنسلی، کانوں میں گول تار والی بالیاں جن میں لال، ہرا، نیلا موتی پرویا ہوا ہے۔ چھنگلیا سے کاجل لگا کر چیروں آنکھوں سے جب پجاریوں کو غصے سے دیکھتی ہے تو گھوڑے کے سموں والے اور سنگینوں والے اور سینگل بیلوں کی جوگوں کو من مرضی سے چلانے والے اور دھرتی کے سینے کو چیر کر فصلیں اگانے والے اور کسی مار کر پتھروں کو ٹکڑے کر دینے والے سبھی تھرا جاتے ہیں۔ دو قدم پیچھے ہٹتے اور پھر آنکھوں میں جاگتی لگاوٹ پر کھسیانی ہنسی ہنستے دو قدم آگے بڑھتے اس دیوی کے گرد ایک قدم آگے دو قدم پیچھے طواف جاری رہتا ہے۔ جو روز گت کھول ٹیڑھی مانگ نکال خوشبوئی تیل لگا کنگا کرتی ہے۔ بستی کی دوسری عورتیں اگر ایسا کریں تو کنجری کہلائیں لیکن وہ تو کہلاتی ہے۔ اس لیے اسے کوئی ممانعت بھی نہیں۔

وہ سلمے ستارے والی نکی بنیان پہنتی ہے اور کوئی پہنے تو کنجری کہلاوے لیکن وہ تو خود کو

آپ کنجری کہتی ہے۔ اردگرد کی بستیوں کے مرد اس کے بالوں سے اُڑتی خوشبوئیں سونگھنے آتے ہیں اور اس کے لیے رنگ برنگی بنیانیں اور پراندے اُدھر ساہیوال کے میلہ مویشیاں سے خرید کر لاتے ہیں۔

اُن کی اپنی بیویاں کڑوے تیل چپڑے میل سے چیکٹ بالوں کو جب مہینے دو مہینے بعد کھولتیں تو لگتا ہے دنوں پرانی مردار کی اوجری تمازت کی شدت سے یکبارگی پھٹ گئی ہے۔ ان کی جانگھوں اور بغلوں میں مہینوں کی مشقت کے بال پسینے کی بو، ابکائی بن جاتی ہے اور دانتوں کی سڑاند نامرد بنا دیتی ہے۔ یہ مرد بالی کی سلمے ستارے والی بنیان سے اُٹھتی چنبیلی کی خوشبو سونگھنے کو اس کے سینے سے ٹکرانے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔ اور منتظر رہتے ہیں کہ اسے غصہ دلا کر اس کا دھپا یا جوتی ہی کھالیں اور جب وہ ان پر جوتا اچھالتی ہے تو جوتے کو سینے سے مسلتے اور سونگھتے ہوئے مدہوش ہوتے ہیں جیسے جوتے کے اندر دیسی شراب بھری ہو جو چڑھ گئی ہو۔ وہ جوتے میں سوڈا ڈال کر پیتے اور پھر اسے چاٹتے ہیں کہ بالی کے نازک گلاب سے پیروں کو چپچپاہٹ نہ لگے۔ وہ منتظر رہتے ہیں کہ بالی اس گستاخی کی سزا اُنھیں دے اور لات مکے کے بہانے ہی ان سے چھو جائے۔ یہ سارے مرد بالی کی پوجا ہی تو کرتے ہیں۔ جیسے شیشوں کے پیچھے بند ان مورتیوں کی پوجا کی جاتی تھی جن کے برہنہ پستان بالی سے بھرے بھرے ہیں۔ چناں پر عجب انکشاف ہوا کہ مورتیوں کے پستان اور جانگھوں کے بیچ اتنا تفصیلاً کیوں گھڑا جاتا تھا۔

تو دراصل یہی خدا ہیں، جنھیں خدا کے بیٹے پوجتے ہیں جہاں سے نکلتے ہیں جس چشمہ حیات سے پیتے ہیں۔ عمر بھر انہی کے گرد پجاری بن گھومتے رہتے ہیں۔ جیسے بالی کے گرد آسن جمائے بیٹھے رہتے ہیں۔

■■■■

چناں کی بکریاں خرمستیاں کرتی عوام الناس کے محلے میں اُتر گئی تھیں۔ گارڈ سیٹیاں بجاتے سونٹے لہراتے فولادی کھر بجاتے ذرا سی بھوتنی چنی پر چڑھ دوڑے تھے۔

''میرا اجر (ریوڑ) کوئی امیروں کی بستی میں تو نہیں گیا۔ غریبوں کی وستی میں اُترا ہے۔ اپنے گھر جیسی وستی میں۔ تو نہیں روک سکتے تم اسے۔''

یہ جملے اُس کا اقرارِ گناہ تھا۔ اب اسے کون بچائے وہ پناہ کے لیے بالی کی کوٹھری کی سمت بھاگی۔

''بالی بالی۔''

اُسے لگا وہ ادھورا نام پکار رہی ہے۔ اس آواز پر تو کوئی دوسری بالی باہر نکل آئے گی۔ بالی کمہارن، بالی ونجارن، بالی ماچھن، بالی موچن، بالی نائین۔ کوئی بھی بالی ہو سکتی ہے۔

یہاں نام کے ساتھ پیشہ پکارا جانا ضروری ہوتا ہے۔ چند مروج ناموں کی شناخت کے لیے پیشہ یا رشتہ ضروری ہے۔

چناں نے سوچا۔ نہ کمہاری خود برتن چاک پر چڑھاتی ہے نہ موچن خود جوتے سیتی ہے، نہ جولاہی خود تانے بانے تنتی ہے۔ اُن کے مرد یہ سب کرتے ہیں تو اُن کے مردوں کے پیشے اُنھیں بھی ادھار پر مل گئے ہیں۔

لیکن بالی تو واحد ہے جو خود اپنے پیشے کے ساتھ پکاری جاتی ہے۔ یہ پیشہ کسی مرد کا ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ واحد پیشہ ہے جو بالی کے لیے وقف ہے۔ ورنہ درزی، باورچی، دستکار، ہر زنانہ پیشے میں بھی مرد گھس آتے ہیں۔

لیکن بالی اپنے پیشے کی خود مالک ہے۔

''بالی نی بالی کنجری۔''

بالی کنجری کا ڈراوا، ایسے تھا جیسے کوئی کہے وڈا تھانیدار صاحب!

''کیا ہے ری۔ کیا تیرے اندر بھی کچھ پھنسا ہوا ہے۔'' بالی کی دھنسی دھنسی سی آواز آئی۔

''کتنی دیر میں ویلی ہو گی تو باہر نکل یہ مارتے ہیں مجھے۔''

''ان پہرے داروں کا تو سب کچھ کھو مچھ کر میں ابھی وہیں واڑتی ہوں نا جہاں سے نکلے ہیں۔

ذرا صبر کر ابھی فارغ کرتی ہوں اس مچھل کو۔ دینے دس بیس چکانے سو پچاس ہیں۔''

چناں بھاگتی ہوئی بنا کنڈی والے ناتراشیدہ پٹوں سے ٹکرائی۔ دونوں پہرے دار اپنے سونٹے اس کے نازک حصوں میں چبھوتے گالیاں بکتے چڑھ آئے تھے۔ پٹ زور سے دائیں بائیں بجے۔ بالی لال شموز کی سلمے ستارے والی نکی بنیان چڑھاتی نظر آئی اور سانڈ ہانپتا ہوا اپنی نیلی شلوار۔

''ہائے دس والا نظارہ تو ہو گیا بنا خرچے کے دیدار۔ کیوں چھپائے رکھتی ہے بالی۔ دیکھنے کی چیز پر پہرے کیوں بٹھاتی ہے۔''

بالی نے گالیوں کے جھانپڑ مار مار منہ پھیر دیے۔

''منحوسو! ناپاک بالوں کے بدبودار پسینے ان مورتیوں پر انڈیلو۔ جن کی حفاظت کے پیسے لیتے ہو۔ کیوں چھپائے رکھتے ہو انھیں الماریوں میں۔ وہی کچھ تمہاری ماؤں کے بھی لگا ہے۔ جو یہاں دیکھنے آتے ہو۔ ماؤں سے کہو مفت میں دکھا دیں ادھر تو پیسے لگیں گے۔ وہاں فری میں۔''

اگرچہ بالی کو ہر گالی ہر طعنہ معاف تھا اُس کے طعنوں کا جواب ایسے ہی ہے جیسے کھہ کریدنا اور اپنے ہی سر پر ڈالنا لیکن ماں کے نام پر تنے ہوئے سونٹے مزید تن گئے۔

''بیچ میں ماں کو مت لا۔ تو سنبھال کر رکھ اپنا سب کچھ ہم چنی کا دیکھ لیں گے فری میں اور اسے سمجھا لے کھنڈروں میں اب کے بکریاں چھوڑیں تو جان سے جائے گی۔ اوپر سے حکم

آیا ہے دیکھتے ہی گولی مار دینے کا۔''

''نہ تمہاری ماں نے حکم بھیجا ہے پیو تو تمہارا کوئی ہے نہیں۔ جب ان کی اینٹیں بیچتے ہو۔ گورے باپوں کو چوری مورتیاں بیچتے ہو اس ویلے تو تمہارا ہڑ پا کم نہیں پڑتا۔ اس وقت میں گولی ماروں گی نہ تمہارے کلیجوں میں۔ اس غریب نمانی پر زور چلتا ہے۔''

''چل چنی چھوڑ اپنی بکریاں، امیروں کی حویلیوں والے کھنڈروں میں۔ دیکھتی ہوں نا کیا کرتے ہیں یہ بڑے افسر.... ایک ایک کے مال گودام سے پوری واقف ہوں۔''

گارڈ بندوقوں میں منہ چھپا کر بڑبڑاتے ہوئے اپنے اپنے آثاروں کو لوٹ گئے۔

''جس کی کوئی عزت نہ ہو وہ دوسرے کی کیا جانے۔ ایک بار عزت کا ٹوکرہ سر پر اُٹھا کر ہوکارے لگانے لگی۔ تو جس کی چاہے اچک کر بے عزتی کے ٹوکرے میں بھر لے۔''

بکریاں امیروں کی رہائش گاہوں کی دھول اُڑاتی نوگزے کی قبر والے دربار میں جا گھسیں۔

مجاوروں نے گھنگھریوں والے گھوٹنے سے اُن کی ٹانگوں پر مزید ضربیں لگائیں۔

جھوم جھوم کر حق ہو کے ردھم کے ساتھ۔

''ارے اوئے سائیں بابا۔ اگر ایک بھی بکری کی ٹانگ ٹوٹ گئی تو چڑھاووں والا غلہ اُٹھا کر نئی خرید دوں گی چھوکری کو....''

''بالی تو چپ رہ یہ دین اسلام کا مسئلہ ہے تو اپنی اوقات تک رہ ذات کی کنجری اور منھا قلندروں سے....''

''اوئے تیری کیا اوقات ہے۔ مجھ سے زیادہ تو تیری ماں اور تیری رن بھی نہیں جانتی تیری اوقات کو۔ اس مزار کی کنجری کون ہے جو ایمان بیچتی ہے جو قبر بیچتی ہے۔''

''کنجری پیشہ کرنی۔ تجھے تو میں....''

ملنگ گالیاں بکتا جھکتا حجرے میں چلا گیا۔ بالی سینہ ٹھونکتی ہوئی حجرے میں داخل ہوئی۔

''نہ کسے گالی دی تو نے۔ بالی کنجری کو کیا گالی دی۔'' ''کنجری'' کیا دھمکی دی۔ کیا کرنے کی دھمکی دی وہی جو تو کرتا ہے۔ اسی حجرے میں کرتا ہے انہی منتوں مرادوں کے پیسوں کے بدلے میں کرتا ہے۔

اب یہ گالی میرے لیے نہیں تیرے لیے بن گئی ہے۔ مجھ سے اُتر کر تجھ پر لگ گئی ہے۔ میں تو اپنی ذات میں سچی ہوں تو اپنی ذات میں جھوٹا ہے۔ میں دھوکا نہیں دیتی نہ دنیا کو نہ خدا کو تو دیتا ہے دھوکہ دنیا کو اور رب کو بھی۔

میں تو ذات کی کنجری ہوں خود بتاتی ہوں اپنا نام ''بالی کنجری''.... ہیں نا۔ تو بھی بتا تیرا نام کیا ہے۔ تو ذات سے کیا ہے۔ میں تو ایک گالی ہوں۔ جو خود کو اب نہیں لگتی، دوسروں کو لگتی ہے۔

تو تو اللہ لوگ ہے۔ بتا بالی کنجری سے کیا تعلق ہے تیرا۔ بتا ورنہ میں بتا دیتی ہوں۔ مجھے بتانے میں تو کوئی شرم نہیں ہے۔ پر تجھے تو بتانے میں شرم آتی ہوگی۔ کہ میں اپنے پیشے میں سچی ہوں تو اپنے پیشے میں جھوٹا ہے۔ بتا میری اوقات تا کہ تیری اوقات سامنے آئے۔''

ملنگ غصے سے تھرتھرانے لگا۔ جیسے نشہ ٹوٹنے لگا ہو۔ کڑے کھڑکنے لگے۔ ٹانگیں جھولنے لگیں۔ سر کانپنے لگا۔

''گدھی.... سورنی.... کتی۔''

''ہاں یہ گالی لگ سکتی ہے مجھے کیونکہ میں نہ گدھی ہوں نہ سورنی نہ کتی اور ان بے ہودہ گالیوں کا جواب تجھے ملے گا۔ ضرور ملے گا۔''

ملنگ کی سیاہ ریش اور مونچھوں کے بیچ میں سے جھاگ نکلنے لگا۔ ہونٹ لرزنے لگے۔

بالی نے ریزگاری والا غلہ اُٹھا کر ملنگ کے سر پر الٹ دیا۔

وہ پھسلا سنبھلتے سنبھلتے فرش پر یوں گرا جیسے ریزگاری نہیں اُس پر کہیں سے پتھروں کی

بارش ہوگئی ہو اور پوری بستی اُسے سنگ سار کرنے کو حملہ آور ہو چکی ہو۔ خوف زدہ زرد چہرے پر مردنی جم گئی۔ ڈاڑھی اور مونچھیں ساکن جیسے پتھر سے تراشی گئی ہوں۔

چنی ہنستے ہنستے اپنی بھیڑوں پر ڈھ گئی۔

''کنجر وادھا۔''

■■■■

چنی کو لگتا تھا بالی اس بستی کی سب سے طاقت ور عورت ہے۔ مردوں سے بھی زیادہ کیونکہ اسے کوئی گالی کوئی دھمکی کوئی زیادتی لگتی ہی نہ تھی بلکہ وہ سب تو خود دینے والوں کو لگتا ہے۔

بالی واحد ہے جو ہر گالی ہر دھمکی ہر زیادتی سے بلند تر ہوگئی ہے۔

اُسے لگا کنجری کا پیشہ سب سے اونچا اور سب سے طاقت ور پیشہ ہے۔ جو اللہ والوں کو بھی چپ کرا سکتا ہے۔ پہرے داروں کو بھی، سپاہیوں کو بھی، ڈھابے والوں کو بھی اور ہر اس شخص کو جو اپنی کوئی عزت سمجھتا ہے۔

کینٹین والے اسے مفت میں کوکے کولے اور چائے رس کھلاتے ہیں۔ ٹکٹ والے اس سے ٹکٹ نہیں مانگتے۔ دفتر کے بابو اسے دیکھ دیکھ باچھیں کانوں تک چیر لے جاتے ہیں۔ سپاہی اپنی کرسی اُسے پیش کر دیتے ہیں اور خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پہرے دار اس کی کوٹھری کی صفائی اپنے ہاتھوں کرتے ہیں۔ چھوٹا، وڈا تھانیدار اس سے رشوت لینے کی بجائے اُلٹا اسے دے کر جاتے ہیں۔ مالِ مسروقہ، کنگن اور بالیاں تک۔

آثاروں میں آنے جانے والے اسے دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں۔ جیسے شیشوں میں بندان بے جان مورتیوں کی نسبت جیتی جاگتی بالی زیادہ خوبصورت ہو۔ جیسے یہ مورتیاں اس کے وجود کے اندر جی اُٹھتی ہوں یا وہ ان مورتیوں میں چپ ہوگئی ہو۔

بولتی ہوئی دیوی سی بالی جس کے پجاری بے انتہا۔

سرکار جو ان مورتیوں کی حفاظت میں اتنے لمبے پیسے بھرتی ہے تو بالی جو سنگ مرمر سے تراشی ہوئی ان دیویوں کی زندہ تصور ہے تو لوگ ڈبل ٹکٹ بھر کر اسے دیکھنے آجایا کریں گے۔ جیسے چنی کو یہ پہرے دار گوروں کو دکھا دکھا کر نوٹ بٹورتے ہیں لیکن بالی کو دکھا کر نوٹ بٹورنے کی کسی کو بھی جرأت نہ تھی۔ اگر وہ خود چاہے تو یہ کر سکتی ہے۔ کتنی عزت تھی بالی کی.... ان تمام مردوں کے لیے وہ کتنی خاص تھی۔ سب اسے دیکھ دیکھ خوش ہوتے تھے۔ جیسے لال ٹھنڈے شربت کی بوتل بدن میں انڈیل لی ہو۔

گاؤں کی ان عورتوں کے سوا جو اسے کنجری کنجری کہہ کر زمین پر تھوکتی تھیں۔ بدلے میں وہ بھی انھیں گالیاں دے کر تھوک سکتی ہے۔ وہ بھی کہہ سکتی ہے۔ تم بھی تو ہر اس مرد کے ساتھ چھتناروں میں روپوش ہو جاتی ہو جو تمھاری مٹھی میں دس بیس پکڑا دے لیکن پھر بدلے میں شوہروں سے مار بھی کھاتی ہو اور کمائی بھی انھیں دینے پر مجبور ہو جاتی ہو۔ میں نہ مار کھاتی ہوں نہ کمائی دیتی ہوں۔ تم انتظار کرتی ہو کہ کون تمھیں اشارہ کرے لیکن سودا طے کرنے میں آزاد نہیں ہو۔ ڈرتی ہو کوئی سن دیکھ نہ لے۔ اسی لیے بس ایک اشارے میں اُٹھ کر ساتھ چل پڑتی ہو۔ بعض اوقات تو لے جانے والا محلبی اُٹھا کر بھاگ نکلتا ہے اور تم پیچھے سے اس کا کرتا بھی نہیں پکڑ سکتی ہو۔ واویلا بھی نہیں کر سکتی ہو بس آنسوؤں میں بھیگے گیت گا سکتی ہو۔

نالے منڈا رات رہ گیا۔

نالے دے گیا چوانی کھوٹی۔

میں پہلے نوٹ رکھواتی ہوں پھر انگیہ کو چھونے دیتی ہوں۔ تم جس مرد سے دن رات پٹتی ہو۔ اس کے ساتھ مفتی میں سوتی بھی ہو اور ہر سال اُس کا بچہ بھی جنتی ہو۔ تمہارے پاس نہ صاف کپڑے ہیں نہ نہانے دھونے کو تیل صابن نہ سک سرمہ کرنے کی جرأت، تجھ گندیوں، بوماریوں کو کوئی دیکھتا ہی نہیں خریدے گا کیا۔ اسی لیے جب کبھی بکتی بھی ہو تو سستے میں بک

جاتی ہو۔ میں تو من مرضی کا مول لیتی ہوں۔ مول بھرنے والا پہلے میری مشک لیتا ہے جیسے گلاب چنبے کو سونگھتا ہو۔ اور جب مست ہو جاتا ہے تو پھر سانڈ جیسا مرد بن جاتا ہے۔ تمہارے تو مرد بھی تمہاری بو سے نامرد ہو جاتے ہیں۔

چناں کو لگتا بالی ان سب عورتوں اور ان مورتیوں سے مہان ہے۔ نہ کوئی شوہر کہ اُسے روز روز نیلو نیل کر دے اور یہ ٹکوریں کرتے ہوئے اس کے لیے روٹیاں پکائے نہ ساس نند جو طعنوں تشنیعوں سے ادھ موا کر دیں۔ نہ چھاتیوں کو چونڈتے ہر ہر سال نئے سے نئے کتورے کہ شو پیسوں میں سجی مورتیوں کے پستانوں کی ساخت کو بکریوں اور بھینسوں کے دودھ نچڑے تھنوں کی شکل بنا دیں اور مورتیوں سے پیٹ کی پلیٹ سڈول رانیں اور کلائیاں داغوں، جھریوں اور لٹکے ہوئے پھیپھڑوں میں تبدیل کر دیں۔

اسی لیے تو ان کے شوہر بالی کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں جب زمین پر بندے بالی سے خوش ہیں تو آسمان پر کیا رب خوش نہ ہوتا ہوگا۔ اسی لیے تو اللہ نے اسے رج کے سوہنا بنایا ہے حوروں جیسا....زمین والوں کو حور کا تحفہ بالی....

بالی ہر روز پچھلے دن کی نسبت زیادہ خوبصورت اور جوان دکھتی ہے کسی ہوئی قمیص میں اپنی پوری ساخت دکھاتے کولہے، کمر، پستان، رانیں اور کلائیاں یہ تو لٹکے ہوئے پھیپھڑوں کو دکھا بھی دیں تو دیکھنے والا منہ موڑ لے۔

بالی لبوں پر سرخی لگا سکتی ہے دانتوں پر دنداسہ مل سکتی ہے۔ آنکھوں میں کاجل اور چہرے پر کریم پاؤڈر کیونکہ وہ کنجری ہے اس لیے یہ سب لگانے کی اُسے اجازت ہے۔ اسے سجنے سنورنے بننے تننے جملے اچھالنے مردوں کے حقے سے کش لینے اور اُن کے گندے مذاق سننے اور منہ توڑ جواب دینے کی آزادی ہے کیونکہ وہ کنجری ہے۔

پہرے دار گوروں کو دور سے اشارہ کر کے بتاتے ہیں کہ ہڑپا کی قدیمی آثاری عورتیں بالکل اسی طرح سنگار کرتی تھیں۔ ٹیڑھی مانگ نکال کر کھجوری گت کرتی اور سنہری

پنکھوں والا پراندہ ڈالتی تھیں۔

اگر گوروں کی خواہش ہو تو وہ چند ڈالر کے عوض ہڑپا کی پانچ ہزار سال پرانی عورت کے خدوخال کو آنکھ بھر کر دیکھ سکتے ہیں بلکہ اس کی حرارت کو چھو بھی سکتے ہیں۔ اور خود کو آثارِ قدیمہ والی فنتسی سے محظوظ کر سکتے ہیں۔ ہڑپا کی ناچنی دیوی کی طرح وہ خود کو لہرا بھی سکتی ہے۔ ناچ بھی سکتی ہے تب اس کے پیٹ کی پلیٹ میں دھری چیرویں آنکھ مسکرا سکتی ہے۔

اس کے بالوں کے کنڈل کھل سکتے ہیں اس کی کمر میں سو سو بل پڑ سکتے ہیں۔

ایک اعلان سے کتنے زبردست فائدے حاصل ہو گئے تھے بالی کو اگر وہ اعلانیہ کنجری نہ ہو جاتی تو گاؤں کی دیگر جوان عورتوں کی طرح کس قدر خسارے میں رہتی۔ صرف ایک اعلان کی جرأت سے سب مسخر ہو گیا۔

کسی لونڈے لپاڈے کو اس کی کوٹھری کی سمت دیکھنے کی جرأت نہیں تھی۔ سب جانتے ہیں تھانیدار اُسے خود سلام کرنے آتا ہے۔

اس پر بدکاری کا الزام لگا کر کوٹھری سے بے دخل کوئی نہیں کر سکتا۔ مولوی تک کو پتا ہے کہ پٹواری اپنے کھاتوں میں یہ جگہ اُس کے نام لکھ چکا ہے۔ جو اصل میں آثاروں کا حصہ ہے لیکن کسی سرکاری اہل کار کو آثاروں کی قیمتی زمین اُس سے واگزار کروانے کی ہمت نہیں ہے۔ ورنہ تو بالی کی کوٹھری کے نیچے دبے پانچ ہزار سال پرانی تہذیب کے آثاروں کو شدید خطرات لاحق ہو جاتے۔ اس کے ناپاک وجود سے ناپاک نہ ہو جاتے۔

بالی کے وجود سے سارا ماحول ہی بدل جاتا ہے۔ بالی کو صرف ایک نظر دیکھنے سے ان مردوں کا پورا وجود ترو تازہ ہو جاتا ہے۔ جیسے پیاسے حلق میں سوڈے کی پوری بوتل انڈیل دی ہو۔ صرف ایک اعلان سے بالی کو کیا کیا اختیار، اجازتیں جسارتیں اور آزادیاں حاصل ہو گئی تھیں۔

چنی کا بھی جی چاہتا کہ وہ بھی کنجری ہونے کا اعلان کر دے۔

بس ایک اعلان پھر ساری دھتکاروں، ماروں، گالیوں اور بھوکوں سے نجات پا لے گی۔ بالی کی طرح معتبر ہو جائے گی۔ کتنا سکھ ہے اس ایک اعلان میں۔

لیکن بالی کہتی ہے تو پھر بھی کنجری نہیں بن پائے گی۔ کیونکہ تو پھینی ہے ٹھگنی ہے کالی بھتی ہے تو کھجور کی گٹک سی تجھ میں کسی کو کیا سواد آئے گا۔ جو پیسے بھرتا ہے وہ وٹا تا بھی تو ہے پورا سواد لیتا ہے۔ تیری تو چمڑی میں بھی بھیڑوں کی جت کی بو گھلی ہے۔

تو بس بھیڑ بکریاں چرانے جوگی ہے ہاں کبھی کبھار کوئی بکرا اپنی جاہنگوں تلے تجھے دبالے گا اور تو میں میں کرتی رہ جائے گی۔

وہ بالی پر حملہ آور ہو جاتی ہے ''تو سڑتی ہے کہ کوئی دوسری تیری جگہ نہ لے لے۔ بالی میں تیری گوری چمڑی کھا جاؤں گی۔ تیری تیکھی ناک گاجر سی چبا جاؤں گی۔ تیرے اناری پستان وٹے مار مار ڈھا ڈالوں گی۔ ہر وہ شے جو تجھے کنجری بنائے ہوئے ہے تجھ سے چھین لوں گی اور خود کو لگا لوں گی اور تیری کوٹھری میں جا بیٹھوں گی۔''

بالی قہقہہ لگاتی ہے تو اس کے دنداسہ ملے موتیوں کے سے دانت کھلکھلاتے ہیں جیسے چنبے کے جھاڑ سے کلیاں ہر سو برس گئی ہوں۔

''اری یہ گھوڑوں کے سموں پر سوار کتلیوں والے روز یہی سب چھیننے ہی تو میری کوٹھری میں آتے ہیں۔ پچھلے پانچ برس سے پل پل حملہ آور ہو رہے ہیں۔ مگر کچھ نہیں چھین سکے۔ تیرا گٹک کا کیا حوصلہ۔''

چناں کے حوصلے ڈھ جاتے ہیں وہ بالی کے قدموں میں آن گرتی ہے۔

▪▪▪▪

صنوبر

چنی جب محتاج بھاگاں کی انگلی پکڑے اُسے صنوبر بی بی کی چار دیواری میں
ادھیارے کی کسی بھیڑ بکری کا حساب کروانے لاتی تو گھپ گھپ چلتے ٹیوب ویل کے نل پہ
نوکرانیاں مزارعیاں کپڑے دھو رہی ہوتیں۔ بڑی بڑی دوہریں، دریاں، مجنوں کھیس،
ابلتے ہوئے ہنڈوں میں بھاپیں چھوڑتے۔ چولہوں میں کپاس کی چھٹریوں اوپلوں اور کیکر کی
پکی لکڑیوں کے بھانبھڑ بل رہے ہوتے۔ بڑے بڑے چولہوں کی گرم راکھ میں شکر قندی،
پیاز کے گنڈے اور آلو دبے ہوتے۔ کامیاں آموں کی گھٹلیوں پر چکنی مٹی کا لیپ کر کے
راکھ میں دبا دیتیں۔ بھننے کے بعد اوپرلا سخت خول توڑ کر اندر کی کرکری گری چبا جاتیں۔
گندم باجرے کے سٹے اسی راکھ میں بھون کر ہتھیلی پر مروڑ کر پھکا مار جاتیں۔ سخت
ہتھیلیوں میں سٹے کی سولوں سی نوکیں چبھ کر ٹوٹ جاتیں پر زخم نہ کر پاتیں۔ حاملہ عورتیں اسی
راکھ میں گاچنی اور روڑ بھون کر کھاتیں اور جب بچے پیدا ہوتے تو ان کے سر مٹی سے لیپ
ہوتے۔

کچے چھولیے کے تھبے بھر بھر انگاروں پر رکھ ہولیں ساڑتیں اور برسات کے موسم میں نہروں سے تالاب میں بہہ آنے والے مچھلیوں کے پونگر کو اسی گرم راکھ میں دبا دیتیں اور جب اُن کی تڑپ پھڑک ختم ہو جاتی تو پھر انتڑیوں اور کانٹوں سمیت پور بھر مچھلی کو چبا جاتیں۔

یہ چولہے ایک کائنات تھی جس کی باقیات سے اک دنیا پل رہی تھی۔

پیپوں کے اندر سیاہ کھار، کاسٹک سوڈا اور دیسی صابن کے ٹکڑوں کا محلول گندے کپڑوں کو نکھار رہا ہوتا وہ تھاپوں سے دبا دبا کر بھاری کپڑوں کو اندر دھکیلتیں۔ بھاپ فصیلوں پر چڑھتی اونچی فصیلوں کے ساتھ آموں، سنگتروں، امرودوں اور میٹھے کے پھل دار درختوں کی قطاریں کھٹی میٹھی خوشبوئیں لنڈھاتیں۔

جن پر کوئل کوکتی اور فاختائیں اللہ ہو یوسف کھو کی تاریخی گواہیاں پیش کرتیں۔ کبوتر چونچیں لڑاتے اور کبوتریوں کے پنکھوں کو بٹھا لیتے۔ طوطے ٹیں ٹیں کرتے۔ طوطیوں کے پنکھوں میں لال ٹیڑھی چونچیں کھبوتے اور پیار سے لبھاتے۔

ٹیوب ویل کے کھاڈے میں جھاگ سے بھرے پانیوں میں چڑیاں سر ڈبو ڈبو کر نہاتیں اور پر جھنکار کر اُڑانیں بھرتیں اور پھوواریں سارے میں برس جاتیں کن من برستی۔ چڑیاں، گل دم، فاختائیں، لالیاں بیا، ہدہد، سیاہ اور لال تاج والی چڑیاں، گل رنگ پروں والی چڑیاں، پانیوں میں نہاتی اور پر جھنکارتیں ان گنت قسموں اور رنگوں کی چڑیاں۔

ڈالیوں سے گزوں لمبے لٹکتے چھتے شہد چواتے، تتلیاں ست برگے کے پھولوں سے رس چراتیں اور تاریک راتوں میں جگنو چراغاں کرتے۔

لیکن صنوبر کو یہ سب نظارہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ رہائشی حصے کے برآمدے کی آخری سیڑھی سے نیچے نہ اُتر سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں اور کانوں کو سب نظاروں اور آوازوں کا پردہ تھا۔

جب اس کی ہم عمر لڑکیاں ٹیوب ویل کے کھاڈے میں ڈبکی لگا جاتیں اور دوسری اسے پکڑ کر باہر نکالنے کے بہانے سے خود بھی اندر شڑاپ سے گر جاتی۔ ٹیوب ویل کے بڑے سے نل کے تیز پانیوں میں بنتی سفید جھاگ کے گالے اُٹھا اُٹھا تھاپے سوٹے مار مار بھاری کھیس دریاں کوٹتی لڑکیوں عورتوں پر اچھالتیں اور اک لے میں گیت الا پتیں۔

گامن ای نیں کوئی پتلا پتنگ اے
مور دی گچی گا منا وے تیرا سونے دا رنگ اے

ایک دوجی کو لڑکوں کے ناموں سے چھیڑتیں۔ سکھ سنیہے دیتیں۔ بدلے میں گالی دینے والی کی چوٹیا پیچھے سے یوں کھینچتیں کہ گردن اکڑ جاتی۔ اور جھپٹا مار کر اوپر چڑھ بیٹھتیں۔ دونوں گتھم گتھا ٹیوب ویل کے کھاڈے میں اندھا تیں چیختی چلاتی ایک دوجی کو گالیاں دیتیں۔ لیکن گلا گھونٹ کر کہ زندگی کی اس ہماہمی کی کوئی رمق بڑی بی بی جی یا صنوبر بی بی کے کانوں سے مَس نہ ہو۔ خصوصاً صنوبر بی بی کہ اس کی سماعتوں کو تمام آوازوں کا پردہ ہے۔

وہاں کی کائنات میں موجود ہر ہر شے کو اپنے وجود کی آزادی حاصل تھی۔ پنپنے، بڑھنے، پھیلنے پھولنے اور اپنے جبلی وصف کو دہرانے کی فطری اجازت۔ یہ نوکروں مزارعوں کی لڑکیاں بھی فطرت کی روئیدگی جیسی پودوں اور جانوروں کی طرح پیدا ہوتیں۔ بڑھتی پھولتی اور مرتی مٹتی، اپنے جیسے لیکن اپنے سے طاقت ور انسانوں کے رحم و کرم پر جیتیں۔

جیسے یہ نوکرانیاں بڑی بی بی جی کے رحم و کرم پر جیتی ہیں لیکن وجود بھر کی آزادی ضرور رکھتی ہیں۔ چوری چھپے یا چھین جھپٹ کر تمام تر ڈانٹ پھٹکار اور مار پیٹ کے باوجود وہ اپنے بدن کے پھلنے پھولنے یا سکڑنے مرنے کی آزادی رکھتی ہیں۔ جسم میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کی آزادی۔ بلوغت کے اعلان کی آزادی، شادی اور بچوں کی پیدائش کی آزادی۔ ماہواری اور حمل کی آزادی۔ کسی مرد کو دل میں سمونے کی آزادی، کسی مرد کو خود پر عاشق ہو

جانے دینے کی آزادی، اس سے چوری چھپے ملنے کی آزادی اور اس کا حمل اٹھانے کی آزادی۔

اٹھا کرنے تک سرمہ ملنے کی آزادی، حدکی بنیان مخفیہ مخفیہ پہننے کی آزادی۔ یہ نوکرانیاں کتنی امیر تھیں کاش وہ بھی انہی میں سے ایک ہوتی۔

لیکن اس قلعہ نما گھر میں بند شہزادی کو ان جسمانی تبدیلیوں کی، بلوغت کے اظہار کی اجازت نہ تھی۔ صنوبر کی بلوغت کسی عذاب کی طرح آئی اور عفریت کی طرح اس کے چرمر وجود سے چپک گئی۔

بدن میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اُسے شدید خوف، شرمندی اور کرب کا شکار کر گئی تھیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے وجود کی یہ بغاوت یہ فطرت کی دست درازیاں کہیں کاٹ پھاڑ کر کسی کالے کنویں میں پھینک دیتی یا ان سمیت ہی کسی قبر میں خود کو دفن کر دیتی۔ کئی بار اس نے سوچا رات کے کسی پہر دبے پاؤں اُٹھے اور ٹیوب ویل والے کھاڈے میں ڈوب مرے لیکن ڈوب کر تو وہ سامنے آجاتی اور اس کے ساتھ ان جرائم کا سراغ بھی بھی پا لیتے۔ دفن ہو جانا زیادہ مناسب تھا یوں اس کے بدن تک کسی کی رسائی نہ ہو پاتی۔ اور فطرت کی سیاہ کاریاں بھی چھپ جاتیں۔

ان دنوں اس نے مر جانے کہیں دفن ہونے یا کسی جن یا پری کے اُسے اُڑا لے جانے کی اتنی دعائیں کی تھیں کہ اگر کہیں دنیا میں دعا کی قبولیت کا کوئی نظام موجود ہوتا تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی۔ صنوبر کو لگتا خدا صرف گنہگاروں کا خدا ہے۔ جس طرح وہ گناہ کرنا نہیں چھوڑتے خدا سزا دینا نہیں چھوڑتا۔ اگر وہ گناہ کرنا چھوڑیں تو پھر خدا کے کرنے کو بھی کوئی مصروفیت نہ رہے۔ اس کے گناہ کی سزا بھی اُسے مل کر رہے گی کوئی رورعایت نہ ہوگی۔

وہ خود کو اوڑھنی میں لپیٹے دوہری ہو گئی۔ پھر تہری ہوتی چلی گئی۔ پسلیاں اندر دھنس گئیں۔ کمر کی ہڈی باہر کو کُب کی شکل میں نکل آئی۔ لیکن فطرت کی دست درازیاں رک نہ سکیں۔

جانے دینے کی آزادی، اس سے چوری چھپے ملنے کی آزادی اور اُس کا حمل اُٹھانے کی آزادی۔

کنگھا کرنے سک سرمہ ملنے کی آزادی، حد تنگی بنیان خفیہ خفیہ پہننے کی آزادی۔ یہ نوکرانیاں کتنی امیر تھیں کاش وہ بھی انہی میں سے ایک ہوتی۔

لیکن اس قلعے نما گھر میں بند شہزادی کو ان جسمانی تبدیلیوں کی، بلوغت کے اظہار کی اجازت نہ تھی۔ صنوبر کی بلوغت کسی عذاب کی طرح آئی اور عفریت کی طرح اس کے چر مُر وجود سے چپک گئی۔

بدن میں رونما ہونے والی تبدیلیاں اُسے شدید خوف، شرمندی اور کرب کا شکار کر گئی تھیں۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ اپنے وجود کی یہ بغاوت یہ فطرت کی دست درازیاں کہیں کاٹ پھانٹ کر کسی کالے کنویں میں پھینک دیتی یا ان سمیت ہی کسی قبر میں خود کو دفن کر دیتی۔ کئی بار اس نے سوچا رات کے کسی پہر دبے پاؤں اُٹھے اور ٹیوب ویل والے کھاڈے میں ڈوب مرے لیکن ڈوب کر تو وہ سامنے آجاتی اور اس کے ساتھ ان جرائم کا سراغ بھی سبھی پا لیتے۔ دفن ہو جانا زیادہ مناسب تھا یوں اس کے بدن تک کسی کی رسائی نہ ہو پاتی۔ اور فطرت کی سیاہ کاریاں بھی چھپ جاتیں۔

ان دنوں اس نے مر جانے کہیں دفن ہونے یا کسی جن یا پری کے اُسے اُڑا لے جانے کی اتنی دعائیں کی تھیں کہ اگر کہیں دنیا میں دعا کی قبولیت کا کوئی نظام موجود ہوتا تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی۔ صنوبر کو لگتا خدا صرف گنہگاروں کا خدا ہے۔ جس طرح وہ گناہ کرنا نہیں چھوڑتے خدا سزا دینا نہیں چھوڑتا۔ اگر وہ گناہ کرنا چھوڑیں تو پھر خدا کے کرنے کو بھی کوئی مصروفیت نہ رہے۔ اس کے گناہ کی سزا بھی اُسے مل کر رہے گی کوئی رو رعایت نہ ہوگی۔

وہ خود کو اوڑھنی میں لپیٹے دوہری ہو گئی۔ پھر تہری ہوتی چلی گئی۔ پسلیاں اندر دھنس گئیں۔ کمر کی ہڈی باہر کو کُب کی شکل میں نکل آئی۔ لیکن فطرت کی دست درازیاں رک نہ سکیں۔

وجود کو گچھا مچھا بنا کر وہ رات بھر اس کی مسماری کی دعائیں کرتی، ہاتھ جوڑتی، نمازیں پڑھتی، رو رو کر گڑگڑاتی۔ لیکن فطرت کی کارگزاری کی معافی تو خدا بھی نہیں دیتا۔ فطرت کو خود کار چھوڑ دیتا ہے مزاحم نہیں ہوتا۔ ورنہ زلزلوں طوفانوں سیلاب وباؤں کو ہونے سے منع کر دے تو کیا رک نہ جائیں۔ اس کے اندر سے پھوٹنے والی فطرت بھی خود مختار تھی۔ وہ سمٹتی سمٹتی چھلا سا بن گئی لیکن بڑی بی بی جی کی تیز نظریں اور تلوار زبان اسے کبھی اپنے قدموں پر کھڑا نہ ہونے دیتیں۔

''گٹھ تے مٹھ بے حیا، قد دیکھو عمر دیکھو اور ممے نکال لیے ہیں۔ ارے ہم اتنی اونچی لمبی، قد کاٹھ والیاں تھیں۔ لیکن پتا بھی نہ تھا۔ سیدھا سینہ اور یہ گٹھ تے مٹھ۔ گندی سوچ گندے خیالوں کا نتیجہ گندا.... بے حیا، بے شرم، کچھ کھا کر مر کیوں نہیں رہتی۔'' اس کا جی چاہتا وہ ان کے قدموں میں گر جائے اور گڑگڑا گڑگڑا کر التجا کرے۔

خدا کے لیے مجھے مار دیجیے میں خود سے نہیں مر رہی خدا واسطے آپ مجھے مرنے میں میری مدد کیجیے۔

اسے یقین ہو گیا تھا کہ جسم میں آنے والی یہ تبدیلیاں اس کے کسی گناہ کا بھیانک نتیجہ ہیں۔ پتا نہیں یہ گندے خیالات اس کے اندر کب اور کہاں سے داخل ہو گئے جنھوں نے اس کا یہ حشر کر دیا تھا۔ اسے علم ہی نہ ہوا کہ کب وہ ان گندے خیالات کی آمجگاہ بن گئی۔ وہ تو دن بھر پھولوں پر منڈلاتی تتلیوں کے ست رنگ پروں کے رنگ گنا کرتی تھی، پانی کے سیمنٹڈ نالے کے دونوں اطراف اُگے نیاز بو کے پودوں پر روشنیاں بکھیرتے جگنوؤں کے جلنے بجھنے کا راز پانے کی کوشش کرتی تھی۔ لمبے لٹکتے شہد کے چھتوں کی ذرا ذرا تجوریوں سے خانوں میں چھپی مدھ مکھیوں کی بھین بھین سنا کرتی تھی۔ ٹیوب ویل کے کھاڈے میں ڈبکیاں لگاتی چڑیوں کی اَن گنت قسموں کا شمار کیا کرتی تھی۔

بارش کے بعد چشمِ زدن میں اگ آئے بیر بہوٹیوں کے مخملیں فرش کو حیرت سے تکا

کرتی جوذراسی دھوپ میں چڑ مڑا جاتا۔ ستاروں سے گچ نیلے آسمان کے افق پر قوسِ قزح کے جھولے میں جھولا کرتی، درختوں کے تنوں پر رینگتے کیڑوں، ڈالوں پر پھدکتی گلہریوں اور شاخوں میں گھونسلے بنتی بیا کی ہنر کاریوں کو دیکھا کرتی۔ یہی اس کی دنیا تھی جس میں جل پریاں، سانپ شہزادے، آدھے پتھر دھڑ والی شہزادیاں، سواری کے لیے تیار سنبل کے درختوں پر بیٹھے راج ہنس، اُڑن کھٹولے، سنہری پریاں جو نیک لوگوں کی مدد کے لیے کہیں سے اچانک اُتر آتی تھیں۔ آج اسے ان کی ضرورت تھی تو وہ سب اپنے ازلی پیشے سے نجانے کیوں دستبردار ہو گئے تھے۔ اور اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔

لیکن ان کرداروں میں سے تو کسی کے بدن پر ایسی غلاظتیں نہ چمٹی تھیں۔ جیسی اُس پر مسلط ہو گئی تھیں۔ اُسے تو ان غلاظتوں سے نفرت کرنا سکھایا گیا تھا اور وہ ہمیشہ نفرت ہی کرتی رہی تھی۔ ایک بار گاؤں کی کوئی عورت اُس کے لیے گڑیوں کا ایک جوڑا بنا کر لائی تھی۔ وہ سلی ہوئی گڑیاں تھیں جن کی لمبی لمبی سیاہ چشم، تیکھی ناک، بھاری کولہے اور سب سے شرمناک تو وہ حصے تھے جو اوڑھنی میں چھپائے گئے تھے۔ بڑی بی بی جی کے اندر ہر پل بہنے والا فشارِ خون ان گڑیوں کو دیکھ کر جیسے پھٹ پڑا تھا۔ گالیوں اور لعنتوں کے لٹھ اُٹھا اُسے گڑیوں سمیت حویلی سے باہر دھتکار دیا گیا تھا۔

تب اُسے معلوم ہوا تھا کہ یہ کوئی انتہائی معیوب اور قابلِ مذمت چیز ہے شکر ہے کہ اس کے نہیں لگی ہوئیں۔ لیکن پھر اچانک اس کے وجود میں بھی یہ نمودار ہونے لگیں۔ اور پھر اس کے ساتھ ہی بڑی بی بی جی کا رویہ ویسا ہی نفرت انگیز ہو گیا جیسے گڑیا لانے والی کے ساتھ ہوا تھا۔

اُسے یقین ہو گیا کہ وہ کسی ایسے خوفناک گناہ کی مرتکب ٹھہری ہے جس کی سزا کے طور پر اللہ میاں نے اسے بدنما اور داغ دار کر دیا ہے۔ اب وہ اُس عزت اور محبت کے قابل نہ رہی تھی جو اُسے کبھی بچپن میں ملا کرتی تھی۔

جاہنگوں کے بیچ اُگی بے ترتیب سیاہ غلیظ گھاس بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ کئی بار سوچا آگ لگا دے پھر خوف دامن گیر ہوا کہ دھواں نکلتے سب دیکھ لیں گے۔ اور پھر ایک روز اچانک یہ سیاہ گھاس دھویں کی بجائے خون سے لتھڑ گئی۔ وہ بار بار دھوتی پھر لتھڑ جاتی اس سے کچھ ایسا ضرور سرزد ہو گیا تھا کہ اس کے اندر سے خون چھوٹ پڑا تھا۔ کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی بدکاری۔

وہ جو سانپ شہزادہ تھا وہ جو ہنس راج تھا، وہ جو شہزادہ بخت آور تھا۔ وہ جو جانی چور تھا۔

وہ جو پانی کے محل میں رہنے والی پنج پھلاں رانی کو بچانے کو نکلے تھے اور جن کی جان والے طوطے کی گردن مروڑ دی تھی اور پنج پھلاں رانی کو بچا لیا تھا تو وہ سب اُس کی مصیبت میں کہاں تھے۔

اُسے کٹھور دل والے خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ جو اس کی کبھی نہ سنتا تھا اگر سنتا تو وہ آج جیتی تھوڑی ہوتی۔

وہ جتنا دھوتی زخم اُتنا ہی کھلتا چلا جاتا۔

وہ رو رو کر گڑگڑا کر خدا سے معافیاں مانگتی کہ شلوار پھر نہ بھرے پر وہ پھر بھر جاتی۔

کتنا چھپانے کی کوشش کی لیکن پھر بھی کسی گدھ کی آنکھ والی نوکرانی نے جھپٹا مارا۔

''ہائے نکی بی بی تیرا تو سر پلید ہو گیا ہے۔''

اور وہ ٹیڑھی چونچ میں اُس کی پہلی آنت پکڑ کر ہر سو مشک دھمانے بھاگی۔

وہ اُسے روکنا چاہتی تھی راز کو راز رکھنے کی درخواست کرنا چاہتی تھی۔

لیکن اسے زبان کھولنے کسی حرف کی ادائی کرنے، رائے زنی کرنے کی جسارت کہاں تھی اور پھر اس کی تو کبھی خدا نے نہ سنی تھی نوکرانی کیا سنتی۔

مردار کی مشک بڑی بی بی جی کی ناک تک پہنچ چکی تھی۔ جب وہ صنوبر کے کمرے میں

آ ئیں۔کاش وہ اس سے پہلے ٹیوب ویل کے کھاڈے میں ڈوب کر مرچکی ہوتی۔اس نے بھاگ کر ڈوبنے کا پورا فیصلہ بھی کر لیا تھا لیکن پیروں نے ارادے کا ساتھ ہی نہ دیا۔اس کے اپنے اعضا بھی اس کے تابع نہ تھے۔البتہ اُسے ایسا ضرور لگا کہ اُس کا دھڑ پتھر کا ہو گیا ہے اوراس کے وجود سے لگی ساری آلائشیں منجمد ہوگئی ہیں۔

لیکن ایسا کچھ ہوا نہیں۔ وہ لہولہان ایک مطلق العنان قاضی کے روبرو جرم کی سبھی گواہیوں کے ہمراہ کھڑی تھی۔ بڑی بی بی جی نے شدید نفرت اوراحساس برتری سے ناک سکیڑی۔

''گندے خیالات کا نتیجہ گندا، کتنا بکتی تھی نہ کھا گوشت نہ پی چائے۔ پر سوَرنی نے کر کے چھوڑا۔''

جن پیروں پر نگاہیں جمی تھیں وہ لرز رہے تھے۔کانپتی ٹانگوں سے قطرے گر گر کر پیروں پر ٹپک رہے تھے۔پیروں کی رنگت اتنی زرد تھی جیسے پورا خون کسی گدھ نے چونچ کی ڈرپ کھبو کر چوس لیا ہو۔پپری جمے ہونٹ مسوڑھے پر یوں اکڑ گئے تھے کہ دانت باہر نکل آئے تھے اور بتیسی کوشش کے باوجود بند نہ ہو پا رہی تھی۔

کاش وہ گوشت اور چائے کو کبھی ہاتھ نہ لگاتی۔

لیکن وہ تو بس وہی گوشت کھاتی تھی جو اس کے سالن کی پلیٹ میں وہ خود ڈال کر دیتی تھیں۔وہ چائے کا کپ بھی بس وہی پیتی تھی جو وہ خود اپنے ہاتھوں اُسے پکڑاتی تھیں۔ یہ جرأت اس میں کب کبھی پیدا ہونے دی گئی تھی کہ وہ خود سے کوئی چیز اُٹھا کر کھا لیتی۔وہ تو بس وہی ایک روٹی کھاتی جو اُس کے کھانے کی ٹرے میں رکھی آتی۔ جو اس کا پیٹ کبھی نہ بھرتی تھی۔لیکن مزید روٹی کا ٹکڑا مانگنے کی جرأت اس میں کبھی پیدا نہ ہوئی حالانکہ بہت ساری روٹیاں چھابے میں فالتو پڑی رہ جاتیں لیکن اُسے مانگنے کا نتیجہ معلوم تھا۔

''ہائے ہائے ھابڑے کی ماری ہوئی بھوکی۔مسلنوں کی طرح رجتی نہیں کھا کھا کر

مے نکالے گی ابھی سے....''

یہ لفظ ''مے'' بے شرمی کا کوئی غلیظ گڑھا جس میں وہ شرم سے گڑ جاتی، بھوکی مرجاتی، کبھی کچھ نہ کھاتی۔ انواع واقسام کی اشیائے خور ونوش گھر میں ٹھنسی رہتیں۔ جو اس کے دونوں بھائی بے دریغ کھاتے پھینکتے، مسلتے لیکن اُسے کسی شے کو چھونے کی ہمت نہ ہوتی۔ اگرچہ اُسے کھانے سے کوئی روکتا بھی نہ تھا۔ لیکن اُٹھا لینے کے بعد کے طعنے تشنعوں کے تصور نے کبھی آزمانے کی بھی جرأت نہ دی۔

وہ ناشتے کے بعد دوپہر کو ملنے والی واحد روٹی کے انتظار میں بھوک سے نبرد آزما رہتی۔ پیٹ میں کڑل پڑتے۔ لگتا بھوک اسے ادھ موا کر دے گی۔ اس کے بھائی پیسٹریاں، مٹھائیاں، کیلے، آم، سیب، انگور دن بھر اس کے سامنے ٹھونستے ہر سو مونگ پھلیوں، چلغوزوں، پستوں، اخروٹوں کے چھلکے پڑے رہتے۔

نوکرانیاں بھٹے بھونتیں، ہولیں ساڑتیں، بھٹی سے دانے بھنواتیں۔ سٹے راکھ میں بھون کر گرم گرم سوندھی سوندھی خوشبو والے سٹے ہتھیلی میں مروڑ کر پھکے مارتیں۔ درختوں سے شہتوت ٹپکتے۔ لسوڑے رس چواتے۔ ملائی کی موٹی تہہ والی دودھ کی کاڑھنیاں ابلتی رہتیں۔ مہمانوں کے لیے ہر وقت چولہے پر چائے ابلتی اور پراٹھے پکتے، گڑ، شکر، شکر قندی کی بوریاں انباروں میں بھری ہوتیں جنھیں چوہے کترتے رہتے۔ صحن کا ایک حصہ موسم کے مطابق آئے خربوزوں، تربوزوں، گاجر، مولی، ککڑی کے ڈھیروں سے بھرا رہتا جنھیں نوکرانیاں چباتی رہتیں اور کتے بلے سونگھتے۔ ہر سو خوراک ہی خوراک رولتی۔ لیکن وہ خالی پیٹ کے کڑل سے دوہری ہوتی رہتی بس وہی ایک روٹی جس سے اُس کا پیٹ کبھی نہ بھرتا۔ اُس نے اتنی بھوک عمر بھر سہی تھی کہ اتنی تو کملے ملی نے بھی نہ سہی ہوگی۔ پھر بھی خوراک کی اس قلت بھوک کی برداشت اور کمزور جسامت کے باوجود بھر خوراکوں والا مرحلہ اس پر آن پہنچا۔ فطرت کی کارگزاریوں سے وہ بچ نہ پائی۔

تھر تھر کانپتے پیروں پر قطرہ قطرہ خون ٹپک رہا تھا۔ لرزتی ہوئی ٹانگوں سے شلوار چپک گئی تھی۔ کبڑی کمر اور کوشش سے اندر دھنسائے سینے پر لپٹی اوڑھنی پر بھی خون کے داغ لگ چکے تھے۔

ہونٹوں پر جمی سفید پپڑی اور باچھوں کے کناروں سوکھا ہوا لعاب خوف سے ساکت پتلیاں جن میں آنسوؤں کا سیلاب منجمد ہو گیا تھا۔ چہرے پر کھنڈی زرد مردنی، جیسے دفن کے اگلے روز مردے کو کفن سمیت کسی گیدڑ یا بجو نے باہر گھسیٹ لیا ہو، اکڑ کر ناکافی ہو چکے ہونٹوں سے نکلے سفید ٹھنڈے دانت، خوف نے جبڑے کی ہڈی کو اتنا اکڑا دیا تھا کہ ہونٹ دانتوں سے بہت پیچھے کھسک گئے تھے لیکن دل پھر بھی اس تیزی سے بھاگ رہا تھا جیسے اس کے پیچھے بولی کتے لگے ہوئے ہوں۔

''بدذات یہ لے کپڑا رکھ، سورنی۔ نہ عقل نہ شعور۔''

انھوں نے جھاڑ پونچھ والی غلیظ دھجی اُس کے منہ پر ماری۔

''کوئی شرم نہ حیا۔ کرتوت گھول بیٹھی ہے تو پھر نمائش لگانے سے پہلے مر کیوں نہ گئی۔''

اُس نے مرنے کی جتنی دعائیں کی تھیں اگر کہیں کوئی موت ہوتی تو اس تک ضرور پہنچ جاتی۔ لیکن اس کی گیارہ بارہ برس کی عمر کی دعاؤں کا ایک ہی نتیجہ تھا کہ وہ کبھی سنی نہ گئی تھیں۔ خدا جو ستار ہے اس کا کبھی پردہ نہ رکھتا تھا۔ اس کی ہر غلطی پکڑی ہی نہ جاتی بلکہ بڑھا چڑھا کر پیش ہوتی تھی۔ خدا جو رحیم ہے اس پر کبھی رحم نہ کرتا تھا وہ ہمیشہ بھگیاڑوں اور بولی کتوں کے نرغے میں بیٹھے بٹھائے پھنس جاتی۔ اور اس ناقابلِ معافی گناہ کی سزا تو سوائے گولی کے دوسری کوئی ہو ہی نہ سکتی تھی۔ کتنا سکون تھا موت میں اور کتنی اذیت تھی اس زندگی میں۔ خدا اسے کیوں موت دے گا۔ پھر ان لعنتوں گالیوں بے چارگیوں، بے بسیوں، بھوکوں، دہشتوں کا ہدف کون ہوگا۔ یہ سب بھی تو انہی محکوموں پر نازل کرنے کے لیے بنے ہیں۔ اگر

انسانوں کی یہ قسم نہ رہے گی تو نازل کرنے والے حاکم اور طاقتور اپنے حکم اور طاقت کی تسکین کہاں حاصل کریں گے۔ اس لیے ان بے کسوں اور زیر باروں کا جینا بہت ضروری ہے۔

بڑی بی بی جی نے جھاڑ پونچھ والی غلیظ دھجی اس کی سمت اچھال کر جیسے اس کی سزا میں کمی کر دی تھی۔

اب اس کے اندر منجمد ہو چکے سارے آنسو یکبارگی پگھل کر سیلاب بن گئے۔ بتیسی پر اکڑا ہوا جبڑا ڈھیلا پڑ گیا۔ بدن پر کھڑے رونگھٹے پسینے میں تھرانے لگے۔ خون کی دھاریاں شلوار کے پائنچے سے بہنے لگیں۔

وہ اپنے پلنگ پر الٹی پڑی جتنے آنسو بہا چکی تھی وہ اُن میں ڈوب کر مر سکتی تھی لیکن مری نہیں۔ احساسِ جرم کی شدت سے دل بند ہو سکتا تھا۔ ہوا نہیں، خوف اور غم کی شدت سے دماغ پھٹ سکتا تھا پھٹا نہیں۔ اس نے کل سے کچھ نہ کھایا تھا۔ تیتر بٹیر کے بھنے سالن والی اکلوتی روٹی سوکھ گئی تھی، چائے بھی نہ پی تھی انہی جرائم کی تو سزا بھگت رہی تھی۔ نہ کھاتی نہ آج نچڑ رہی ہوتی۔ بڑی بی بی جی کی دی ہوئی دھجی دو گھنٹے میں ہی نچڑنے لگی۔ اب دوسری دھجی کہاں سے آئے۔

اگر کہیں سے پرانا کپڑا اُٹھا بھی لے تو صفائی والی ابھی شور مچا دے گی۔ کل تو یہاں رکھا تھا اُٹھایا کس نے۔ وہ پرائمری سکول سے واپسی پر پورے رستے ان دھجیوں کی بہتات دیکھا کرتی تھی، خصوصاً بارشوں کے بعد زمین میں دبی ہوئی دھجیاں آدھے آدھے سر باہر نکال کر اپنے وجود کی اہمیت کی گواہی دے رہی ہوتیں، جیسے ہر سو کھمبیوں کی فصل زمین پر اگ آئی ہو۔

کاش وہ کسی طرح باہر نکل سکتی اور ساری دھجیاں اکٹھا کر لاتی۔ دنیا کی اہم ترین اور قیمتی ترین چیز یہ دھجیاں تھیں۔ کوئی جن پری آ کر اس کے سرہانے رکھ جاتی۔ لیکن وہ تو گنہگار ہے گنہگار کو سزا ملتی ہے انعام نہیں۔ جن، پریاں، بزرگ تو نیکو کاروں کو نوازتے ہیں۔ وہ تو

بدکار ہے۔

وہ تین روز بھوکی پیاسی اندر پڑی رہی۔ کھانا پہنچانے والی نوکرانی گھٹی گھٹی ہنسی میں پوچھ لیتی۔

''کھانا نہیں کھایا چھوٹی بی بی جی۔''

جیسے اُس کے گناہ کی نوعیت سے آگاہ ہو۔

اُسے کسی نوکرانی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن وہ پھر بھی حکم عدولی کر لیتیں اور چپکے سے پوچھ لیتیں۔

''کوئی چیز تو نہیں چاہیے۔''

کیا وہ کہہ سکتی تھی۔

''گندا کپڑا چاہیے۔''

یقیناً وہ کہیں نہ کہیں سے دستیاب کر دیتی۔ چاہے گھر سے لا دیتی، وہ کتنی دلیر اور آزاد تھیں۔ جو بنا کسی شرم یا خوف اُن سب معمولات کا ذکر کرتی تھیں۔ جو دھجیاں حاصل کر سکتی تھیں۔ وہ کتنی امیر اور آزاد تھیں۔ کوئی دیکھ بھی لے تو اُنھیں پروا نہ تھی۔ وہ اس جرم پر بھی ٹھٹھے لگاتی تھیں۔

اُسے لگتا اس کا جسم ہی نہیں ہاتھ بھی خون سے لتھڑے ہیں اب وہ کتنا دھوئے لیکن یہ نشان کبھی نہ چھٹیں گے احساسِ جرم سے وہ مزید سکڑنے لگی۔

چار روز کمرے میں بند رہنے کے بعد جب وہ برآمدے میں آ کر بیٹھی تو ایسے کہ کسی سنگین جرم کی سزا بھگت کر جیل خانے سے نکلی ہے۔ لیکن جس طرح کوئی مجرم اپنے کیے کی سزا بھگتنے کے باوجود بھی جرم سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ کتنی سزا بھگت لے جرم کبھی ساقط نہیں ہوتا۔ وہ مرتا بھی ہے تو قاتل یا ڈاکو کی حیثیت سے ہی مرتا ہے۔ خود چاہے مر جائے لیکن جرم پھر بھی زندہ رہتا ہے۔ آنے والی نسلیں بھی اُسی کی شناخت سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔

فلاں کا پوتا جس نے فلاں کو قتل کیا تھا اور پھانسی چڑھا تھا۔ فلاں کا نواسہ جس نے فلاں جگہ غبن کیا تھا اور جیل بھگتی تھی۔ یہ جرم بھی اس کے وجود کا حصہ بن گیا تھا۔

وہ خود کو ڈھانپتی لپیٹتی چھپاتی رہتی پورا مہینہ نمازیں پڑھ پڑھ دن رات نجات کی دعائیں کرتی لیکن قبولیت کبھی نہ ہوتی۔

اب اسے سمجھ تو آ گئی تھی کہ یہ مصیبت سبھی کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ حتیٰ کہ اس نے بڑی بی بی جی کو بھی نہیں چھوڑا لیکن ان کے لیے یہ کسی مشکل کا باعث نہ بنتی تھی۔ وہ اس کا ذکر بنا کسی احساسِ گناہ یا خجالت کے کر سکتی تھیں جہاں سے چاہیں پرانی چھوڑ نئی لیریں بھی اُٹھا سکتی تھیں۔

پھر یہ نوکرانیاں کتنی قابلِ رشک تھیں۔ آزاد تتلیاں ڈال ڈال منڈلاتیں۔ پرانی لیروں کے خزانے کو کس آسانی سے حاصل کر سکتی تھیں۔

ایک وہ کہ اگر کہیں کوئی پرانی دھجی چرا بھی لیتی اسی وقت ڈھونڈیا پڑ جاتی جیسے عجائب گھر سے بدھا کی مورتی گم ہو گئی ہو اور اگر فوری بازیاب نہ ہوئی تو ملکوں کی بنیادیں ہل جائیں گی اور وہ خوف سے لرزتی پھرتی کہ کہیں جرم کا کھرا اُس تک نہ پہنچ جائے۔

آخر اُس نے ایک راہ ڈھونڈ نکالی۔

لیٹرین والے کھولے میں کسی پرانی تعمیر سے اُتری بے کار پڑی کھڑکیاں دروازے شہتیر بالوں کا ڈھیر مدتوں سے لگا تھا جن کی کھوؤں اور درزوں میں بڑی بی بی جی اپنی استعمال شدہ دھجیاں ٹھونس دیتی تھیں۔

بارشوں، آندھیوں، دھوپوں سے دھل دھل کر سفید پڑ چکی لکڑی کی درزوں میں دیمک نے گھر بنا لیے تھے۔ جس کی بھر بھری مٹی میں نامعلوم ریشے اور کیڑے حرکت کرتے تھے۔

بالکل ایسے ہی جیسے صنوبر کے وجود میں خوف کے ریشے پل پل لرزتے تھے۔ رنگ

اُڑی کھڑکیوں اور دروازوں کے چوکھاٹوں اور پٹوں میں بے شمار قسموں کے حشرات پلتے تھے۔ جو تاریکی سیلن اور پاخانے کی غلاظتوں میں خوب پھل پھول رہے تھے۔ وہ بچپن سے ان کا مشاہدہ گھنٹوں کیا کرتی تھی۔ اس کی دلچسپی کا یہ واحد ایسا سامان تھا جس پر کوئی قدغن نہ لگائی جاسکتی تھی کیونکہ کسی ایک کی موجودگی میں کوئی دوسرا کھولے میں داخل نہ ہوتا تھا۔

شہتریوں اور بالوں، چھت کے پھٹوں میں یہ حشرات الارض اپنی کھوئیں بنا چکے تھے۔ اور بے خوف وخطر اپنی اولادیں پال رہے تھے۔ یہ اَن گنت قسموں کے کیڑے مکوڑوں کا مطالعہ صنوبر کی ابتدائی درس گاہ تھی۔ جس میں فطرت اپنے جوبن پر ہوتی تھی۔ ان میں ٹھونسی ہوئی کسی بوسیدہ دھجی کے لمبوترے سے پیڈ کو باہر کھینچتی تو اس کے ساتھ باریک باریک کیڑوں، لاروؤں کی قطاریں رینگتیں۔ دیمک اور سفید سفید ریشوں سے کیڑوں کی مٹھیاں بھر بھر نیچے گرتیں۔ اس کے پیروں پر حشرات الارض سرسراتے، ٹانگوں پر چڑھ جاتے کپڑوں میں گھس جاتے۔

یہ واردات وہ رات کے اندھیرے میں ڈالتی کہ کوئی آ بھی جائے تو تاریکی میں کچھ دیکھ نہ سکے۔ دن کی روشنی میں انہی حشرات الارض کے مشاہدے کے دوران اس نے سیاہ کبڑی ٹانگوں والے بچھو اور بل کھاتے سنپولیے بھی دیکھے تھے۔ یہیں اُس نے کلائی کلائی بھر چھپکلیاں بھی مشاہدہ کی تھیں۔ لکڑیوں کے اسی برسوں پرانے خاک کا ڈھیر ہو چکے کاٹھ کباڑ میں گڈوئے، چھاچوہے اور خوبصورت جلد والے سانپ بھی ملاحظہ کیے تھے اور سوچا تھا اس گند میں رہتے ہوئے بھی یہ شفاف روشن اور خوبصورت کیوں ہیں۔ اسی ڈھیر میں سے مغرب کی اذان کے ساتھ ہی سیکڑوں چمگادڑوں کو اڑانیں بھرتے دیکھا تھا جو پورے صحن کو ڈھانپ لیتی تھیں اور اندھیرے سے پہلے ہی صحن میں رات پڑ جاتی تھی۔ اتنی نیچی پروازیں کہ لگتا ابھی کانوں میں گھس جائیں گی۔ ان کے لمبے لمبے پروں کی سائیں سائیں خوف کے

پروں کی سنسناہٹ بن جاتی۔

لیکن رات کے اس تاریک پہر میں استعمال شدہ برسوں پرانی مٹی ہو چکی ان ٹاکیوں کو باہر کھینچتے اسے کبھی خوف نہ آیا تھا۔ لاروؤں اور مٹی بھری یہ غلیظ ٹاکیاں وہ جھاڑ کر اپنی جاہنکوں میں پھنسا لیتی۔ اس کے پاس اپنے کپڑوں اور بستروں کو بچانے کا دوسرا کوئی راستہ نہ تھا اور اگر وہ بھر جاتے تو ولّی، کھوتی، بے عقلی، بے حیا کے شرمناک طعنے.....

اور پھر وہ اضافی گر جانے والی تمام دھجیاں اپنی اپنی جگہ پر اپنی پہلی شکل میں درست بھی کر دیتی کہ شک نہ پڑے کہ یہاں کوئی چوری کی واردات ہوئی ہے اور کھرا اس تک نہ پہنچے۔ ہاتھوں کو بازوؤں کو نرم نرم جلد والے حشرات الارض چھوتے، غلیظ دھجیاں کباڑ کے اندر ٹھونستے ہوئے اس کے ہاتھ لرز جاتے اور کبھی پورا ڈھیر نیچے آن گرتا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے انھیں سمیٹتی اور پھر ٹھونستی اور خوف سے لرزتی کہ کہیں موقع واردات سے پکڑی نہ جائے۔ شاید پکڑے جانے کا شدید خوف ہی ان حشرات الارض اور اندھیرے کے خوف کو پچھاڑ دیتا تھا۔ جب بھی اس واردات کا موقع آتا تو راتیں کالی ہوتیں۔ شاید پُرشباب چاند کی تاریخوں میں فطرت بھی کوئی داغ لگانا پسند نہ کرتی تھی۔

ہر مہینے جس طور یہ قیامت اس پر ٹوٹتی تھی اسی طور بڑی بی بی جی کی نفرت بھی بڑھتی چلی جاتی تھی۔ مر جانے کی دعائیں کرتے کرتے وہ تنگ آ گئی تھی۔ یہ خدا بھی بڑی بی بی جی جیسا ہی کوئی تھا۔ مغرور، جابر، خود پرست۔ اس کا تو کبھی کوئی راز نہ رکھا۔ کتنا روئے ہاتھ جوڑ جوڑ معافیاں مانگے، سجدے میں گڑگڑائے کبھی اس کا دل نہ پسیجا۔ بالکل بڑی بی بی جی کی طرح کٹھور دل والا خدا بھی اسے ملا تھا۔

جس کے پاس اختیار ہوتا ہے وہ ایسے ہی گھمنڈی اور خود پسند ہو جاتا ہے۔ اپنے ماحول اور افراد کو زیر تسلط رکھنے کے لیے، انھیں محتاج، محکوم اور بے بس رکھنے کو سزائیں دینے، حکم صادر کرنے، خود کو اعلیٰ و ارفع دوسروں کو کمتر، ذلیل کرنے کے لیے خود کو عقل کل

دوسروں کو احمق ثابت کرنے کے لیے حکم صادر کرتا اور سزائیں دیتا ہے۔ دو ہی ہتھیار ہیں اس کے پاس حکم اور سزا۔

جہاں جس سطح تک ان کا بس چل سکتا ہے۔ اپنے زیر تسلط افراد کو وہ جینے کا حق بس اس قدر دیتے ہیں کہ ان کا دماغ حکم اور سزا کے خوف سے کبھی خالی نہ رہے۔ چاہے بڑی بی بی جی حویلی میں موجود ان چند نوکرانیوں اور صنوبر کو اسی محکومیت ذلالت، خوف اور بھوک کی حالت میں زندہ رکھیں کہ رب کائنات پوری دنیا پر اس نظام کو نافذ کر دے۔ بس وہی ہوتا ہے جو حکم والا چاہتا ہے۔ وہ اس ذرا سی لاروا سی صنوبر کی کیوں سنتا وہ تو کل کائنات کا رب ہے۔ کل جہانوں کا خدا ہے۔ اسے تو کل دنیا کا نظام چلانا ہے۔ اس کا دل اتنا کمزور تھوڑی ہوتا ہے کہ اس ذرا سی صنوبر کی تکلیف پر تڑپ اُٹھے۔ وہ تو اتنے بندوں کو نجانے کیسے کیسے آلام و مصائب کوڑھ بیماریوں میں مبتلا کرتا اور شاید آسمانوں پر بیٹھا سیٹی بجاتا رہتا ہے۔ کمزور دل ہوتا تو بیٹھ نہ جاتا دل۔

▪▪▪▪

ادھیارے پر لی ہوئی کوئی بھیڑ بکری بکتی تو اندھی بھاگاں چناں کی انگلی پکڑ کر بڑی بی بی جی کے پاس اپنا حصہ لینے آتی۔ برآمدے کی سب سے نچلی سیڑھی پر کالی دھوتی سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ جاتی۔

بڑی بی بی جی پوچھتیں۔

''محتاج پیسے لوگی کہ اناج۔''

نہ بی بی میں انی موری پیسے کہاں سنبھال رکھوں۔

نہ گنتی نہ حساب، میں محتاج یہ نادان۔

''جو بنتے ہیں بی بی! سودا اُٹھوا دو۔''

آٹے کا بورا، گڑ کا گٹو، چاولوں کی پنج سیری، ادھیارے کی بھیڑ بکری کے پورا سال دو سال پالنے کا عوضانہ مل جاتا ادھیارے کے جانور پالنے والا حقِ خدمت ہی وصول کرتا ہے یعنی جانور کا مالک اُسے کم عمری میں جتنی قیمت پر خریدتا ہے وہ قیمت پہلے الگ کر لی جاتی ہے اور باقی ماندہ رقم کو آدھا آدھا دو حصوں میں بانٹ لیا جاتا ہے۔ یعنی جانور کا مالک پالنے والے کو اصل قیمتِ خرید نکال کر باقی میں سے آدھا حصہ ادا کرتا ہے۔ شاید اسی لیے اسے ادھیارا کہا جاتا ہے۔

بھاگاں محتاج کی روٹی اسی میں سے نکلتی تھی۔ جس ریوڑ کو چنی دن بھر آثاروں کے قدیمی درختوں میں چراتی رہتی تھی اور دھتکاریں کھاتی تھی۔ وہ سارا ریوڑ ادھیارے پر تھا۔

جب کبھی مہینے دو مہینے میں ادھیارے والی بکری فروخت ہوتی یا کسی بکری یا بھیڑ کی چوری بیماری یا موت کی افسوسناک خبر سنائی ہوتی تو محتاج بھاگاں چنی کی انگلی کو تو ہنی بنا چلی آتی۔

بڑی بی بی جی حساب کتاب میں یا پھر بکری بھیڑ کی بیماری موت چوری کی واردات کی تفصیلات سننے میں اس قدر گم ہو جاتیں کہ معلوم ہی نہ پڑتا کہ یہ ذرا سی بیر کی گٹک چنی تمام حفاظتی حصار توڑ کر کب صنوبر بی بی کے کمرے میں جا گھسی ہے۔

"نکی بی بی جی! جس طرح تو یہاں محلوں میں رہتی ہے نا میں بھی وہاں پرانے محلوں میں رہتی ہوں۔ یہ بڑی بڑی اینٹوں والے محل، منڈی، بازار، سر ڈھکی ہوئی نالیاں، بڑی خلقت دیکھنے آتی ہے۔"

حیرت اور اشتیاق سے صنوبر کی پتلیاں ساکن ہو جاتیں زبان کھولنے کی تو عادت بنی ہی نہ تھی وہ حسرت سے نڈھال ہو جاتی کاش وہ چنی ہوتی۔

"پر ان محلوں کی چھتیں نہیں ہیں گر گئی ہیں لیکن بنیادیں ہیں میں اور میری بکریاں

وہیں رہتی ہیں اُنہی بنا چھت والے کوٹھوں میں کوئی خلقت آتی ہے اُنھیں دیکھنے کے لیے۔ تیرے جیسی خوبصورت لڑکیاں اورلڑکے بے انت۔ وہاں بالی بھی ہوتی ہے، پتا ہے سارا دن کوکے کولے پیتی ہے اور کیک بسکٹ کھاتی ہے۔ اسے کھلانے والے بہت ہیں۔ وہ کنجری ہے نا، اس لیے سب اس کی بہت عزت کرتے ہیں وہ کسی سے ڈرتی بھی نہیں الٹا اسی سے ڈرتے ہیں سارے۔ تیرے جیسی سوہنی ہے۔ تو اگر کنجری بن جائے نا تیری بھی بڑی عزت ہو....'' صنوبر کے گھٹنوں کی پشت والا گڑھا پسینے سے بھر گیا۔

چنی نے دروازے کی طرف دیکھا اور سرگوشی کے لیے کالے لٹکے ہونٹ گولائی میں لا کر اس کی تپتی ہوئی لال انگارہ کانوں کی لوؤں سے چھوا دیے۔

''وہ نکی بنیان بھی پہنتی ہے سلمے ستارے والی۔

تو نے تو دیکھی بھی نہیں ہوگی کسی دن چوری سے لا کر دکھاؤں گی تجھے۔'' پسینہ صوبر کی آنکھوں کے حلقوں سے بھی بہہ نکلا۔ اس کا حلق اتنا خشک ہو گیا کہ تالو میں خراشیں پڑنے لگ گئیں۔ اگر وہ بول سکتی تو کانپتی ہوئی آواز میں چیختی۔

جا دفع ہو جا یہاں سے، گندی باتیں کرتی ہے۔ گندی سوچ گندے خیال، صنوبر کو لگا اب ضرور ہی کوئی انتہائی قابلِ شرم تبدیلی اس کے وجود میں رونما ہو جائے گی۔ اب تو اس کے بدن سے کوئی ایسا کوڑھ پھوٹ پڑے گا کوئی ایسی غلاظت مل جائے گی کہ اُس پر نوکرانیاں بھی کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔ ان گندی باتوں کا علم بڑی بی بی جی کو تو ضرور ہی ہو جائے گا اور پھر اُس کے بدن سے جو پھوٹ نکلے گا وہ چنی کی انہی گندی باتوں کا نتیجہ ہوگا۔

وہ چنی کو کمرے سے باہر کیسے نکالے۔ اسے تو بولنے کی عادت ہی نہیں پڑی تھی لیکن چنی کی باہر ڈھنڈیا پڑ گئی تھی۔

محتاج بھاگاں نے آوازیں دیں۔

''نی چنی! نی اپنے ساتھ مجھ انی بوری کو مروائے گی روزی کا بہانہ بھی چھڑوائے گی۔

ری کم ذات! کدھر دفع ہوئی تو،'' نوکرانیاں مجرم کے پیچھے دگڑ دگڑ اندر گھسیں اور اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئیں۔

صنوبر کا حلق نوکیلی سولوں سے چھد گیا تھا۔ اس کا روم روم التجائیں کرتا تھا میں نے نہیں بلایا اسے میں نے کچھ نہیں سنا۔ لیکن وہ چنی سے ایسے ہی متاثر ہو جاتی تھی۔ جیسے بڑی بی بی جی کو اپنے سے اعلیٰ وارفع، عقل و دانش میں برتر خوبصورت اور بڑھیا تصور کرتی تھی۔ اور خود کو جس قدر بے وقوف گدھی بدصورت غلیظ اور نا قابلِ قبول سمجھتی تھی۔ خود اپنی نظروں میں ہی قابلِ نفریں اور گنہگار لیکن چنی کہتی تھی تو سوھنی ہے بالکل بالی جیسی۔ بالی جو کنجری ہے۔ صنوبر کے جسم کے ہر ہر خلیے کا دم گھٹنے لگتا۔ یہ بے حیا لفظ سننے کے بعد تو کچھ ایسا وجود پر نکل آئے گا جو صرف کنجریوں کے نکلتا ہوگا۔ اب وہ کیا کرے گی۔

صنوبر کتنی لاعلم کتنی محروم اور یہ میلی کچیلی بو کی مٹھی چنی کتنے علموں مشاہدوں اور خبروں کی مالک تھی۔ گورے جس کی تصویریں بناتے اور اپنی یادداشتوں میں اس کا نام لکھتے تھے یورپ کے اخباروں میں اس کے فوٹو چھپتے تھے اور گائیڈ اپنے علم کی روشنی میں ثابت کرتے تھے کہ یہ وہ چہرہ ہے جو پانچ ہزار برس قبل انہی نین نقشوں کے ساتھ اس دنیا کی پہلی مہذب بستی کا چہرہ تھا۔

یہ چناں کس قدر قابلِ رشک تھی جو لڑکوں کی طرح اپنے ریوڑ کے ساتھ دن بھر آثاروں میں گھومتی۔ جن آثاروں کو دیکھنے کی حسرت صنوبر کی عمر جتنی طویل تھی اور اس کی ناتمام حسرتوں جتنی شدید۔ جو چنی جانتی ہے صنوبر عمر بھر نہ جان پائے گی۔ جو وہ دیکھتی ہے وہ عمر بھر نہ دیکھ پائے گی۔ اس کی سیانف اور علم کے سامنے صنوبر تو بالکل کوری جھجھری تھی اور وہ جاگ لگی چاٹی۔ جس میں مکھن لسی دودھ سب جمع تھا۔

■■■■

آریا

ایک روز اچانک نئی کھدائی والے نشیبی حصوں میں جھلتے جھکڑ پاگل ہو کر باہم منہ سر
ٹکرانے لگے۔ جیسے ابلتے کڑاہے میں بھاپ چکراتی ہو، کھنڈرات پر چڑھا۔ کچی دھول کا
موجزن سمندر جھکڑوں کے گرداب میں ہلکورے کھاتا، دھول اٹے درخت ٹیلے ٹبے، آثار
مورتیاں، پہرے دار سب ہزاروں برس کہنگی میں دفن بوسیدہ اور پرانے، لیکن ہڑپا کی
منڈی کے آثاروں پر بندوق تانے کھڑا یہ پہرے دار بالکل نیا تھا اور نوگزے کے مزار
سے نکلتی ہوحق کی صدائیں جھکڑوں پر سوار اُس کے گرداگرد دھمالیں ڈالنے لگی تھیں۔ اوکاں
کے گھنے بالوں والے درخت دائیں بائیں جٹائیں گھمانے لگے۔ تیز رو جھکڑوں کے مستانہ
وار جھولے نوگزے کے مجاوروں کے ساتھ مِل کر جھوم رہے تھے۔ بچے ٹُنبے ٹیلے ٹبے جیسے
ہر شے کو بوٹی چڑھی ہو۔ چناں نشہ بھری فضاؤں میں بہکنے لگی۔ اُس کا بالشت بھر وجود
آدھوں آدھ ان ٹیلوں میں کہیں اُتر گیا اور سرزمین انگور سے پھوٹے وجود کو دھمال چڑھ گئی۔

چناں کو لگا نئے پہرے دار کے ہاتھ میں بندوق نہیں ہے بلکہ وہ مرلی ہے جو شوکیس

میں بند کسی جوگی کے لبوں سے لگی ہے جس کی لے پر چناں ناگن سی لہرانے لگی ہے۔ اُس کے ہاتھوں میں اوکاں کی ٹہنی کا مورچھل سا آ گیا تھا اور دِل کے سادہ ورق پر اِک شبیہ بنتی چلی گئی۔ مرلی بجاتے ہوئے کسی کرشنا، کی لنگوٹ کسے بھوبھل رمائے کسی بھکشو کی، نروان کی تلاش میں نکلتے سدھارتھ کی جیسے عجائب گھر کی الماریوں میں سے نکل کر یہ ساری مورتیاں اُس کے گرد آسن جما بیٹھی ہوں۔ اُس کا جی چاہا اُس کے پاس بھی اُس گوری لمبی لڑکی جیسا کاغذ برش ہوتا جو اپنے ساتھی کو سامنے بیٹھا کر اُس کی شبیہیں کھینچتی ہے تو وہ بھی اس کرشن کو اس رام کو سدھارتھ کو کہیں ہمیشہ کے لیے نقش کر دیتی۔ اس کے ہاتھ میں تو بکریاں ہانکنے والا سانگل تھا جو پتے اور کونپلیں توڑتا تھا اور جانور ہانکتا تھا۔ جنگلی جھاڑیوں کے چوڑے پتوں پر، تہہ بہ تہہ اُترتے کھنڈروں کے پرت پر، زمین و آسمان میں کھولتے گرد کے طوفانوں پر کہیں چھپ کر اِک مورت سی بنا لیتی اور پھر عمر بھر اُس کو سجاتی سنوارتی رہتی لیکن ریوڑ کی صحبت میں آٹھوں پہر رہنے والی اس چرواہی کو ازحد نازک اور نفیس انسانی جذبات نے یکدم پچھاڑ دیا۔ اس کا جی چاہا وہ مووی کیمرے والے سے کہے بس ایک فوٹو اس نئے پہرے دار کا اُتار دو۔ جسے وہ اپنی قمیص کے اندر سینے کے ساتھ چپکا رکھے گی۔ معاً اُسے خیال آیا کہ اُس کا کھلا ڈھلا چولا تصویر کو اپنی حفاظت میں رکھنے سے قاصر ہے۔ اُسے بالی کی کھونٹی پہ لہراتی تجوری جیسے خانوں والی بنیان کی اہمیت شدت سے محسوس ہوئی پھر اُس کا جی چاہا وہ چائے پان والے لڑکے سے کہے کہ وہ جو ایوانِ خاص والے ٹیلے پہ نیلے گھوڑے پر سوار سنگینوں سے لیس اُونچا لمبا گورا چٹا تیکھے نقوش والا کھڑا ہے اُسے چائے، پان، مٹھائی، بوتل جو کچھ تیرے پاس ہے سب دے آ میرے پاس ادائی تو نہیں ہے لیکن بل کے بدلے میں مجھے پھر قتل کر ڈالنا، جب وہ کچھ بھی نہ کر سکی تو اوکاں کی برش نما ٹہنی توڑ کر دھول بھرے سینے والی زمین پر کچھ لکیریں کھینچنے لگی۔ ویسی ہی شبیہیں جیسے عجائب گھر کی الماریوں میں مقید تھیں۔ مرلی بجاتا کرشنا، یدھ کو تیار ارجن اپسراؤں کا رقص دیکھتا راجہ اِندر اور آلتی پالتی

مارے بیٹھا گوتما، پھر اُسے یہ ساری تصویریں نامکمل معلوم ہوئیں۔ برش جیسی تاروں بھری اوکاں کی ٹہنی پھیر پھیر سب مٹا دیا۔ اُسے لگا یہ نہ کرشنا ہے نہ رام نہ اِندر نہ گوتما یہ تو آریا ہے جس نے ساری مورتیوں، ظروفوں، مٹکوں، چرخوں، کنوؤں، باولیوں، محل ماڑیوں اور اس دھرتی کے سینے پر موجود ہر شے ہر ذی نفس کو روند ڈالا ہے۔ وہ تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اُڑتی دھول کے کڑاہے میں لوٹنے اور تڑپنے لگی۔ جیسے اُس گھڑسوار نے اپنی سنگینوں سے اُس کی بوٹی بوٹی چھید ڈالی ہو اور تلوار کی دھار میں پرو کر اُسے فضا میں اُچھال دیا ہو لیکن پہرے دار کی بندوق کا رُخ تو چھت کی جانب تھا اور عجائب گھر کے اندر ایک گوری کے پیچھے چلا جا رہا تھا۔

گوری شوکیسوں پر لکھی تحریر پڑھتی نئے گارڈ سے کچھ سوال کرتی اپنی کاپی پر لکھتی اور اگلے شوکیس کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ چناں گوری کے چھوڑے ہوئے شوکیس میں بند مورتیوں کو دیکھنے لگی چناں نے اُنھیں بیسیوں بار پہلے بھی دیکھا تھا لیکن پہلی بار اُسے احساس ہوا کہ وہ تو سب ننگی ہیں۔

"ہائے ربا! یہ سب بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بنا ہی دیا تھا تو پھر پٹولے تو سی دیتے ان گڈیوں کے لیے۔"

ننگے ستر والی یہ مورتیں کس بے حیائی سے تن کر نئے پہرے دار کے مقابل کھڑی تھیں۔ چناں عمر میں پہلی بار شرم کے احساس سے آشنا ہوئی جیسے تیز جھکڑوں نے اُس کے اپنے تن کے کپڑے اُڑا دیے ہیں اور وہ خود نئے پہرے دار کے سامنے الف برہنہ کھڑی ہے وہ تیسرے چوتھے شوکیس سے ہی پسپا ہو کر باہر کھنڈروں میں بھاگی، اوکاں اورون کے چھتناروں تلے اُس کی بکریاں موجود نہ تھیں۔ شاید وہ بھی اُس کی طرح سیر ہو کر کہیں کو نکل گئی تھیں یا پھر پہرے داروں نے ٹیلوں کے قدموں میں آثاروں سے نیچے بچھے کھیتوں میں انھیں ہانک دیا تھا۔ جن بینچوں پر وہ کھر جما کر شاخیں چونڈتی تھیں وہاں اب کسی پھنسی

مورتیاں مرلی والوں سے ہم آغوش تھیں یہ مناظر ان چھتناروں کے لیے نئے نہ تھے لیکن آج چناں کی گہری سانولی رنگت لال مٹی سے گھڑی ہڑپا کی بھٹی میں پکی مورتیوں کے ہم رنگ ہو گئی۔ وہ کھدائی شدہ ٹیلوں کے نشیبوں میں بے تحاشا بھاگی ان کھدے ٹیلوں پہ چڑھی ڈھلانوں پہ پھیلے چھتناروں میں گھسی ہر جگہ کوئی مرمریں رادھا کسی لنگوٹ گسے کرشن کی مرلی پر کتھک ناچتی تھی۔ پکی پٹڑی پر بھاگتے بھاگتے حدت اور پسینہ سے اُس کا وجود نچڑنے لگا آثاروں کے پہلو میں بچھے کھیتوں کو سیراب کرتے کھال میں کودی۔ گاڑھی نیلی اوڑھنی پرے اُچھال کر پھینکی اسے اپنا عکس اس مورتی جیسا لگا جو کھدائی کے دوران شاید زخمی ہو گئی تھی، جس کے دونوں پستان سامنے سے ٹوٹ کر ہموار ہو گئے تھے جس کی ناک کی پھنک اور ہونٹوں کی قوس جھڑ گئی تھی۔ اُس نے تیکھی تیکھی رادھاؤں کو حاسدانہ انداز سے دیکھا اور دھول کی مٹھیاں بھر بھر سر پر ڈالنے لگی گرد کا غبار اُس کے گرد تن گیا۔ اسی شام ریوڑ باڑے میں تاڑنے سے بھی پہلے بالی کی تار پہ لہراتی تیکھی تیکھی بنیان اُس نے شلوار کے انگوچھے میں اُڑس لی تھی۔

ہڑپا کے کھنڈرات میں سے نکلی چوڑی چوڑی عنابی اینٹوں سے اسارے اپنے کوٹھے کے سامنے سے گزرتے کھال کے گاڑھے گلابی پانیوں میں اپنی شبیہ پھر دیکھی۔ لال مٹی سے بنی بیٹھے بیٹھے بھدے خدوخال والی مورتی کے عکس میں سفید سنگِ مرمر سے ترشی تیکھے خطوط والی مورتیاں جھلملا گئیں جن کے پیٹ کی پلیٹ میں چیرویں آنکھ دھری ہے۔ جن کے نیم وا ہونٹوں میں کپاسی کلی کھلی ہے۔ جن کے مرمریں پستان تانبے کی گاگریں سی چوٹیاں چڑھے ہیں۔ چناں کو عمر میں پہلی بار سنگِ مرمر کی ان سفید مورتیوں جیسا خوبصورت دِکھنے کی چاہ نے پچھاڑ دیا۔

اپنی جلد رنگے کھال کے پانی میں انگوٹھے اور شہادت کی اُنگلی سے نتھنے بند کر کے وہ ڈبکی لگا گئی مٹی کی مورتیوں کے ہم رنگ بدن کو چکنی مٹی کا ڈھیلا مَل مَل رگڑ ڈالا۔ بالی جو

اپنے نام سے زیادہ بنیان والی پکاری جاتی تھی اور ہر بنیان والی کھنڈرات پر چڑھی اس بستی میں کنجری کہلاتی تھی۔ کیونکہ وہ روزانہ گت کھول کے کنگھا کرتی ہڑپا کے آثاروں سے چرائے دیے میں کپڑے کی وات ساڑ کر کاجل چھنگیا سے آنکھوں میں لگاتی چقندر کھا کر منہ پونچھنا بھول جاتی۔ اسی لیے اُس کی کوٹھری میں کرخت چہرہ پہرے داروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، جب چناں اُس کی کوٹھری سے نکلی تو چھتناروں میں بھرے ہم آغوشوں تک آوازے پہنچے ''کنجری کنجری؟'' یہ بھک منگے اور چرواہے نقروں اور قہقہوں کے لٹھ لیے اُسے عجائب گھر کی عمارت میں دھکیل آئے، جہاں نیا گارڈ کسی گورے کو شوکیسوں میں سجی مورتیوں کی تاریخ بتا رہا تھا۔ سفید سنگِ مرمر سے ترشی تیکھے نقوش والی نفیس دیویوں کی نسبت گورے کی ساری توجہ ان لال لال بھٹی کی پکی ہوئی مٹے مٹے نقوش والی ان گھڑت اور بھدی بھدی مورتیوں پر تھی۔ اس کے خیال کے مطابق ہڑپا کی ابتدائی کاریگری کے نقوش یہی تھے۔

گورے نے پھر وہی سوال دُہرایا ''کیا پرانی دراوڑ اور کول نسل کے لوگ اب بھی یہاں بستے ہیں۔''

''یس سر یس سر! یہ یہ دیکھیے۔''

نئے پہرے دار نے اُسے بوٹ کی نوک سے دھکیل کر گورے کے حضور حاضر کر دیا۔ یہ دیکھیے سر! بالکل یہی قد یہی ناک نقشہ انہی مورتیوں کی ہم شکل.... یہی تو وارث ہیں اس مرحوم تہذیب کے....'' گورے نے اپنے کیمرے کی روشنیاں کئی زاویوں سے اس پر ڈالیں۔ وہ گیلری کے بیچوں بیچ دھرے مردے دفنانے والے بڑے بڑے مٹکوں کی اوٹ میں چھپ گئی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں گورا اُسے اُچک نہ لے جائے۔

جب گورا نئے گارڈ کی مٹھی میں لال نوٹ پھنسا کر چلا گیا تو وہ وقفے کے لیے سیٹیاں بجانے اور لوگوں کو عجائب گھر کی عمارت سے باہر نکالنے لگا۔ بتیاں بند ہوتے ہی وہ اُس

شوکیس کے پیچھے سے نکلی جس میں پانچ ہزار سالہ پرانا انسانی ڈھانچہ سبز مخمل کے کپڑے پہ لیٹا ہوا ہے۔ جسے پہرے دار دراوڑ نسل کی عورت بتاتے ہیں۔

''تو نے مجھے ان جیسا کیوں کہا۔''

گارڈ ہنسا۔

''تو سرخی اور کاجل لگا کر ان جیسی تو نہیں ہو گئی نا۔''

نئے گارڈ نے تیکھے خطوط والی ہندو دیویوں کی مورتیوں کی سمت اشارہ کیا''تو تو ان جیسی ہی ہے نا، یہاں تو ایسی ہی ہوتی تھیں۔''

چھوٹی چھوٹی لال مٹی کی ننگے ستر والی بھدی مورتیوں کے شوکیس پر نئے پہرے دار نے بندوق کی نالی جما دی۔

''کیوں اُن جیسی کیوں نہیں۔''

چناں نے اوڑھنی کا پلو کھول کر یوں بکل ماری جیسے اُوڑھنی ڈھیلی پڑ گئی ہو۔ اس ایک لمحے میں اُس کی کل سورج ڈھلے والی چوری کھلکھلا کر ہنسی۔

گارڈ نے بھی یہ چوری بھانپ لی۔

''ہاں یہ تو ہے لیکن باقی سب تو نہیں نا۔ یہ قد بت یہ نین نقش، یہ گوری رنگت، اری کملی! بات تو مٹی کی تاثیر کی ہے، جو جس مٹی سے گھڑے گا وہ اسی مٹی کے جیسا ہی تو ہو گا نا۔ یہ تو سنگِ مرمر کی چٹانوں سے گھڑی ہیں یہاں گندم اور کپاس کے کھیتوں میں ایسے سفید پتھر کہاں یہاں کے جلتے اُبلتے موسم تو جنگلی کیکروں کی سولیں، آک، کوڑتمے، چیڑ، کوال گندل تھور، کنڈیاریاں سینچتے ہیں۔ بے بارش سوکھے کنڈوں والی دریائی مٹی سے تو ایسی بھدی بھدی گھڑتیں ہی گھڑی جائیں گی نا.....''

چناں کو انہی گارڈوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ انہی جسمانی کوتاہیوں کی وجہ سے اس کھنڈر شہر کے باسیوں کو آریاؤں نے اپنا غلام بنا لیا تھا۔ وہ کپاس اور اناج اُگانے والے،

مٹی کی مورتیاں اور ظروف گھڑنے والے محل ماڑیاں بازار چوبارے اسارنے والے، بیل گائیں پالنے والے گھوڑوں کی ٹاپوں اور تیر تلواروں کا شکار ہو گئے کیسا گھمسان کا رن پڑا ہو گا۔ یہ ہنرمند بستیوں کی ترتیب و تنظیم کرتے رہے۔ تہذیب اور تمدن نکھارتے رہے۔ فن اور فن پارے تخلیق کرتے رہے، نہ تیر بنائے نہ بھالے، نہ نیزے گھڑے نہ تلواریں نہ گھوڑے پالے نہ ہاتھی، بیلوں سے ہل جوتے، بچھی سے تانیاں تنیں۔ بھول گئے کہ ان سب کی حفاظت کے لیے جنگل کی سمت کھلنے والے رستوں پر مضبوط قلعے اسارنا اور منجنیقیں گاڑنا بھی ضروری تھا۔ کیونکہ درندے لطافتِ طبع اور حسنِ ذوق نہیں رکھتے وہ تو فنکارانہ تنظیم و ترتیب کا جواب محض اپنے وحشی کھروں اور ٹاپوں سے دیتے ہیں۔

چناں نے باہر جھانکا۔ اس کھنڈر شہر میں بڑی چہل پہل تھی۔ منڈی کے چبوتروں پر خربوزوں، تربوزوں کی پنڈیں دھری تھیں۔ کپاس کی گانٹھیں، گندم کے ڈھیر لگے تھے۔ پیاز، لہسن، بیر، چبڑ، شہتوت، پیلوں ڈھیریاں جمی تھیں۔ آڑھتی اور گاہک بھاؤ تاؤ کرتے چھابڑی والے توری بینگن کے آوازے لگاتے پھرتے، دھوتی نما ساڑھیوں والیاں گھونگھٹ کاڑھے چھاجوں میں اناج بھرے بدلے میں پھل ترکاری وٹاتی تھیں۔

راوی کنارے ناریاں چکنی مٹی کی کوری جھجھریاں بھرتی تھیں۔ بوکے ڈال ڈال گھڑے اور مٹکے سروں اور کولہوں پر چوٹیاں چڑھاتیں جن کی کلائیوں میں آوی کی پکی چوڑیاں بھری تھیں۔ ساگ کے کنے چولہوں پر اُبلتے تھے۔ دھات کے جوڑوں اور مالاؤں والی مالکائیں ہاتھی دانت کے سنگاردان سامنے کھولے لمبے سیاہ بالوں میں لکڑی کے دندانوں والے کنگھوں سے مینڈھیاں گوندھتی تھیں۔ کنیزیں اُن کے پیر دابتیں اور جھانویں سے ایڑیاں رگڑتی تھیں۔ کمہار چاق پر چڑھے کوزے ساخت کرتے۔ بت تراش مورتیاں گھڑتے۔ پھولوں سے رنگ کشید کر نقش و نگار بناتے راج مزدور چوبارے اور محل اُسارتے من چلے مرلیاں بجاتے کہ اچانک جنگل کا در کھلا، اُونچے اُونچے برق رفتار گھوڑوں پر

تلوار زن نیزے سنگینیں کسے حملہ آور ہوئے اس فن نگری کو ہتھیاروں کی نوک میں پرو ڈالا، بازاروں کی چہل پہل کو گھوڑوں تلے روند ڈالا۔

بھیانکر طوفان اُٹھے، لہو رنگ دھول زمین و آسمان کو لپیٹ گئی۔ گھڑ سواروں کے لشکر، نیزوں، بھالوں اور سنگینوں کے ساتھ چپے چپے پر ٹوٹ پڑے۔ پھولوں سے کشید کیے رنگوں سے مورتیاں رنگنے والے پھولوں کی مہکاریں ہاتھوں میں بسائے اپنی مورتیوں پر اوندھا گئے جن کے سینے کے آر پار تلوار کی دھار سرخ گلاب کے پھولوں جیسی شوخ رنگ تھی۔ چاک پر چکنی مٹی چڑھائے ظروف گھڑتے کوزہ گر، تانیوں پر سوت کی اٹیاں لپیٹے کپڑا ساز، کپاس اور اناج بھرے کھیتوں میں ہل چلاتے کسان عمارتوں کے حیرت انگیز ڈیزائن اور بالا خانے تعمیر کرتے راج مزدور سارے مناظر لہولہو تھے۔ راوی کا لال پانی کٹی دھنکی بوٹیاں اور انسانی گوشت کے پارچے نگلتا سارے بند توڑ گیا تھا۔ اکاں اور کیکروں کی ٹہنیوں پر پناہ لینے والوں کے سینوں میں تیروں کی انی لہو ٹپکاتی تھی۔ باؤلی سے بو کے بھرتی ناریاں مال سے لٹک گئیں۔ کنوؤں کا لہولہو پانی کناروں کناروں اُچھلتا زمین دوز نالیوں کو بھرتا تھا۔ عمارتیں لرزاں تھیں۔ جناتی گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ہر سو ترخ تاراج اور انہدام تھا۔ بچ رہے تھے شہر کے کھنڈرات، مورتیاں، ظروف اور غلام جن کے نقوش چناں کے ہم شکل تھے۔

چناں نے اس ساری تباہی پر نگاہ کی تو اُسے لگا وہ بھی کسی تیر کی انی کسی تلوار کی دھار دِل میں کھائے باؤلی کی مینڈھ پر تڑپ رہی ہے اور یہ جو نیا گارڈ عجائب گھر کی الماریوں پر بڑے بڑے تالے لگا رہا ہے۔ تو یہ دراصل وہی آ رہا ہے ظالم قاتل خونی۔

”چل اب باہر نکل۔“

پہرے دار نے عجائب گھر کی آخری روشنی بھی گل کر دی۔

کوئی زبردستی ہے کیا تو بھی آ رہا ہے جو مجھے کچل ڈالے گا؟

شوکیسوں کے ساتھ ساتھ گھسڑتی فرش پر پھسکرا مار بیٹھی۔

''آریا ہی تو ہوں ان مورتیوں کھنڈروں کا آریا تجھ جیسے راکشسوں سے انھیں بچانے پر مامور۔ چل نکل زہر میں بجھے ہیں یہ شیشے کہیں مرگئی تو میرے گلے پڑے گی اور۔''

''تو تجھے کیا تو تو آریا ہے، مارنا کاٹنا پیٹنا تو تیرا کام ہے۔''

مردہ اشیا کی ٹھنڈک عجائب گھر کی گیلریوں میں رینگ رہی تھی۔ جیسے چھت سے فرش تک کافور چڑھا ہو جس میں گڑھی ہوئی مردہ اشیا بھی کپکپانے لگی ہوں۔

چناں اُسی شوکیس سے ٹیک لگا کر ٹھنڈے فرش پر پھسر گئی، جیسے کافور کی خنکی میں برف کی قاش بن گئی ہو۔ نیم تاریک گیلریوں کی اُونچی دیواروں میں گھومنے والے گول پنکھے اندر کی ساری گرمی اور حبس باہر پھینک رہے تھے۔ اندر ہر شے کو کپکپاہٹ چڑھ رہی تھی شیشوں کے پیچھے بند مردہ اشیا میں بھی اِک خفی سی لرزش تھی۔ پہرے دار نے اپنے ڈنڈے کی ٹوہ اُس کے کولہوں میں کھبوئی۔

''چل نکل باہر ورنہ اسی مورتی کے سنگ بند کردوں گا الماری میں، دونوں بہنیں اکٹھی رہیں گی۔''

پہرے دار کی کھلکھلاہٹ دونوں گیلریوں کی کشادہ چھت سے ٹکرا کر بازگشت شوکیسوں میں گونجتی رہی۔

باہر ہاڑ جیٹھ ٹیلوں ٹبوں پر چڑھ بیٹھا تھا۔ کھنڈروں میں اُترتی اور ٹیلوں پہ چڑھتی دھوپ تمازت دھول کے اُبلتے سمندروں میں ہونکتی تھی۔ پسینے چھوڑتی حبس چھتناروں میں دم گھونٹتی تھی۔ اس کی بکریاں وقفے کے دوران آثاروں میں پھلانگ گئی تھیں اور چوڑی اینٹوں والی ڈھی بنیادوں پر چہل قدمی کر رہی تھیں جن کے کھروں سے بھربھری اینٹوں کا سفوف اُڑتا اور ذرّات جھڑتے تھے۔ شکستہ بنیادوں کی منڈیریں نرم مٹی کے سینے میں مزید دھنس رہی تھیں۔ اس شکست و ریخت سے بے خبر کینٹین کے سامنے بچھی چارپائیوں پر بیٹھے

گارڈ چائے پیتے اور بڑ کے سائے تلے سستاتے تھے اور بالی سے چُہلیں کرتے تھے اور بالی جوتوں اور جملوں کے نشانے کس کس کر اُنھیں نہال کر رہی تھی۔ اس وقت پورا ہڑپا بھی تاراج ہو جاتا تو بھی اُنھیں خبر نہ ہو پاتی۔

پورے کھنڈرات پر چناں اور اُس کی بکریوں کا راج تھا وہ نازک اور قیمتی آثاروں پر ریوڑ کے ہمراہ بھاگتی پھلانگتی انھیں گراتی ڈھاتی چلی گئی۔ وقفے کے خاتمے پر گارڈوں نے دیوانہ وار سیٹیاں بجائیں، بکریاں تو اپنی گستاخی پر خود ہی مجرم کی طرح نوگزے کے مزار سے متصل ٹیلوں سے نیچے لڑھک گئیں لیکن بخارات چھوڑتی صدیوں پرانی دھول لپیٹے چناں سہج سہج چلتی رہی جیسے اُنھی کھنڈروں کے اندر سے کہیں پھوٹ نکلی ہو۔

ہر چھتنار تلے جوڑے مل بیٹھے تھے۔ چونچیں لڑاتے، کبوتروں کے جوڑے، پھدک پھدک ناچتے چڑیوں کے جوڑے، مساموں سے پھوٹتی محبت کے سیلاب میں غوطائے نوجوانوں کے جوڑے، کھنڈروں سے اُچھلتی دھول اور تمازت کی طرح ہر شے کے بھیتر ملن کی شدت، دہکتی ہوئی دھرتی سے اُٹھتے بخارات کی طرح کھول رہی تھی۔ چاقو کی نوک سے چھال اُترے تنے پر ناموں کا جوڑا کندہ کرتی لڑکی سے چناں نے کہا۔

"میرا ناں بھی یہاں لکھ دے۔"

"تیرے ساتھ دوسرا نام کس کا لکھوں جس نے تجھے سارا ہی پایاب کر لیا ہے۔"

چناں نے اپنے منحنی سے وجود کو چادر کی بکل میں سختی سے لپیٹا۔

"آریا۔"

"آریا" بازگشت کھنڈروں، ڈھنڈاروں میں اُبھرتی ڈوبتی رہی۔

چناں نے اُنگلی کا موقلم ایوانِ خاص پر بندوق تانے کھڑے نئے پہرے دار کی سمت لہرایا۔

لڑکی اور اُس کا دوست ایک ساتھ کھلکھلائے۔

''تیری پسند تو اچھی ہے لیکن کیا وہ بھی تجھے پسند کرتا ہے۔''

چناں کی حیرت آثاروں کے استفہام پر ٹنگی رہ گئی اس سے کیا کہ وہ کسے پسند کرتا ہے وہ خود تو اُس کی پسند ہے نا۔

''اری تو پوچھ نا کہ تو اُسے اچھی بھی لگتی ہے کہ نہیں۔''

کھلکھلاہٹ کی ٹاپوں سے چھٹتے دھول کے طوفان محل، ایوان، منڈی بازار سب ڈھک گئے تھے۔

وہ کسی کالج کی ڈھیر سی لڑکیوں میں گھرا اُنھیں کھنڈرات کی تاریخ بتا رہا تھا۔ چناں ریوڑ کے ہمراہ لوہا پگھلانے والی بھٹی اور منڈی والے آثاروں سے اُوپر چڑھی اور بکریوں کو اوکاں کے اُس پیڑ کی سمت ہانکا، جس کے سائے میں وہ آریا لڑکیوں کو اس کھنڈر شہر کی تاریخ سمجھا رہا تھا۔ لڑکیاں چیخیں مارماریوں اِدھر اُدھر لڑھکیں جیسے آریاؤں کے کسی مسلح جتھے نے اچانک حملہ کر دیا ہو۔ نازک نازک کانچ سی شہری لڑکیوں کی تیز دھار چیخوں میں چناں کے وحشی قہقہے گتھ گئے۔ زناٹے دار تھپڑ کے ساتھ اُس کی چری ہوئی باچھوں میں دانت پیوست ہو گئے۔

''چل نیچے بھتنی! ان ماؤں کو لے کر کھنڈروں سے باہر نکل جا۔''

وہ چھپا کا مار کر اوکاں کے تنے کے گرد گھومتے بینچ پر چڑھی اور آریا کی گردن میں نوکیلے دانت دھنسا دیے۔

جب تک نئے پہرے دار نے چٹلے سے پکڑ کر اُسے کھائی میں اُچھالا اُس وقت تک اُس کی گردن پر وہ تین زخم پرو چکی تھی اور خون زبان کی چتکبری نوک سے چاٹ رہی تھی۔

پہرے دار کی گردن پر دانتوں کے نیلے نیلے نشانوں میں سے لال لال لہو رِستا تھا، جن میں چناں کا لعاب اور آنسو دونوں گھلے تھے۔ وہ ٹیلے کی ڈھلان سے لڑھکتی نشیب میں بہتے کھیتوں کو سیراب کرتے پانی کے کھال میں اوندھائی۔ پانی کی سطح پر جلتی ہوئی کئی زبانیں

دھری تھیں۔ پورے وجود پر انگارے سے سرسر بجھے جلد جل کر چرمرا گئی۔ سیخ پہ چڑھا ننگا گوشت بھن گیا۔ سیکڑوں فٹ اُوپر ٹیلے پر لڑکیوں کا گروہ نئے پہرے دار کے گرد پھر جمع ہو گیا تھا۔ چناں نے اپنے ہاتھ بازو دیوانہ وار کاٹے کہ کھارے پانی پر لہو کی دھاری سی چل نکلی، جس میں سورج کی چمک نے نیلاہٹ بھر دی تھی جیسے لال نیلے سوجن بھرے زخم۔

اُوپر آثاروں کی ہر اینٹ، ہر درخت، ہر ٹیلے، ہر کھنڈر، پر ایک ہی نام کی تختی لٹکتی تھی۔

''آریا۔''

تصویریں بناتی لڑکی کے کینوس پر، دستاویزی فلم بناتے کیمرے کے لینز میں، فیچر لکھتی لڑکی کے قلم سے ایک ہی تصویر بنتی تھی۔ ''آریا'' سیاحوں اور کالج کی لڑکیوں کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلتا تھا ''آریا۔''

کیکروں اور اوکاں کے دف پر بجتے ایک ہی لفظ کی جھنکار پانی بھرے کھال میں جلترنگ پیدا کرتی تھی اور چناں کے بدن کے ہر ہر تار سے آ کر ٹکراتی تھی۔

آریا آریا۔

▪▪▪▪

اوکاں، جنڈ، بکائن کے چھتناروں کے گرد بل کھاتے بینچوں پر آج نہ کوئی مرلی والا بیٹھا تھا نہ ہی کوئی رادھا کتھک ناچتی تھی۔ آج سارے کھنڈر ویران پڑے تھے کیونکہ سورج سبھی پردے پھاڑ کر ننگے منہ سر نیچے اُتر آیا تھا اور ہڑپا کے ڈھنڈاروں کی پکی دھول کو بدن کے کڑاہے میں بھر کر چار پہر سے بھون رہا تھا۔

گرم لوس چھوڑتی ہوا کے تھپیڑے، دھول کی چنگاریاں اُڑا اُڑا کر ٹیلوں ٹبوں، درختوں، عمارتوں کھیتوں کے منہ سر بھسم کر رہے تھے۔ جھلسے ہوئے درخت، بھٹی میں پکی اینٹوں سے خاکستری ٹیلے۔ زرد چہرہ کھیت راجباہوں اور نہر کے بھاپیں مارتے پانی اور تانبا

بی زمین کی مٹی بھن بھن کر پکے روڑوں میں تبدیل ہو چکی تھی جنھیں عورتیں جمع کر کے دن بھر چباتی رہتیں۔ بھٹی سے بھنوانے کی تو ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ سورج میں بھسم ہوئے بوجھے، کنڈیاریاں سروٹے بروٹے آک کنیر فرشِ زمین سے چھٹتی بھاپ میں دھندلائے ہوئے۔

اس وقت سورج کے پھٹے ہوئے حلق سے اگلے جہنم زاروں میں کوئی انسان یا حیوان کھڑا نہ رہ سکتا تھا۔ درختوں کے سائے تلے بیٹھی عورتیں کمر تک قمیصیں اُٹھائے ایک دوسری کے بدن پر پھوٹ پڑے گرمی دانوں کو ناخنوں سے پٹک پٹک پھوڑتی تھیں۔ جلد گرمی دانوں سے لتھڑی بتھڑی، پیپ بھرے سفید تلوں سی ذرا ذرا چھانٹ ان کے نیچے بچھی خشک ہو چکے دانوں کے نشانات کی کئی تہیں جو خارش کرنے سے زخم بن چکی تھیں۔ عورتیں قطار بنائے ایک دوسری کے بدبودار بالوں سے جوئیں اور لیکھیں چن چن کر ناخنوں پر پٹک پٹک مارتیں۔ بیٹھے ہوئے سیاہ لکیروں والے زرد ناخن کیونکہ یہ سبھی پکے روڑ اور گاچنی چبانے کی عادی تھیں۔ خصوصاً حمل کے پورے دورانیے میں باچھوں کے کنارے چکنی مٹی سے پکے رہتے تھے۔ اور زرد ہونٹوں پر مٹی کی پپڑی جمی ہوتی اور نومولود سر کے پشم پر مٹی کی تہہ لیپ کر پیدا ہوتے۔ ننگ دھڑنگ دس گیارہ برس تک کے بچے جن کے سروں پر پھنسیوں اور پھوڑوں کی تہیں چڑھی رہتیں۔ ماؤں کے قریب روں روں کرتے، چانٹے کھاتے، تھنوں والا اور کوکھ والا ماں کے پسینے غلاظت اور بدبو میں سنا رہتا۔ بہتے کھال کے کنارے گھنے جھنڈ تلے مویشیوں کے ہمراہ گاؤں کی نسائی آبادی کڑی دوپہریں گزارتی کہ ان چھتناروں سے جو باہر نکلا جل بھن گیا۔

لیکن وہ آریا کھنڈر منڈی میں ان آتش فشانی برہنہ آسمانوں تلے تن کے کھڑا رہتا تھا۔ بوٹوں کے نیلے گھوڑے پر سوار سنگین تانے کوئی حملے روکنے کو کہ کہیں حملہ آور ہونے کو ہر پل تیار۔ جس کے وجود سے پوری منڈی چہک مہک رہی تھی۔ ترکاری والے تروتازہ ہری کچر توریاں، ککڑیاں، ٹینڈے کدو کے آوازے لگا رہے تھے۔ منڈی کے درمیانی تھڑے

پر گہنیوں، باجرے کے ڈھیر لگے تھے۔ بغل میں لہسن پیاز کھکھڑیاں، چبڑ، تربوزوں کی ڈھیریاں جمی تھیں۔ ساتھ لسوڑیاں، گولہیں، کھار اور کوڑتموں کے ٹوکرے بھرے رکھے تھے۔ کھڈی سے اُترے لال، نیلے، کالے پیلے رنگوں کے بوچھنوں سے سر ڈھانپے ملوک ناریاں اشیا کا اشیا سے تبادلہ کرتی تھیں۔ دونوں بازو آوی میں پکے چوڑوں سے بھرے تھے۔ گلوں میں آوی کی پکی ہنسلیاں اور اسی مٹی کے سوختہ موتیوں والے کانوں میں جھولتے گول بالے سروں پر دھرے بوجھ تلے قدم یوں نپے تلے پڑتے جیسے بوجھ کا اخراج پیروں میں کتھک کے بھاؤ بناتا ہو اور بازو کی کمان سر پر رکھے بوجھ کو سنبھالتے کسی یوگا کے آسن میں ہوں۔ شاید یہ رقص اور ورزش کے ہندوستانی طریقے انھی مشقتوں کی حرکات کی نقل ہیں۔ جو کبھی ہڑپائی تہذیب میں مروج تھے۔ اور خود چنی شہتوت کی تیلیوں سے بنی ٹوکری پشت پر لگائے گیندے کے پھول چنتی تھی۔ کئی مالنیں اور بھی تھیں جو موتیے اور چنبے کے ہار پروتی تھیں اور مالائیں گوندھتی تھیں۔ گہرے نیلے رنگ کی دھوتیاں اور لال رنگی اوڑھنیوں میں سے سانولے بدن عنابی بھا مارتے تھے۔ یہ رنگ گندم کی بالیوں اور راوی کے پانیوں کی آمیزش تھی۔ یہ سارے ہار پھول بس ایک ہی دیوتا کے چرنوں میں چڑھانے بچھانے کو ساری مالنیں کشٹ کر رہی تھیں۔

چنی کو بے تحاشا حسد محسوس ہوا۔ صرف وہ اپنی مالا اُس کے گلے میں ڈالے گی دوسریوں کی مالائیں توڑ پھینکے گی۔ اُنھیں اپنے ریوڑ کے کھروں تلے کچلتی ہوئی وہ جلتی بلتی دھول کے دوزخ میں اُتر گئی۔ اُن مالنوں پر حملہ آور ہونے کو جو اُس وقت منڈی والے آثاروں میں بھری تھیں۔ وہ سب کو روندتی پچھاڑتی اُس کے سر پر جا پہنچی۔

”تو آ رہا ہے۔!“

”اری کون آ رہا۔“

”وہی جس نے ہڑپا کی یہ بستی اُجاڑ دی تھی اور مجھ جیسی ساری چنیوں کو اپنی داسیاں بنا

لیا تھا یا پھر مار دیا تھا۔'' نئے پہرے دار نے قہقہہ لگایا۔ گرم لو بھرے جھونکوں کے تپتے بدن ٹھنڈے ٹھار ہو گئے۔ ہوا میں اُڑتی گرم دھول کے چھینٹے جہاں پڑتے وہاں چھالے چھوڑ جاتے تھے لیکن اس قہقہے میں لپٹ کر شبنمی قطروں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ داہنے چبوترے پر بچوں کے کھلونے کھنکنے لگے۔ بیل گاڑیاں رواں ہو گئیں۔ آوی کے پکے جھنجھنوں میں بیر کی گٹھلیاں کھن کھن بجنے لگیں اور کالے سیاہ صحت مند بچے کلکاریاں مارنے لگے۔

''ساری چنیاں میں نے مار دی تھیں تو پھر تو کیسے جیتی رہ گئی۔'' آریا کی موٹی وردی میں پسینہ جذب ہو رہا تھا اور گوری رنگت دھنکائی تھی۔ ''میں تو اُن کی راکھ سے پیدا ہوئی۔ تو اب بھی مار دے گا۔ تو پھر پیدا ہو جاؤں گی۔ جیسے یہ کنیر بھکڑا یہ بیل گائے بھیڑ بکری۔ گھڑے رکابیاں، گھوگھوگھوڑے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اسی طرح میں بھی بار بار پیدا ہوتی رہتی ہوں۔ تو چاہے جتنی بار مرضی مار دے گا میں پھر جی جاؤں گی۔ کیونکہ میں اسی مٹی سے جنمی ہوں مجھے اللہ سائیں تیری طرح آسمانوں سے نہیں اُتارتا۔ ہم تو گہنیوں، کپاس کی طرح مٹی سے اُگتے ہیں اور مٹی میں مِل جاتے ہیں پھر سے اگنے کے لیے۔ جب تک مٹی ہے۔ جنمتے رہیں گے۔''

''اری ہڑپا کے جنڈ بکائنوں کی چمگادڑ۔ یہ بس کہانی ہے۔'' یہاں کوئی آریا نہیں آیا۔ کوئی تباہی نہیں آئی۔ جب ہاکڑا سوکھ گیا تو تیرے لگتے لانے یہاں آ گئے۔ یہاں راوی رخ بدل گیا تو ادھر گنگا جمنا کو نکل گئے۔ پر تو یہیں رہ گئی۔ نہیں مارا تمہارے آباؤ اجداد کو کسی نے۔ آپ ہی مرے ہیں۔ باری باری، اگر اکٹھے مارے گئے ہوتے نا تو یہاں بے شمار ہڈیاں کھوپڑیاں اکٹھی ملتیں۔ اگر مارا بھی ہے تو مارنے والے کہیں اور نکل گئے۔ میں نہ آریا ہوں نہ ہی تجھے مار رہا ہوں۔ جا اپنے ریوڑ کو سائے میں لے جا مر جائے گا۔ دھوپ میں پگھل کر۔''

چناں چھکا مار کر جنڈ کے گھنیرے پیڑ کے گرد گھومتے بینچ پر دھول لتھڑے ننگے پیر جما کر اُس کی گردن سے جھول گئی۔ جیسے جنڈ کی شاخوں سے الٹی چمگادڑ لٹکتی ہو اور پرانے بوڑھ

کی شاخوں کے سروں سے جڑیں کبھی الگ نہ ہونے کے لیے جھولتی ہوں۔

پہرے دار ہش ہش کرتا چمگادڑ کو نوچ نوچ بدن سے اُتارتا لیکن چمگادڑ ایک بار چپک جائے تو آسانی سے اُترتی تھوڑی ہے۔

کہا جاتا تھا کہ چمگادڑ شاذ و نادر ہی کسی انسان سے چپکتی ہے۔ اور جس سے ایک بار چپک کر الگ ہوتی ہے تو وہ خاص ہو جاتا ہے۔ اس کا کرتا خارش کے علاج کی غرض سے دور دور سے لوگ مانگنے آتے ہیں۔ چمگادڑ ایک بار جس سے چپک جائے تو تاعمر اپنے اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ بیسیوں بار دھلنے کے باوجود کرتا شفائی تاثیر نہیں چھوڑ پاتا۔ تو کیا یہ خان نیازی بھی اس کے اثرات سے عمر بھر نجات نہ پا سکے گا۔

لیکن وہ تو مضبوط چوبی تلوؤں پر کئی چھلانگیں لگا کر امرا کی رہائش گاہوں والے ٹیلے پر پھلانگ چکا تھا۔

خون چوسنے والی چمگادڑ بڑے بڑے پر جھنکارتی پھر سے جھپٹی۔

کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑی ہے۔ چھپکلی، چامچڑک، کسی کالے کنویں میں الٹی لٹک جا۔

جونک، جلم کسی گائے بھینس سے چپک جا۔

وہ اُسے نوچ نوچ پھینکتا ہوا اب عجائب گھر کی عمارت کے اندر جا رہا تھا۔ جہاں جاپانیوں کے کسی گروپ کو ہڑپا کی تاریخ اُسے سنانا تھی۔ جب چناں عمارت کے اندر داخل ہونے لگی تو ٹکٹ چیکر نے اُسے روک لیا۔ پہلے تو اُسے کبھی نہ روکا گیا تھا وہ تو جیسے اسی عجائب خانے کا کوئی انٹیک تھی جسے دکھا دکھا کر گوروں سے پیسے بٹورے جاتے تھے۔

''نہ تو کدھر ٹکٹ دکھا۔''

''کیوں یہ گھر ہے میرا، گھر کے لیے ٹکٹ کیسا؟ نہ میں کوئی کشمیری ہوں کہ بلوچی''

نئے وزٹرز کا ریلا چلا آیا۔ وہ اس بھیڑ میں لپٹ کے اندر گھسنے لگی تو ٹکٹ چیکر نے پیچھے

کھینچا۔ اس نے ہاتھوں پر دانتوں کی قطاریں پرو دیں اور انسانی ریلے میں خلط ملط اپنے چھٹانک بھر وجود کو بغل میں چھپا کر فرش پر رینگ لیا۔ پہرے دار نے مٹھی میں دبوچ کر باہر پٹخی۔

''چل دفع ہو، نری گٹک، سواد ہی نہیں آیا۔'' یہ سارے اُسے آثاروں سے دور دفع کرنے کو اُس کے نازک حصوں سے ہی کیوں اُسے توڑتے مروڑتے، نوچتے، اینٹھتے ہیں۔ پھر شاید اس کی کمزور ہیئت کو مسلنے مروڑنے سے سواد نہیں آتا۔ جو اُس پر گالیوں کے جھانپڑ برسا دیتے ہیں۔ مزا آتا تو بالی کی طرح اُس کی بھی قدر ہوتی۔ کینٹین پر چائے بوتل سے تواضع ہوتی۔ ہر ہر نے ٹٹول پھرول کر چھوڑ دیا تھا۔

لیکن ایک وہ جس کے لمس کے لیے وہ مری جاتی تھی جس سے چمگادڑ کی طرح چپک جاتی تھی جس میں جونک کی طرح دھنس جاتی تھی۔ وہ اپنی کرخت پوروں کے لمس سے بھی اُسے محروم رکھتا اور لاٹھی کی بے حس ٹوہ سے اُسے نوچ نوچ پھینکتا۔ جیسے اچانک راہ میں آ پڑی کسی خاردار جھاڑی کے کانٹوں کو بدن سے اُتارتا ہو۔ حملہ آور ہو جانے والے سانپ بچھو کا سر کچلتا ہو۔ پانی کے گدلے تالاب سے گزرتے دفعتاً پنڈلی سے آن چپکی جونک کو چھڑاتا ہو۔ نیچی پرواز بھرتی بالوں کے گھونسلے میں آن چھپی چمگادڑ کو گردن ہلا ہلا کر اُڑاتا ہو۔ تھوری چنی جسے مفت میں کوئی چرواہا بھی قبول نہ کرتا۔ وہ اس وجیہ آریا سے آن چپکی تھی۔ پتا نہیں اس کے گٹک سے دل میں کتنے ویرانوں اور وحشتوں کی گنجائش آباد تھی۔ آثاروں میں عمر بھر بھٹکتے اُن کی ساری وسعتیں اور وحشتیں اپنے اندر سمو لی تھیں۔ وہ چھلکنے لگی اس آریا کو ڈبونے کے لیے۔ کتنا کلاسیک ہڑپا تھی یہ چنی بھی۔ جن جن دریاؤں کے کنارے اُس کی نسلیں آباد رہیں سبھی اپنی گہرائی اور روانی اس ذرا سے وجود کو منتقل کر کے خود سوکھ گئے اور وہ چھلکنے لگی۔

■■■■

وہ دو گھنٹے ہڑپا کی جھوٹی سچی تاریخ سے جاپانی وفد کو آگاہی فراہم کر کے باہر نکلا تو چنی منڈی والے آثاری کنویں کی منڈیر پر انتظار میں بیٹھی تھی اس کی پانچوں بھیڑیں اُس کے گرد آسن جمائے اُسی کی مانند چپ تھیں۔ جتنا تفکر اُن کی تھوتھنیوں پر تھپا تھا اُتنا ہی چنی کے چہرے پر بھی ملا تھا۔ لوک دانش کا بیشتر سرمایہ یہ دیہاتی انہی ڈھور ڈنگروں کے مرنے جینے درختوں کے سوکھنے پنپنے، فصلوں کے اُگنے سڑنے، دریاؤں بارشوں کے بہنے رکنے سے ہی تو اخذ کرتے ہیں۔ اسی لیے ہر ٹپے، ہر ماہیے کا پہلا مصرعہ فطرت کی عکاسی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً:

کوئی بوٹا راوی دا، کوئی مبھ ترھائی ہوئی اے،
چٹی چنے دی چاننی، نکی کنی نکی اور کنی

پانچوں بھیڑیں جن کی تازہ تازہ اون اُتری تھی۔ جن کی گلابی جلد لاروے سی کچی کچی جھریوں سے بھری تھی۔ وہ اُداس تھوتھنیاں چناں کی کھلری ہوئی انگلیوں والے پنجوں پر رکھے آنکھیں موندے تھیں۔

گیان دھیان کی گھپا میں اُتری جیسے تفکر کرتی ہوں ڈونگھی سوچ میں پڑی کہ یہ چناں کس رستے پر نکل پڑی۔ یہ کھجور کی گٹھلی ذرا سی چنی کس آتش دان میں آن گری ہے۔ اپنے وجود کی راکھ اُڑانے کو کس بھٹی میں کچی مکئی سی بھن رہی ہے اور اب گرم ریت کا ذرہ جہاں پڑتا ہے۔ وہیں لوس چھوڑ جاتا ہے۔ بھیڑیں غنودہ سی لمبی لمبی بے حس تھوتھنیوں میں گڑھی نیم وا آنکھوں سے اپنی خدمت گار کو دیکھتی اور جیسے اُس کی ناقدری پر اُداس ہوتی ہوں اور گہرا غور وخوض کرتی ہوں کہ کیسے بچایا جائے اپنی چرواہی کو۔ لیکن وہ تو اُس رستے پر چل نکلی تھی جس میں بچاؤ والا کوئی موڑ مڑتا ہی نہ تھا۔ جیسے دتو کے رستے میں کوئی موڑ نہ مڑا تھا۔ اُس کی بکریاں آریا کو دیکھتے ہی ''میں میں'' پکارتی ٹیلوں ٹبوں پر بکھر گئیں۔ چناں کا جی چاہتا وہ بھی ''میں میں'' پکارتی بکری سی آریا کے پیچھے لگ جائے اُس کے ننگے پیر ہڑپا کے آثاروں

ہیں عمر بھر گھومتے گھامتے چر گئے تھے۔ پھٹی ہوئی ایڑیاں جن کی دراڑوں میں سولیں چبھتیں تو نوکیں اندر ہی ٹوٹ جاتیں جنھیں کبھی کبھی بالی سوئی کی نوک سے کرید کر نکالنے کی کوشش کرتی تو سخت گوشت میں سوئی کی نوک چبھ نہ پاتی، ٹوٹ جاتی۔

چری ہوئی انگلیوں اور انگوٹھے کی مڑی ہوئی ہڈی والے کہان نما پیر کو یہ بدقماش پہرے دار اپنے بھاری بوٹوں تلے کچلتے۔ لیکن یہ آریا جس کی خصلت ہی چیرنا پھاڑنا ہے کبھی بھولے سے بھی اپنے بوٹ کی ٹوہ کو اُس کے پیر سے چھونے نہ دیتا کبھی تو اُس کا پیر اُس آریا کے بھاری بوٹ تلے کچلا جائے۔ کبھی تو قرب کے درد سے پچھاڑیں کھاتا اُس کا چھٹانک بھر وجود کسی چانٹے سے ہی آسودگی پالے۔ جاپانی وفد چبوتروں والے بازار کے آثاروں میں پہنچ کر رک گیا تھا۔

''سر! یہ بازار تھا جہاں بارٹرنگ (Bartering) ہوتی تھی۔ ادھر سندھ سے لے کر عرب علاقوں اور چائنا تک سے سامان یہاں پہنچتا تھا۔ یہ مرکزی منڈی تھی یہاں سے چھوٹے قصبات کو مال کی ترسیل ہوتی تھی۔ اس علاقہ کا یہ سب سے سولائزڈ اور ایڈوانس شہر تھا۔ بہترین سامانِ تجارت یہاں پہنچتا تھا۔ یہ دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں سے بہترین تہذیب تھی۔''

دنیا کی ہر بہترین تہذیب میں پتا نہیں کیوں اتنی تفریق اور بھید بھاؤ رہا ہے۔ طبقوں میں، انسانوں میں، رہائشی علاقوں میں، مکانوں میں، تعلیم میں، زندگیوں میں، صنف میں اتنا بھید بھاؤ۔ خدا نے جب دنیا خلق کی تو اپنی ذات اور صفات سے تھوڑا تھوڑا حصہ دے کر امام، سردار، پیشوا، بادشاہ بنا دیے اور ہر مذہب، ہر قوم رنگ و نسل، ملک بستی میں یہی نظام رائج کر دیا اور پھر اس قدر تفریق اور امتیاز پیدا کرنے کے بعد حکم لگا دیا۔ مساوات کرو، یا خدا جب تو خود ہی چند افراد کو خدائی خصائص سے نواز دیتا ہے اور باقی کل کو بندگی کی عسرت، عجز اور لاچاری بخش دیتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تیری تقدیر کے سامنے سب

بے بس ہیں۔ تیرے ان چنیدہ بندوں کے سامنے بھی بے بس ہیں۔ جنھیں تو نے ذوق خدائی و کبریائی بخشا ہے۔ جب تو نے فطرتیں ہی خدائی اور بندیائی کی طرز پر بنا کر تماشا گاہ زمیں پر بھیج دیا تو پھر اسے اقتدار، دولت اور طاقت کی رزم گاہ بننے سے روکنے کو کتنے نبی پیغمبر بھیجے تو کیا رک سکا یہ سب۔

روزِ ازل سے جس کائنات کی بنیاد ہی آویزش تصادم اور غیر مساویانہ رویوں پر قائم ہوئی۔ وہ اپنی خصلت نبیوں کے درس اور پرچار سے کیونکر بدل سکتی ہے۔ جبکہ یہ درس اور پرچار بھی خوف اور لالچ کی طنابوں میں جکڑا ہو۔ یہ تہذیب کا ہڑپا اسی بھید بھاؤ کا استعارہ ہے۔

یہ مصر کا ہڑپا ہو کہ
یونان کا
بابل و نینوا کا ہڑپا کہ
چین و ایران کی ترقی یافتہ تہذیبیں

ان کے قلب میں یہی ہڑپا بستا ہے۔ جس کی ترقی کے ثمرات بس محلوں تک محدود رہ جاتے ہیں۔ امرا کی رہائش گاہوں تک، اشرافیہ کی زندگیوں تک۔ ہزار ہا برس سے یہاں کا ہڑپا بدلا ہی نہ تھا۔ یا شاید پچاس لاکھ برس سے یہی ہڑپا قائم ہے جو ترقی کرتا رہا ہے۔ تعمیرات میں، آسائشات میں، جوع الارض میں، جوعِ زر میں چند خاندانوں کی ملکیت کے لیے ترقی جاری رہتی ہے۔ ہر ہڑپا پھلتا پھولتا رہتا ہے۔ ہر ایک اپنے زورِ بازو سے اس میں سے حصہ وصول کرتا ہے۔ یعنی اذنِ ازل سے ہر ایک کو کھلے مواقع ہیں کہ حصہ بقدر حوصلہ، جو جس قدر ہمت چاہتا ہے اُسی قدر اپنا اپنا ہڑپا شاندار بنا لیتا ہے۔

جیسے یہ ہڑپا بڑی تہذیب، ترقی یافتہ تہذیب یعنی امرا کے محلات۔ اُن کی عظیم الشان زندگیاں اُن کے زیورات، قیمتی دھاتیں احکامات جن پر اُن کی اپنی ہی بنائی ہوئی مہریں وہ

خود ہی ثبت کرتے ہیں پھر وہ عوام الناس کے لیے اور اپنے مخالفوں کے لیے حکم نامے بنتے ہیں۔ وہ کسی بھی حکم پکڑ یا سزا سے بالاتر ہو جاتے ہیں۔ جیسے خود خدا بالاتر ہے۔ کیا کوئی سوال کر سکتا ہے امیر کو اتنا ثروت مند غریب کو اتنا مفلس طاقتور کو اتنا عظیم بے بس کو اتنا لاچار کیوں بنایا۔ جب خود ہی ایک نظام نافذ کر کے بندوں کو بہ دست وگریباں دنیا میں چھوڑ دیا تو پھر سوال کیسا۔ پھر یہاں سے شروع ہوتا ہے انتظار کا ایک ناتمام سلسلہ۔ انتظار خدا کے انصاف اور پکڑ کا انتظار۔ دعاؤں اور بددعاؤں کے برآنے کا انتظار۔ مکافاتِ عمل کا انتظار، دیوتاؤں اور خدا کے انصاف کا انتظار یہاں تک کہ ہر تہذیب، اقتدار اور دولت کی ہوس کا ایندھن بن کر راکھ ہو جاتی ہے۔ باقی رہ گئے آثار، کہانیاں اور قصے گھڑنے کو نشانات، ہیولے بنانے کو آثار قدیمہ دماغوں کی تخیلی غذا، اُلٹے پہیوں والی فینٹسی، قصے کہانیوں والی آسودگی، ہڑپا کہ بغداد، دمشق کہ شیراز، بابل کہ ایتھنز، دلی کہ غزنی، بیجنگ کہ کوہ قاف، لندن کہ پیرس، روم کہ واشنگٹن سب کی آثاری تاریخ کا فلسفہ وہی ایک ہڑپا۔ جس کے کردار ہر پھر کر وہی رہتے ہیں۔ وہی چنی، بالی، سنیاری، صنوبر اور پہرے دار مڑ مڑ کے آتے ہیں۔

سر! یہاں کی پیداوار کی مختلف اجناس کے نام آج بھی Same ہیں:

چیڑ Means انشینٹ فروٹ

بیر Means بیریز گولہیں Means ریڈ بیریز

سر! کاٹن، ویٹ، سب سے پہلے یہیں کاشت ہوئیں۔ یہ اس زمین کی ہزاروں برس پرانی اجناس ہیں۔ یہ ساری فصلیں ابھی بھی یہاں اگتی ہیں۔ سر ادھر دیکھیں یہ دیکھیں۔

ٹیلوں کی بغل میں اُترتے کھیتوں میں ہل چلاتے، سہاگے مارتے۔ جھولیاں باندھ بیج کیرتے لنگوٹ کس کر پانی کے بند باندھتے اور کپاس کی فصلوں کی گوڈی کرتے کسان۔ اس نے ٹیلوں کے گرد پھیلے کھیتوں کو اشارے سے دکھایا۔

"سر بالکل یہی لباس یہی انداز کاشت کاری یہی اجناس اور فصلیں ہڑپا کی اس

منہدم بستی میں پانچ ہزار سال قبل بھی یہی آلاتِ کاشتکاری اور طریق کھیتی باڑی مروج تھے۔

سر یہ دیکھیے۔''

منڈی کے چبوترے پر میلی کچیلی دھوتی اور اُوڑھنی میں چھپی پانچ بھیڑوں کے دائرے میں اداس کچیلے چہرے والی چنی کی سمت اُس نے اشارہ کیا۔

''سر بالکل اسی انداز میں اسی شکل وصورت کی عورتیں ان چبوتروں پر بیٹھی ایسی ہی بھیڑوں کے بدلے اناج اور کپڑے بیچتی خریدتی تھیں۔ یہاں ہر طرف چہل پہل ہوتی اور لوگ اسی لباس میں یعنی دھوتی یا ساڑھی میں ملبوس خرید وفروخت کرتے تھے۔ سر عجائب گھر میں جو سٹیچو آپ نے دیکھے اُن میں اور اس چہرے میں فرق نہیں ہے۔ یہ انہی آثاروں کی قدیم مخلوق یعنی نسل ہے۔ سر یہاں کچھ نہیں بدلا۔ قدیم ہڑپائی تہذیب اپنی شکل میں ابھی بھی باقی ہے۔

''نہ تم کہاں کے ہو۔ میں آثاروں کی ہوں تو تم کیا بازاروں کے ہو سوداگر۔''

چنی نے اپنی اداس چہرہ بھیڑوں کے منہ پر ہاتھ پھیرا جیسے اُن کے آنسو پونچھتی ہو اور اُن کی اداسی کا چہرہ صاف کرتی ہو۔

''سر یہی زبان بالکل یہی لفظ جو یہ بول رہی ہے۔ جو لفظ اندر آپ نے مہروں کی صورت ملاحظہ کیے ہیں جو پڑھے نہیں جا رہے ہیں تو وہ دراصل اسی زبان کا پرانا ورژن ہے۔ اب اپنا تلفظ اور صوت کچھ تبدیل کر گیا ہے ورنہ ہے یہی۔''

یہ چرب زبان گائیڈ جو معمولی تعلیم کے باوجود انگریزی بولنے میں حیرت انگیز مہارت رکھتا تھا۔ ہڑپا کی تاریخ کو کسی داستان کی رنگ آمیزی سے بیان کر رہا تھا۔ ایسا متھ جس میں جتنا چاہو آمیز کر دو جیسے سونے میں جتنا کھوٹ ملا دو اُتنا ہی زیور خوبصورت بنتا ہے۔ پانچ ہزار برس پیچھے کا سفر کون کرے اب جو بے شمار جڑ چکا ہے۔ اُس میں مزید جڑنے کی گنجائش

بہت ہے۔ یہی تاریخ اور آثارِ قدیمہ کا سچ ہے۔ ہر تہذیب کا ہڑپا اندازوں اور تخمینوں میں سانس لیتا رہتا ہے۔

چنی نے بھیڑوں کی سیاہ سرمہ لگی آنکھوں سے بہتے لج لجے آنسو اپنی اوڑھنی سے صاف کیے اور پھر اُسی سے اپنی آنکھیں پونچھیں جیسے چنی اور بھیڑیں مل کر سوچتی ہوں۔ ہمیشہ تہذیبیں انہی محلات میں ہی کیوں زندہ رہتی ہیں جن کی چاکری کے لیے اک دنیا جھگیوں، جھونپڑیوں میں بستی ہے۔ چھابڑیوں والے مزدور، چرواہے، کسان ہر تہذیب کو بنانے والے کاریگر۔ جنھیں ریوڑوں کی طرح خدا پیدا کرتا اور مارتا رہتا ہے لیکن نام اُن کے زندہ رہتے ہیں جنھیں خدا اپنے اقتدار، طاقت، تکبر اور دولت میں سے جس قدر چاہتا ہے نوازتا ہے یعنی وہ جو خدائی وجود اور اوصاف کے اک ذرا سے حصے کے مالک بنا دیے جاتے ہیں۔ بس وہی زندہ رہتے ہیں جس طرح خود خدا جیتا ہے۔ یہ آسمانی فلسفہ چناں کی کھوپڑی سے کہیں بڑا تھا کہ یہی سب مل کر کوئی بڑا دیوتا یا خدا تو نہیں بن جاتے۔ وہی مقدر، تقدیر کوئی روحانی سا کچھ.....

■■■■

اُس کے دھیان میں بالی آئی۔ جو کہتی ہے" یہ ہڑپا کو بیچتے ہیں اپنا من مرضی کا بنا کر بیچتے ہیں۔ ہر ہڑپا اس ہاتھی کی طرح ہے جو مرنے کے بعد سوا لاکھ کا ہو جاتا ہے۔ یہ سب آثاروں اور ٹیلوں کے ہاتھی دانت کے بیوپاری ہیں۔ یہ حرامی تجھے بھی بیچتے ہیں۔ تو پھر خود گائیڈ کیوں نہیں بن جاتی۔ جتنی انگریزی انھیں آتی ہے تو بھی سیکھ گئی ہو گی۔ اچھی بھلی گٹ مٹ کر لیتی ہے۔ ہڑپا کی کہانی جو یہ سنا سنا کر نوٹ بٹورتے ہیں تجھے بھی تو یاد ہو گئی ہے نا تو کہا کر۔

"سر میں ہی وہ ہوں جو ہڑپا کی کھڈیوں پر چڑھے سوت کو لال، گاڑھا نیلا اور کالا

رنگتی تھی۔اس باؤلی سے سوختہ مٹی کا مٹکا بھرتی تھی۔ جوز ہر بجھے شیشوں کے پیچھے حنوط ہے اور اب بھی ایسے ہی مٹکے بھرتی ہوں اُن نلکوں سے جو چودھریوں کی حویلیوں میں کنوؤں کی جگہ لگ گئے ہیں۔ ان امیروں کے محلوں کی غلاظتیں میں اُس وقت بھی دھوتی تھی۔ اب بھی دھوتی ہوں۔ اسی لیے تو میری مورتیاں بنی ہیں۔ ہڑپا کی رانیوں کی مورتیاں اتنی کم کیوں ہیں کیونکہ وہ خاص تھیں میں عام تھی جس نے چاہا میری مورتی بنا لی کیونکہ میرا کوئی نام نہ تھا اُن کے اپنے اپنے پورے نام تھے۔ اسی لیے وہ تو اپنی اپنی زندگیاں جی کر مر گئیں لیکن میری جنم کتھا کبھی ختم نہیں ہوتی۔ میں بار بار جنتی رہتی ہوں۔ پھر پھر سے جینے کے لیے مرتی ہوں۔

محلات کوئی کہیں تعمیر ہوئے ہیں اگر کھنڈر بن جائیں تو پھر اُنھیں بچانے والا صرف آثار قدیمہ کا محکمہ رہ جاتا ہے۔ جھگیاں ہر کہیں ہوتی ہیں، اُنھیں آباد رکھنے والی چنیاں اور بالیاں بھی بے شمار۔ ادھیارے کے ریوڑ چرانے کے لیے، پہرے داروں سے ہاتھ پھروانے کے لیے۔ دوسروں کے چھوڑے بھورے چُننے کے لیے۔

کھنڈروں کی سیر کرتے ہوئے کسی نے خالی بوتل اچھال کر پھینکی تھی۔ کتنے چرواہے اور بھک منگے اُس بوتل کے حصول کے لیے، دست وگریباں ہو گئے تھے۔ اس اُمید پر کہ بوتل کے گرنے سے چند قطرے شاید پیندے میں جمع ہو گئے ہوں۔ شاید چپس کے پیکٹ کے کونوں میں کوئی بھورا چورا چپکا رہ گیا ہو۔ پیکٹ پھاڑ کر نوکیلی کالی زبان کی نوک کے ساتھ کچھ نمکین نمکین حلق میں چلا جاتا ہوگا۔ پکوڑوں سموسوں کے اخباری کاغذوں کے ساتھ چپکی چکنائی زبان کے بیٹ سے لگ کر چٹنی کا ذائقہ ہی منہ میں گھل جاتا ہوگا۔

”سر! میں اس وقت بھی یہی سب کرتی تھی۔ چناں یعنی چاند میں ان ٹھنڈاروں کا چاند ہوں کالا بھجنگ چاند۔ ان آثاروں کے چاند ایسے ہی ہوتے تھے سر!۔“

”تو بتایا کر، سر! یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی پانچ ہزار سال انہی طور طریقوں کو بار بار

دہراتے رہنے میں گزر گئے ہیں اور شاید اسی تقسیم اور تفریق کے ساتھ اگلے پانچ ہزار سال بھی انہی طریقوں کو دہراتے ایسے ہی گزر جائیں گے۔''

''تو بتایا کر کہ سر! یہاں جو بستے ہیں نا ان کی ذات، مذہب، قوم، قبیلہ اسی مٹی سے جنما ہے۔ یہ کسی یونان و سپین یا بغداد، ایران یا غزنی سے نہیں آئے۔ اسی لیے مٹی میں مٹی ہیں یہ بغداد، ایران، غزنی سے آنے والے تو وہ پتھر ہیں جو اس مٹی میں کبھی نہیں پگھلتے۔ اسی لیے ان کے نام ان تہذیبوں اور عمارتوں کے چہروں پر سنگِ میل کی طرح کندہ رہتے ہیں جنھیں وہ جس جس تاریخ میں سر کرتے ہیں وہ تاریخ زندہ رہتی ہے۔ حملہ آور اور فاتح زندہ رہتے ہیں۔

لیکن سر! میں اور بالی یہاں ازلوں سے موجود تھیں اور موجود رہیں گی۔ پہرے دار بھی ازل سے موجود تھے۔ لیکن ہماری ذمہ داریاں بدل گئی ہیں اس وقت یہ میرے محتاج تھے۔ پھر انھوں نے بیل اور گائیوں پر قابو پالیا تو مجھے بھی اپنی پہرے داری میں لے لیا۔ لیکن سیکھ میری تھی۔ آج بھی سیکھ میرے پاس ہی ہے۔ میں انھیں پڑھاتی ہوں سکھاتی ہوں وہ میری ہی گود سے سب سیکھتے ہیں۔ گود سے نکلتے ہی سب سے پہلے مجھی پر دھاوا بولتے ہیں۔ اپنے حصار میں لینے کو۔ اپنی مِلک بنانے کو، عجب ملکیت ہوں میں کہ جن کے پاس کسی مِلک کا چپہ بھی نہیں اُن کے پاس بھی میں ضرور ہوں۔ یہ تہذیبیں جن کی بنیاد تفریق ہے ان میں اگر کہیں مساوات ہے تو مجھ پر ہے۔ میں سب میں تقسیم ہوتی ہوں۔ مجھ پر اقتدار حاصل کرنے میں کسی کو محروم نہیں رکھا گیا۔ پہرے دار کسی سے بھی پٹ کر آئے، مجھے آکر پیٹ سکتا ہے۔ وہ کچھ نہ کمائے لیکن مجھ سے کھانا مانگ سکتا ہے، وہ کچھ کرنے کے قابل نہ ہو پر مجھ پر سواری کر سکتا ہے۔''

یہ بالی بھی کتنی سیانی تھی ہر بات کو ہر بندے کو سمجھتی تھی۔ وہ کہتی تھی:

''جب عورت ایک مرد کے ساتھ شرعی اجازت سے رہتی ہے تو اس کی محتاج ہو جاتی

ہے۔ کھانے، پہننے، چھت، بچوں کی اور اُس کے جسم کی محتاج۔ اسی لیے خود کو اس کے مطابق بنانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کے مکان اس کی آمدنی اس کے رشتہ داروں، اُس کی خواہشوں ضرورتوں کے مطابق خود کو ڈھالنے پر مجبور ہے۔ لیکن جب ڈھیڑ سے مردوں کے ساتھ رہتی ہے۔ تو وہ سارے اس کے محتاج ہوتے ہیں۔ وہ اُن پر قابو پا لیتی ہے۔ اُن کی جیب پر اُن کے بدن پر ان کی خواہش پر۔ پھر وہ سبھی خود کو اُس کے مطابق ڈھالنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

تجھے بھی فیصلہ کرنا ہوگا چنی ایک آریا یا بہت سے آریا۔ ایک آریا کی خدمت کرو۔ برتن مانجھو کپڑے دھو کر پہناؤ۔ باہر سے کما کر کھلاؤ۔ گوندھ پکا کر سامنے رکھو۔ پکھیاں جھلو اور پھر لاتیں ٹھڈے کھاؤ۔ ان تھکے ہوئے وجودوں کا غیض وغضب سہو کیونکہ اُن کی عورت اُن کے لیے معمول ہو جاتی ہے۔ لامحدود قربت نامرد کر دیتی ہے۔ اس خوف سے کہ کہیں وہ خواہش نہ کر بیٹھے مارتے پیٹتے اپنا رعب برقرار رکھتے ہیں لیکن یہی مرد دوسری عورت کے پاس جا کر ساہن بن جاتے ہیں یعنی یہ لطف بھی دوسری ہی اٹھا سکتی ہے۔

جب بہت سے آریا خود کو تمہارے مطابق کر لیں گے۔ تو وہ تمھیں کھلائیں گے۔ اپنی کمائی خرچیں گے اور تازہ دم پُر جوش جسم بھی حاضر کریں گے۔ میں جب بوڑھے سکندرے کو چھوڑ کر کرمے منیاری والے کے ساتھ بھاگی تھی۔ تو یہی سوچ کر بھاگی تھی کہ ایک مرد یہ سب دے سکتا ہے مجھے۔ سکندرا بھی دے رہا تھا۔ میرے لگتے لانوں نے مجھے بہت سے مردوں سے بچانے کے لیے ایک مرد کے ساتھ باندھ دیا تھا لیکن اُس بوڑھے وجود کی کراہت سے میں بھاگ نکلی۔ اس کے دانتوں کی ریخوں سے جو سرانڈ اُٹھتی۔ نتھنوں سے پسینے اور لجلجے وجود سے اُلٹی چھٹتی۔ جو چودہ پندرہ سال کی لڑکی کے حوصلے سے کہیں زیادہ بھاری تھی۔ بو کرمے کے پسینے سے بھی چھٹتی تھی۔ لیکن اس کے چڈوں کی طاقت اس بو کا منہ پھیر دیتی تھی۔ سکندرا سب دیتا تھا لیکن اس کے گھٹنوں کا گنٹھیا اس سب کو ہڑپ لیتا تھا۔

ایک مرد کے ساتھ رہنے کی چاہ میں ناموموچی کے ساتھ بھاگی۔ گاموں چدھڑ کے ساتھ، صابو چھچی کے ساتھ اور پتا نہیں کون کون۔ ہر ایک نے پنچائت کی ایک بڑھک کے بدلے مجھے ہار دیا۔ وہ نہائے دھوئے گھوڑا سوار اور میں ہر بار منہ کالا کروا کے گدھے پر بٹھائی گئی۔

راتوں کو کندھ ٹاپ کر منجی پر دھڑک مارنے والے بھی مجھے وٹے روڑے مارنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ سوائے سکندرے کے جو ہر بار مجھے پھر سے بسانے کو پھر سے تیار ہو جاتا۔ وٹے روڑے کھاتی کو پانی پلاتا۔ ننگے پیر ڈھائے والے ٹبے پر منہ کالا کر کے پنچائت چڑھاتی تو یہی سکندر جوتا لے کر پیچھے پیچھے آتا۔ شاید اُس نکاح کی لاج میں جو میں کئی بار توڑ چکی تھی جب بھی کسی کے ساتھ بھاگی نکاح تو ٹوٹ گیا نا لیکن وہ پھر بھی منت ترلے ڈالتا۔ معافیاں مانگتا کہ اُس کا گھر بنا رہے۔ دو ٹائم روٹی پکتی رہے میں رہ جاتی۔

میں چودہ پندرہ برس کی کچی کلی وہ ساٹھ ستر کا دوہتوں پوتوں والا منہ میں دانت نہیں آنکھ میں نور نہیں ساری رات اس کے دکھتے اعضا پر ٹکوریں کرتی جب تنگ آجاتی تو پھر اس پناہ گاہ سے بھاگ نکلتی۔ ایک مرد کی تلاش میں بہت بھاگی ایک کوٹھری کی چھت کے لیے، دو روٹی کے لیے ایک تگڑے مرد کے لیے بہت خوار ہوئی۔ یہ تگڑا مرد بھی نکاح والی کے لیے نہیں ہوتا۔ اس کے بستر پر جاتے ہی اکثر نامرد ہو جاتا ہے۔ لیکن جو پیسے بھر کر ایک بار تھوڑے ٹائم کے لیے ملے اسے دیکھتے ہی ساہن مرد بن جاتا ہے۔ سکندرا جب مرا تو چھت دے کر مرا۔ بس جب چاہا جسے چاہا رکھ لیا جب چاہا نکال پھینکا۔ پہلے بوجھے میں ہاتھ ڈالتی ہوں جو دو چار چھلڑ ہوئے نکال لیتی ہوں۔ نہ ہوئے تو باہر دھکا مار دیتی ہوں۔ شروع میں اُدھار بھی کر لیتی جو حرامی کبھی نہ چکاتے تھے اب پہلے رکھواتی ہوں پھر چوکھٹ پر پیر دھرنے دیتی ہوں۔''

■■■■

سنیاری

لیکن چنی کا باپ تو سب چھوڑ ایک عورت کے ساتھ منہ کالا کر گیا۔لیکن منہ کالا کر کے گدھے پر تو صرف بالی کو ہی بٹھایا جاتا وہ کہیں ادھل گیا لیکن یہ ادھلنے کی سزا صرف بالی کے لیے ہی کیوں۔ وہ بھی تو اپنی بیوی چھوڑ کر کسی کے ساتھ فرار ہوا ہے۔سنیاری پکھی واس کے پیچھے پیچھے ادھر ریاست کو نکل گیا۔سنیاری جو سونے سے گھڑا جھومر تھی جو چاندی کی کھنکتی پازیب تھی۔

وہ جب سر پر چھاج یا بھمبیریوں سے بھرا ٹوکرہ دھرے ایک بازو لمبا اُٹھا کر ٹوکرے کو تھامتی تو قمیص کا چاک اوپر اُٹھ جاتا۔تہہ بند اور چاک کے درمیانی حصے کی لذیذ بوٹی سی مردوں کے منہ میں بھر جاتی جو اس کا ڈکار بھرتے اور ہوکارا سنتے ہی رالیں ٹپکاتے گلیوں میں نکل آتے تھے۔ دکانوں کے تھڑے بھر جاتے تھے۔ ''چھج، بھمبیریاں، بھمبیریاں چھج۔''

جب وہ شہتوت کی لمبی چھمک گھما کر آوارہ کتوں کو بھگاتی تو سیاہ دھوتی سے شیشے سی

جگ مگ بوتلیں پنڈلیاں جھلماتیں جن سے سورج کی شعاعیں ٹکڑا کر دتو مسلی کی آنکھیں چندھیا دیتیں۔

وہ سنیاری نہیں خود سونے کی تویتڑی ہے۔ جو گلے میں پڑتی اور گھونٹ دیتی ہے۔ دتو مسلی کی کیا اوقات تھی۔ ملکوں کی بیٹھک پر کھڑا صنوبر کا چھوٹا بھائی امتیاز یوں منہ کھولے کھڑا رہ جاتا جیسے منہ کے راستے سارا دماغ بھک کر کے کہیں کو نکل گیا ہے اور ساری کی ساری سنیاری اندر بھر گئی ہے۔

گاؤں کی ہر ہٹی پر کان ایک ہی آواز پر لگے رہتے۔ ''چھج بھمبیریاں'' جیسے تومبے کی تان جیسے شرلی کی بڑھک اس ہوکارے کی صدا پر ہر کوئی بھمبیری کے موافق ہوا کی سمت گھومنے لگتا۔ چھاج اور بھمبیریوں کی مانگ ہر ہٹی پر بڑھ گئی تھی۔ اور گاؤں کے ہر بچے کے ہاتھ میں بھمبیریاں گھومنے لگی تھیں۔ جو گڑ کی بھیلی یا پھر مٹھی بھر آٹا یا گیہوں جیب یا جھولی میں بھر کر گھر سے چرا لاتے اور بدلے میں بھمبیری یا گھوگو گھوڑے وٹاتے۔ اس بڑھتی مانگ کو پورا کرنے کے لیے اس نے دتو کو تو جیسے نوکر رکھ لیا تھا بنا تنخواہ کا نوکر جو دن بھر رنگ برنگ چمکیلے کاغذوں کو قینچی سے کاٹ کر پتیاں بناتا۔ سات کترنوں میں سے ایک چھوڑ کر دوہری کرتا اور تینوں کو درمیان میں سے موڑ کر کیکر کا کانٹا پروتا۔ پھر اس پھول کو سرکنڈے کی باریک تیلی میں ٹھونک دیتا جو ہوا کے رخ پر پھڑ پھڑا کر گھومنے لگتیں جیسے اُس کا دل سنیاری کے طواف میں گھومتا تھا۔ سنیاری نے پورے جگ کو بھمبیری بنا دیا تھا۔ اللہ ایسی کوئی ایک عورت ہڑپا میں بھیج دیتا ہے کہ جو جہاں سے گزر جائے تو ہوکے اور آہیں اُس کے پیروں تلے زمین کے تانبے میں دراڑیں ڈال جاتے ہیں۔ بالکل ایسی ہی سنیاری جیسی ہی عجائب گھر کی الماریوں میں ایک دو مورتیاں یوگا کے آسن میں قفل بند ہیں۔ چنی کو لگتا تھا عجائب گھر کی الماریوں میں وہ بھی قفل بند ہے، بالی بھی اور سنیاری بھی لیکن صنوبر بی بی کہیں نہیں ہے بھلا اُس کی شبیہ بنانے کی جرأت کسے ہو سکتی تھی۔

دتو سنیاری کے بچوں کے پیشاب پاخانے سنبھالتا۔ وٹے جوڑ کر کھلے میدان میں چولہا بناتا۔ ایندھن ڈھوتا، سنیاری کے شوہر کو چرس بھرے سگریٹ بنا کے دیتا۔ اس کے نشے کو ہر وقت پورا رکھتا کیونکہ جب کبھی نشہ ٹوٹ جاتا تو پھر سنیاری کو اُس وقت تک وہ پیٹتا رہتا جب تک نشہ دستیاب نہ ہو جاتا۔ اسے ہوش میں آنے سے پہلے ہی دوبارہ بیہوش کر دینا ضروری ہوتا تھا۔ وہ سنیاری کی ست رنگ بھمبیری پر کیا کبھی بھی نہ گھوما ہو گا۔ اُسے گھر کی مرغی سمجھا ہو گا۔ جس کے چیکٹ دھوتی اور قمیص جیسے جلد میں کھب چکے تھے بالوں کے گھونسلے میں جوؤں کے ہمراہ جھینگر اور چھپکلیاں بھی گھس کر رستہ تلاش نہ کر پاتی تھیں۔ ہاڑھ جیٹھ کی کڑکتی دھوپ ہو کہ ساون بھادوں کی امس بھری گرمی کہ پوہ ماگھ کا کڑاکا۔ وہ ریڑے میدان میں اوندھا یا رہتا۔

دتو مسلی نے کبھی کپاس کے موسموں میں یہاں آنے والے کابل کے پٹھانوں سے کچے گارے کی دیواریں اسارنا سیکھ لیا تھا۔ اسی ہنر مندی کے طفیل اسے اناج کی تھوڑ کبھی نہ ہوئی تھی۔ باڑوں کی دیواریں اور کھیتوں کی حد بندیاں چڑھاتا اور پھر بھوسہ ملے گارے سے گرمالے کے ساتھ اُنھیں لیپتا، بدلے میں من دو من دانے کما لیتا تھا۔

بھاگاں جو اس وقت محتاج نہ تھی چکنی مٹی میں اکاں کا بھور کتر کر سخت سخت گوندھتی اور پٹ سن کے بورے سے اسے ڈھک کر رکھ چھوڑتی کہ اُس وقت تک نائیلون کے بورے رواج میں نہ آئے تھے نہ کھاد کے لیے نہ اناج کے لیے۔ آٹے والی بھڑولی دانوں والے بڑے بڑے بھڑولے، تنور اور چکی کے من کے وار دیتی۔ ہر روز صرف ایک وار ہی دیا جاتا یا اگر شام تک کڑکتی دھوپ میں بار بار پانی لگانے کے باوجود وار سوکھ جاتا تو مغرب سے پہلے دوسرا وار بھی دے دیتی ورنہ روزانہ ایک وار ہی اسارتی جب پہلا وار مضبوط پکڑ بنا لیتا۔ دنوں بعد یہ سامان تیار ہو جاتا۔ آٹھ فٹ بلند اور پانچ فٹ کے قطر میں چوڑے بھڑولے جن کی بغل میں کھڑکی لگی ہوتی مٹی سے بنی چھت کی طاقی لیپ دی جاتی کہ کوئی دانے

چرائے تو بھڑولے کی چھت والی طاقی اکھیڑنی پڑے۔ کھڑکی میں تو تالا لگا رہتا اور چابی ہر ساس کے پراندے سے بندھی رہتی۔ بھاگاں گہنوں کے بدلے انھیں بیچ دیتی وہ چکنی مٹی کے بڑے بڑے صندوق، چولہے اور انگیٹھیاں بھی اُسارتی اور جٹ زمینداروں کے نمک مرچ ہلدی دھنیا چکی پر پیستی اور دالیں دلتی۔ اسی لیے اس کی مسالے والی لونکی ہر وقت بھری رہتی اور دالوں سے کجیاں کبھی خالی نہ ہوتیں۔ آٹے والی مٹکی نکو نک رہتی۔ دانوں والا بھڑولا بغلی کھڑکی سے اوپر تک کنو کن بھرا ہوتا۔

پھر بیچ میں سنیاری کی بھمیری آ گئی جس کے پیچھے دتو ہوا کی طرح اُڑتا کہیں آسمانوں کو چڑھ گیا۔

اب بھاگاں کا بھرولا اناج سے خالی رہتا۔ کیونکہ وہ اناج اب سنیاری کی پکھی میں چلا جاتا تھا۔ سنیاری جو شہتوت کی گولہہ سی رس بھری اور لسوڑیوں سی پیلی پٹک۔ سنی کا بوٹا سی زرد گہنوں سے کھنکتی ہوئی جو بنا کسی سنگار کے سجی رہتی، بنا کسی اچھی خوراک کے صحت مند اور بنا کسی اچھی پوشاک کے بنی ٹھنی۔ جیسے خود قدرت نے اس کے لباس خوراک اور بناؤ سنگار کی ذمہ داری اپنے ہاتھوں لے رکھی ہو اور رات سوتے میں اُس کا بناؤ سنگار کر کے صبح اُسے بیدار کرتی ہو۔

جس کی پکھی میں لال پائیوں والی ایک منجی بھی تھی اور جستی ٹرنک بھی۔ جس میں شیشہ، کنگا، کریم اور سرخی پوڈر حتیٰ کہ نکی بنیان بھی، خوشابی لنگی اور ریشم کا پراندہ بھی۔ وہ انھیں پہنے بنا ہی مٹکتی۔ اُس کے منھاندرے پر سب سج جاتا۔ وہ یہ تحفے جس سے قبول کر لیتی وہ عمر بھر اس وقوعے کا تذکرہ اپنی کامیابیوں میں سرفہرست سناتا۔ بدلے میں وہ بس ایک مسکراہٹ سے نوازتی اور جب مسکراتی تو گال میں ایک ذرا کنواں سا بن جاتا۔ اس کنویں کا پیاسا ایڑیاں رگڑنے لگتا۔ پانی کے گھونٹ کا ترسا ہوا لیکن وہ بوکا کھینچ لیتی۔ سنا نہیں کہ اس نے کسی کو سیر کیا ہو لیکن پیاسے ایک قطرۂ جاں کے لیے چھلکتے کناروں ایڑیاں رگڑتے لیکن وہ

ابھی بھی دن رات مدہوش پڑے کیڑوں اور مکھیوں کی آماجگاہ بنے اس رسیے کو اپنا شوہر مانتی۔ دتو مسلی تو اس گھونٹ بھر سیرابی کا عادی ہو چکا تھا۔ اُس نے اپنی پیاس کو بس اسی ایک گھونٹ کے مطابق کر لیا تھا۔ یہ گھونٹ بھر سیرابی اُس کے پورے وجود کو شاداب رکھنے کو کافی تھی۔ وہ کبھی کسی گستاخی کا مرتکب نہ ٹھہرا تھا۔ سنیاری کا رعب ہی عجب تھا کہ اس کا حسن تھرتھری پیدا کرتا زبان میں لکنت اور دماغ میں سرور۔ کوئی بات بھی کیا کرے وہ تو بھمبیریوں اور چھاج کے وٹائے دانے بھی جھولا کھول کر کہتی: ''پلٹ دو'' کبھی پکڑتی نہ کہ کہیں ہاتھ چھو نہ جائے۔ جیسے اُس کی لمبی چھمک اسی لیے اتنی لمبی تھی کہ سبھی کتے بلوں کو اُن کی حد تک روک دیا جائے۔

دتو تو اُس کے گلے میں بجتی تومبے کی صدا بن جاتا۔ جب وہ شادی بیاہ پر گڑوی بجا بجا کر گاتی...

مینوں ریشم دا جوڑا لے دے وے

میں روز بالما کہندی

ریشم کا جوڑا لانا دتو مسلی کی زندگی کی بڑی کامیابی تھی اور جب وہ گاتی۔

لنگی خوشابن ساویاں نوکاں جتی دیاں

خوشابی لنگی اور ساوی نوکوں والی جوتی لا کر اُس کے قدموں میں رکھنا دتو کی زندگی کا بڑا مقصد۔ بدلے میں وہی گال کا پیاسا کنواں ذرا سا چھلکتا اور بوکا کھینچ لیتا، دتو سیر ہو جاتا۔

وہ ہوکارا لگاتی۔

چھج بھمبیریاں۔

مردوں کا دل چھاج کی طرح ہولارے لینے لگتا اور بھمبیریاں گاؤں کے آسمانوں پر اُڑنے لگتیں۔ گھوگھوڑے ہنہنانے لگتے۔ جب وہ صدا لگاتی:

ونگاں چڑھا لو کڑیوں ونگاں چڑھا لو

تو سنیاری کے ٹوکرے میں لہریے سانپوں کی طرف چوڑیوں کے سنہرے روپہلے چھچھے کھنکھتے اور دتو جیسے اس صدا کے سُر پر رقصاں ہو جاتا، دتو مردار کی کھال کھینچنا بھی سیکھ گیا تھا۔ چمڑے کو سکھانا اور اس کی باریک باریک کترنیں کاٹنا بھی اسے آ گیا تھا۔

اس کی سیکھ بہت اچھی تھی۔ سنیاری نے اُسے ساری خانہ بدوشی سکھا دی تھی۔ سرکنڈے کی پتلی تیلیوں کو دنوں دھوپ میں سوکھا کر انھیں چمڑے کی کترنوں سے آپس میں جوڑ کر چھاج بنانا بھی وہ سیکھ گیا تھا۔ چھاج کی کھڑی مٹھ الگ باندھی جاتی جو مشکل تھی لیکن دو چار بار کی کوشش کے بعد وہ بھی اُسے آ گئی تھی۔ جس پر لال گلابی ہرے پیلے پھندنے ٹکائے جاتے۔

داج کے لیے خصوصی چھاج مہینے بھر کی محنت سے دتو بنا پاتا۔ سرکنڈے کی باریک تیلیوں پر سنہری روپہلی کلیاں چڑھا کر تیلیوں کو گاڑھے رنگوں میں رنگ کر چمڑے کی کترنوں کو خصوصی گانٹھ دیتا ہر گرہ گڈی سی بن جاتی۔ حویلیوں کے لیے ڈھوئے کے چھاج بھی وہ مہینوں کی محنت سے بناتا۔ جن کی کوئی قیمت مقرر نہ ہوتی۔ اب یہ چودھرانی کے ظرف پر تھا کہ وہ اس کا بدل کیا دیتی ہے۔ ایک من دانے کہ ایک سیر۔ جو بھی ملے وہ قبول کرنا پڑتا ہے۔ کہ ڈھویا تو وہ تحفہ ہوا کرتا ہے جو قدر دانی کا محتاج ہوتا ہے قیمت کا نہیں۔

وہ شہتوت کی باریک چھمکیں آگ پر سینک سینک کر انھیں خمیدہ بنانا بھی سیکھ گیا تھا۔ ان خمیدہ چھمکوں کے دونوں سرے عموداً زمین میں گاڑ دیے جاتے پھر اوپر سے افقاً یہ چھمکیں گاڑی جاتیں۔ پرانے کپڑوں کو تہہ در تہہ جوڑ کر پرال سیا جاتا جس کے سرے چار اطراف ٹھنکے کھونٹوں سے کس دیے جاتے اور شہتوت کی چھمکیں ڈھانپ کر خیمہ بنا لیا جاتا۔

جب چند ماہ بعد قافلہ نقل مکانی کی تیاری کرتا تو دتو سب سے پہلے گدھا گاڑی تیار کر لیتا۔ چل پل میں پرال اُتارتا۔ چھانٹیں اور کھونٹے اکٹھا کرتا۔ وہ سہ شاخہ جس پر سنیاری شیشہ سا چمکا کر برتن ٹانگتی تھی۔ دیگچہ، بلٹوئی اور کمنڈل تینوں شاخوں پر الٹے لٹکتے تین اہم برتن اس

سہ شاخے کو اکھاڑنا ضروری تھا چار پائی، صندوق، غلیظ روئی اگلتے لحاف اور سب سے قیمتی وہ ٹرنک جس میں سنیاری کے تحفے جمع رہتے تھے۔ دتو سب سے پہلے فارغ ہو جاتا اور پھر دوسروں کا ہاتھ بٹاتا کیوں کہ خانہ بدوشوں کی خلقی کاہلی اور افیون چرس کا آٹھ پہر نشہ اُن کے ہاتھ کا زور اور سینے کا دم سلب کر چکا ہوتا، اسی لیے تو دن رات اپنی عورتوں سے ذلیل و خوار ہوتے۔ جو خود کماؤ تھیں اسی لیے حاکم بھی۔ یہاں یہ واحد معاشرت تھی جس میں حکمرانی عورت کے ہاتھ میں تھی۔ وہی سانپ اور جونکیں پالتیں۔ چھاج بھمبیریاں گھوگو گھوڑے بناتی، چوڑیاں چڑھاتیں، ٹوکرے سروں پر رکھے کبھی کسی گاؤں کبھی کسی بہتی کبھی کسی جھوک ڈھوک، کبھی کسی ڈیرے بستی میں ہوکارے لگاتیں۔ جونکیں لگاتیں، سانپوں کا تماشا دکھاتیں، چوڑیاں چڑھاتیں، گھوگو گھوڑے چھاج بھمبیریاں بیچتیں۔ بدلے میں آٹا دانا، روٹیاں، گڑ، شکر لے کر پلٹتیں اور ان ست کاہل نشیئوں کا دوزخ بھرتیں اور ہر سال ان کے بچے بھی جنتیں۔ جو قدموں پر چلنے کے قابل جیسے ہی ہوتے بھیک کا کٹورہ پکڑے در در پِنے کو چھوڑ دیے جاتے۔

طاقت کا ترازو عورتوں کے ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے ہی شاید دنیا کی پُرسکون ترین معاشرت ہے یہ۔ نہ خدا سے گلہ نہ مخلوق سے احتجاج، نہ خدائی قوانین کو چنوتی کا حوصلہ۔ جسے رب جس حال میں رکھتا ہے وہ اُسی کے لائق ہوتا ہے۔ وہ سب سے نچلا طبقہ مسلّیوں، میراثیوں، کمیوں کمینوں کے لیے بھی قابل نفریں۔ لیکن اپنی حیثیت میں مطمئن جب تقدیر یہی لکھی ہے تو وہ اسے بدلنے والے کون ہوتے ہیں۔ خود سے نیچے دیکھنے کو اُن کے پاس کچھ نہ تھا اور پر دیکھنے والی آنکھ کو قناعت پابہ زنجیر رکھتی تھی۔ سب سے نیچ گالی جو مسلی اور مراثی کمی کمین کے پاس بھی ان پکھی واسوں کی صورت میں موجود تھی یہ جو خود گالی تھے لیکن ان کے پاس بھی ان سے نیچ گالی موجود تھی۔ سنیاسی، کچیانن، ٹپری واس گگڑے، پکھی واس یہ واحد مخلوق ہے جو سماجی مرتبے کی کسی گالی سے بھی محروم ہے۔ واحد سماجی طبقہ جس کے پاس

کوئی انسانی گالی نہیں ہے۔ بس جسمانی یا حیوانی گالیاں رہ جاتی ہیں۔

شاید اسی لیے وہ بستیوں سے دور بھاگتے رہے تھے کہ نفرتوں کا بوجھ اُتارنے کے لیے چار چھ ماہ میں ہی جگہ بدل لیتے ہیں۔ اُن کی کوئی ملکیت نہ تھی لیکن خدا کی ساری زمین اُنھی کی ملک تھی۔ کبھی سندھ کبھی ریاست کبھی پنجاب کے مختلف اضلاع اُن کے پیروں تلے بچھے رہتے ہیں۔ اُن کی زندگیوں کے اس قدر سکون کی وجہ شاید یہی ذاتی ملکیت سے دستبرداری تھی۔ گھر، مکان، بستی، شہر، عورت سبھی سے شخصی ملکیت کی دستبرداری۔

نہ ووٹ کا اندراج، نہ شناختی کارڈ، نہ پیدائش اور موت کا سرٹیفکیٹ، نہ سکول کے رجسٹر میں نام، نہ کسی سرکاری کھاتے میں شناخت۔ اس دھرتی کے اوّلین باشندے، پہلے وسنیک، لیکن عجب قناعت کبھی کہیں قابض نہ ہوئے۔ ہر سکونت کو ترک کردیا باہر سے آنے والے جاگیریں ریاستیں بنا گئے لیکن یہ خانہ بدوش فطرت سے کبھی نہ ہارے۔

اُن کے بے پناہ سکون کی بنیاد شاید یہی عدم شناخت تھی۔ عدم ملکیت تھی۔ ننگی بچی فطرت کا قرب تھا۔ بے اعتنائی میں کتنا اعتنا ہے۔

خانہ بدوشوں نے دتو مسلی کو پوری فراخ دلی سے قبول کرلیا تھا۔ یہ تو سنیاری کی مرضی تھی وہ جسے چاہے اپنی پکھی میں رکھے۔ یہ اس کی اپنی پکھی تھی جس کا فیصلہ بھی اس کا اپنا تھا۔ اس معاشرت میں شخصی آزادی کی کھلی چھوٹ تھی۔

سنیاری کا شوہر تو کھلے میدان میں مکھیوں کے سکون کی کھولی بنا دن رات پڑا رہتا۔ کڑکتی دھوپ ہو کہ ٹھٹھرتی راتیں وہ ہاڑ جیٹھ میں بھی اس جھلی میں دفن رہتا جو پوہ ماگھ میں بھی لپیٹے رکھتا۔ افیون کے نشے میں خود سے بے خبری کسی دوسری خوراک کی ضرورت ہی نہ تھی۔ نہ گرمی نہ بارش، آندھی نہ کہرا، نہ سردی عجب نشہ تھا کہ جس نے جسم کے سبھی تقاضے ختم کر دیے تھے۔ پتا نہیں یہ فطرت کے قرب کا نتیجہ تھا کہ فطرتوں میں اتنا سکون، برداشت اور فراخی بھر گئی تھی۔

جو مرد کبھی ہوش میں بھی ہوتے تو وہ پیسے لگا کر پتے اور کوڑیاں کھیلتے رہتے۔ معمولی جھگڑا کبھی بڑی لڑائی میں تبدیل نہ ہوتا، خوش دلی سے ہار جاتے یا پھر سکون سے جیت جاتے، کبھی کوئی قتل خانہ بدوشوں کی تاریخ میں نہ ہوا۔ کبھی پکھیوں میں چوری چکاری، ڈاکا زنی کی واردات نہ ہوتی۔ کوئی دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہتا۔ اخلاقی معیارات یاد نہ دلاتا۔ عورتیں خود مختار تھیں جس سے چاہیں تعلق بنائیں۔ پٹتی صرف اس وقت جب نشہ پورا نہ کر پاتیں۔ وہ بھی جسمانی کمزوری کی بنا پر ورنہ کم طاقت والے مردوں کو تو پٹخا دیتی، ایسی لڑائیوں میں صنف کا نہیں قوت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ کوئی کسی کی ذاتی پکھی میں جھانک کر نہ دیکھتا کہ کون کس کے ساتھ سوئی ہوئی ہے۔ میاں بیوی کی اپنی اپنی مرضی کسی کی مرضی دوسرے کی مرضی پر مسلط نہ ہوتی۔

پوری بستی میں بچے اور بیشتر عورتیں صبح و شام بھیک مانگنے کو بیسوؤں گاؤں میں گھوم جاتے۔ لیکن سنیاری جیسی کئی ایک چوڑیوں کے ٹوکرے سر پر رکھے آوازیں لگاتی پھرتیں۔ ''ونگاں چڑھا لو کڑیو ونگاں چڑھا لو''۔ کئی ''چھاج بھمبیریاں''، ''گھوگو گھوڑے'' کی صدائیں لگاتیں۔ گھوگو گھوڑے بھٹی میں پکے مٹی کے کھلونے، حقہ، چکی، صراحی، بیلنا، چرخا، بیل گاڑی یعنی کسان رہتل کے سارے برتن، اوزار اور مویشی ان کھلونوں کی صورت میں بکتے۔ بالکل ویسے ہی جیسے ہڑپا کے عجائب گھر میں سجے ہیں یعنی صدیوں سے یہ ہنر مند ہاتھ ایک جیسے ہی ہیں۔ شاید کسی ایک ہی نسل سے ہوں۔ ان پکھیوں میں بھی ایک ہڑپا بستا ہے جسے کسی نے کبھی دریافت نہیں کیا۔ شاید اوّلین ترین ہڑپا رہتل یہی خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔

کسی شادی، ختنے، عقیقے میں گانے بجانے سے جو ملتا وہ سبھوں میں برابر تقسیم ہو جاتا۔ کبھی مرکزی گائیک زیادہ حصہ نہ مانگتی کہ اصل کمائی تو اس کے ہنر کی تھی۔ خود غرضی اور لوبھ شاید پکے مکانوں میں بستے ہیں۔ پکھیوں میں اُن کی اوٹ نہیں بنتی۔ ان خانہ بدوشوں

ہیں گڑوی بجانے والیاں کم تھیں۔ ایک انگلی میں چھلا پہن کر پرات بجاتی اور دوسری گھڑے کی تھاپ دیتی۔ ''گھڑا وجدا گھڑوی وجدی۔''

ہر رات الاؤ کے گرد گانے بجانے اور چینا چھنڈنے کی آوازیں بستی والوں کو ناراض کرتیں کہ جن کی مشقت تو اذانِ فجر سے بھی پہلے شروع ہو جاتی لیکن یہ پکھی واس تو دن چڑھے تک مدہوش رہتے اور مکھیوں کے پرے ان کے چہروں کی غلاظت چوستے اور اپنی غلاظت پوتتے۔ چاہے پیٹ میں روٹیاں ہوں کہ نہ ہوں لیکن یہ رقص و سرود کی محفل ضرور جمتی۔ پکھی واسوں کی رہتل میں زیادہ تر عورتیں ہی ناچتی گاتیں کیونکہ مرد تو افیون میں ڈوبے اپنے قدموں پر کھڑے بھی بمشکل ہو سکتے لیکن مسلیوں کے قبیلے میں تو مرد بھی گاتے اور جھومر مارتے کیونکہ انھیں صرف حقے کی لت تھی جو کسان کے ہاتھ میں ہمیشہ موجود رہتا چاہے وہ کھیت کو جائے کہ باڑے کو، وانڈے جائے کہ کسی لڑکے لڑکی کے بیاہ کے دن ڈالنے جائیں۔ اپنا حقہ اپنے پرنے کی طرح لباس کا لازمی جزو ہوتا۔ کمائی کا بڑا حصہ بھی انھی مردوں کا تھا۔ وہ فصل کے پکنے کی خوشی میں جھومر اور گھومر مارتے تھے۔ شادیوں پر چینا ناچتے تھے۔ ان کے ہاں رقص خوشی کا اظہار تھا۔ زندگی کا معمول نہ تھا۔ عورتیں پھٹی چنتیں واڈی کرتیں۔ صلہ چنتیں یعنی اناج کے اُٹھ جانے کے بعد گری پڑی بالیاں اکٹھا کرتیں۔ پڑیاں ہونجتیں یعنی اناج کے ڈھیر کے نیچے کی مٹی کو چھان پھٹک کر دانے الگ کر لیتیں۔ پھٹی کی ناسیں نکالتیں یعنی کپاس کی گھوکھڑی کی اندرونی نوکوں میں پھنسی رہ جانے والی پھٹی ناخن گھسا کر باہر نکالتیں لیکن پکھی واسنیں ایسی محنت کا تصور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی لیے وہ کبھی جمع جتھا سنبھال نہ رکھتیں بس ڈنگ ٹپاؤ معاشرت تھی لیکن ناچنا گانا ایسا ہی معمول تھا جیسے کھانا پینا یا دیگر ضروری حاجات جبکہ مسکیوں جانگلیوں کی رہتل معاشرت کا ابتدا ہی سے اگلا روپ تھی شاید۔

▪▪▪▪

بھاگاں محتاج

دتا مسلی جب گارے کی دیواریں اسارنے والے اپنے ہنرمند ہاتھوں سے سنیاری کی پکھی گدھا ریڑھی پر لاد چلا تو بھاگاں کو معلوم ہی نہ ہوا، وہ کسی پھٹی کے کھیت سے چھوٹیں چنتی تھی چھوٹیں یعنی جب کسان کپاس کے کھیت سے چھڑیاں مارنے کا اعلان کرتا ہے تو پھر ان کھیتوں میں کہیں رہ گئے اِکا دُکا ریشے چننے کو یہ محنتی عورتیں اپنے ناخن گھساتی ہیں جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس ڈھونڈتی ہوں لیکن انہی چھوٹوں پڑیوں اور صلے سے بیٹیوں کے جہیز بناتی ہیں۔ کوئی ٹوم چھلا بھی گھڑوا لیتی تھیں۔ کہا جاتا تھا ان کے ہاتھ سونے کے ہیں یہی کچھ جٹیاں، گوجریاں اور آرائنیں بھی کرتیں جن کے شوہر بے حس اور ساسیں انتہائی ظالم اور کنجوس ہوتیں۔ بہوؤں کو لسی کا چھنا بھی خود سے لینے کی اجازت نہ ہوتی۔ مسلنیں ان کی نسبت خود مختار تھیں کیونکہ اکثر وٹے سٹے پر بیاہی آتیں اور طلاق لے کر دوبارہ بھی بیاہی جا سکتیں لیکن جٹوں گوجروں آرائیوں کے ہاں طلاق کا کوئی تصور نہ تھا۔ اور یہی عورتوں پر ظلم وستم کی بڑی وجہ تھی کہ وہاں طلاق یا دوسری شادی

کا وقوعہ صدیوں میں بھی کبھی وقوع پذیر نہ ہوا تھا۔ یہ سکھ یا ہندو مذہب سے تبدیل تو ہو گئے تھے لیکن جین اور نسلوں کے اوصاف تبدیل نہ ہوئے تھے یہ جٹ تو پورے پورے سکھ تھے۔ پتا نہیں یہ اجڈ، اکھڑ مرد جن کے ہر وقت بارہ بجے رہتے کب کبھی اور کیونکر ان کے آباؤ اجداد مسلمان ہو گئے۔ یہ تالیف قلب ان کے مزاجوں سے بالکل میل نہ کھاتی تھی۔ البتہ گوجر اور آرائیں نہایت چالاک اور سیانی، بنیا قومیں تھیں جو ہمیشہ اپنا نفع نقصان دیکھ کر قدم اُٹھایا کرتیں۔

اگلے روز جب آثاروں کی بغل میں اُترتے نشیب پر سے بیسیوں پکھیاں راتوں رات سمٹ گئیں اور چٹیل میدان میں کچی ڈھیموں سے بنے چولہے چھڑیوں اور ککھ کانوں کی راکھ فضاؤں میں اُڑانے لگے۔ دھول میں دھنسے غلیظ چیتھڑے بگولوں میں چکرانے لگے تو کسانوں نے آوازے لگائے ''بھاگاں پتریر، بھاگاں مسیر، بھاگاں ملویر''۔

وہ ہڑپا کی قدیمی اینٹوں سے اُساری اپنی کوٹھری سے باہر نکلی، ماتھے پر ہاتھ کی اوٹ بنا کر چمکتی دھوپ میں لپٹے بگولوں کو ناچتے اور آسمانوں کو چڑھتے ہوئے دیکھا جن میں پکھیوں کی باقیات اُڑ رہی تھیں۔

''ونڑ بھاگاں پتریر! دتو ملویر تو گیا۔ پکھی واسن کے چھج بھمبیریاں سنبھالتا گیا۔'' وہ سارے حلق کے اندر ہی اندر گٹکے یہ وہ معاشرت تھی جہاں کسی بھی حادثے اکیلے موت کے وقوعے میں سے بھی ہنسنے کو کوئی مضحک پہلو نکال لیا جاتا تھا ''اب تو کیا کرے گی اس جنڈڑی کے ساتھ''، ہنسی نے حلقوم میں ہی مدھانی ڈال لی تھی۔

بھاگاں کی آواز دیواریں اور کوٹھے ناچتے بگولوں پر چڑھی۔ ''جو ہوتے سوتے بھی میرا نہیں تھا چلا گیا تو پھر دفع ہو گیا۔'' جب تک بھاگاں محتاج نہ ہوئی مدفونوں پر چڑھی کوٹھری میں چکنی مٹی سے اُسارے ہوئے بھڑولے، آٹے کی مٹی اور دال مسالے کے کچے

کبھی خالی نہ ہوئے۔ چنی دو سال کی عمر سے آٹھ برس کی ہوگئی۔ کبھی بھوکی نہ سوئی، کبھی برہنہ نہ رہی کیونکہ بھاگاں بھی اُن عورتوں میں سے تھی جن کے ہاتھ سونے کے ہوتے ہیں، یعنی وہ اتنی محنتی کہ بھورے چن چن کے سونے کے زیور بھی بنوا سکتی ہیں۔ چنی آٹھ برس کی عمر سے ادھیارے کا ریوڑ چرانے لگی۔ آثارِ قدیمہ کے صدیوں پرانے درختوں کو چونڈ چونڈ کر جانور خوب صحت مند ہو جاتے تھے۔

بھاگاں پورے گاؤں کے مرچ مسالے، نمک، ہلدی، دھنیا پیستی۔ دال مونگ، ماش، چنا دلتی۔ ادھیارے کی بھینس گائے پالتی۔ دن بھر گھاس پھونس کھود کر لاتی۔ اُن کی ٹہل سیوا میں وہ بھلا چکی تھی کہ کبھی کوئی دتو بھی اُس کی زندگی میں آیا تھا جو چنی کا تحفہ دے کر پتا نہیں کہاں مرکھپ گیا۔ وہ ایسی خوبصورت بھی نہ تھی کہ مسٹنڈے اسے بیٹھے نہ دیتے ایسی نرم اور رسیلی بھی نہ تھی کہ سوّر گنا بنا جوس جاتے وہ سولوں بھرا ڈھینگر جس سے کوئی پرنا کبھی اڑ بھی جاتا تو پھٹ کر چھٹتا۔ سبھی اپنے پرنے بچانے لگے۔ پھر پتا نہیں کیوں آنکھوں کی پتلی پر موتیے کی موٹی تہہ چڑھتی چلی گئی جس کے اندر نور کی آخری رمق بھی ڈھک گئی۔ یوں بھاگاں پتر یر بھاگاں میسر کی بجائے وہ بھاگاں محتاج ہوگئی اور یہ شناخت پوری بستی میں کسی اور کی نہ تھی۔

اُس دن کے بعد کمائی کا سارا بوجھ بس چنی پر آ گیا۔ اس بستی میں خیرات، زکوٰۃ کا تو کوئی رواج نہ تھا۔ ہر ایک بمشکل اپنی روٹی ہی پوری کرتا تھا۔ مانگنا صرف پکھی واسوں کا وتیرہ تھا۔ بھوکے مر سکتے تھے لیکن منگتا کہلانا کسی کو قبول نہ تھا۔ سوائے ہڑپا کے کھنڈرات میں گھومتے سیاح جب خود ہی کچھ نہ کچھ دے جاتے۔ ادھیارے کی بھینس اور گائے دونوں بکنے سے پہلے ہی منہ خور کا شکار ہو کر مر گئیں۔ بڑی بی بی جی نے اوڑھ پوڑھ بھی کروایا لیکن جانور اور کسان بیمار نہ پڑیں تو مدتوں سخت جان پتھروں کی طرح جیتے رہیں لیکن ایک بار کسی بیماری کا شکار ہو جائیں تو پھر جانبر نہیں ہو پاتے۔ اُن کی حفاظت فطرت

کرتی ہے اگر فطرت ہی اُنھیں مارنے پر تل جائے تو پھر خود فطرت سے آڈھا کون لگائے۔کائنات کے ذرے ذرے میں بسی فطرت، خدا جیسی حکم دینے والی نظام چلانے والی کبھی نہ ٹلنے والی فطرت۔

■■■■

نے گت کے
"رجتی ہی نہیں بچھڑی چار پہر چرتی ہے جیسے گھوڑی چرتی ہے۔" ماہنے
سیاہ ناگ کو ہاتھوں سے تھپتھپایا۔ درختوں کی گپھا میں لال گانی والے طوطے چونچیں لڑانے لگے۔ ساون کا پہلا پہلا بادل کڑکا اور چھینٹوں کا پہلا جل ترنگ جھنڈ نے سہارا۔ بالی نے گھوم کر گت کا تازیانہ ماہنے کے چہرے پر برسایا وہ چوٹ کھا کر آنکھ سہلانے لگا۔ "اللہ کی قسم لگی ہے۔ اچھی بھلی لگی ہے۔" "دس روپے کا خرچہ نہیں اور ہزاروں کی بات لگا گیا کنجر۔ رکھ اپنا سب کچھ اپنے پاس۔"

جھنڈ پر کن من تیز ہوگئی پرندے ڈالوں پر اُترنے لگے۔ گھونسلوں میں بوٹ چہکنے لگے۔

"چل کالے کے حساب میں ڈال دے۔ بگے کے حساب میں یا نیا متے کے حساب میں اپنے حساب میں ہی ڈال دے۔" جھنڈ تلے رات پڑ گئی تھی چولہوں کے کوئلے اور لالٹینیں لشکنے لگے۔ کالے نے راجا منو ٹپکنے لگے۔ آسمان نے پورا منہ کھول کر کھنڈروں کے جلتے بدن پر ٹھنڈے پھاہے رکھ دیے۔ بوندیں پتوں سے چھن چھن چھتنار میں ٹپکنے لگیں۔ بالی نے لے اُٹھائی۔ "نکی کنی نکی اور کنی کیوں لائی او بدلا نکی کنی۔" مردوں نے میز بجا کر تال دی۔ ہدہد نے سیٹیاں بجائیں، کوئل نے مُرلی کُو کی۔ تبھی شرابور وردی میں خان نیازی چھتنارے میں داخل ہوا۔ پورا ماحول ساکت ہوگیا۔ بس بارش کی کن من اور گیلے بالوں سے جھانکتی کشادہ پیشانی پر چمکتے بارش کے قطرے۔

بالی سر ڈھک کر بیٹھ گئی اور وہ جوتے جو سارا دن اچھال اچھال کر مردوں کی کمر کا نشانہ لینے کے لیے ہی شاید وہ ساتھ رکھتی تھی وہ دونوں پیروں میں اڑس کر بی بی بن کر بیٹھ گئی۔ را طوطے گانے لگے۔ ہدہد پھدکنے لگا۔ بیا اپنے محل سے جھانکنے لگی۔ درختوں کے تنوں کے گرد بیر بہوٹیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ پتوں کے جھنڈ میں کہیں کوکتی کوئل دیوانی سی ہو گئی۔ بارش سے نہاتے شرابور خان نیازی کسی کرشنا سا چند ثانیے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔

چند لمحے پہلے پڑی کھچکلی سہم گئی تھی۔

چھوٹا ہاتھ دھو کر دھجی سے پونچھتا بھاگتا ہوا چلا آیا۔ جیسے اُس سے ہاتھ ملا کر وہ معتبر ہو جائے گا۔

''خان صاحب سوڈا کہ چائے۔''

کینٹین کا مالک سلام کرنے کو اپنی نشست سے نیچے اُتر آیا۔ جیسے نیازی نے کچھ نہ چکھا تو اُس کا ڈھابا بند کر دیا جائے گا۔

''خان صاحب آج تو چائے پکوڑوں کا موسم ہے۔ کبھی ہمیں بھی عزت بخشیں۔'' وہ بس سلام کا جواب دیتا۔ اپنی گمبھیر چپ کے ساتھ اپنی ڈیوٹی پر لوٹ گیا۔

سارا ماحول جو اُس کے وجود سے یکبارگی تبدیل ہو گیا تھا۔ اب واپس اپنے قالب میں لوٹنے لگا۔

سب سے پہلے بالی کے حلق میں پھنسا ہوا قہقہہ ابلا۔

''اری چنی تو تو ماری گئی۔ وہ مجھ اونچی لمبی گوری چٹی کو مڑ کر نہیں دیکھتا۔ تو تو ویسے ہی اُس کی پنڈلی کی سیدھ تک ہے۔ تو تو اس کی نظروں کے لیول پر بھی نہیں آتی۔ اتنا سر جھکا کر دیکھنے کی تو اسے عادت بھی نہیں لگتی۔ تو تڑپ چوھیا کتنا اچھلے اُس کے سینے تک نہیں پہنچ سکتی۔''

لیکن چنی تو آریا خان کے کھرے پر کھرا دھرتی دھوتی کا ٹوٹا کمر سے کستی ہوئی نجانے کب کی نکل گئی تھی۔ شاید ماحول کے واپس اپنی جون میں آنے سے بھی پہلے۔ پتھروں میں جان پڑنے سے بھی پہلے کیونکہ وہ پتھرانے والے مرحلے کو شکست دے چکی تھی۔ وہ سوچتی تو مرد ہے اور میں عورت اس کے درمیان کچھ حائل نہیں ہوتا۔ نہ شکل نہ قد کاٹھ، نہ عقل نہ حیثیت اہمیت۔ عورت اور مرد خود ملاپ کی سب سے بڑی وجہ اور اٹل حقیقت۔ باقی تو سب دنیا نے جوڑ دیا ہے۔

جڑی ہوئی بھنویں اور دھوپ میں جل جل رنگ اُڑی جٹائیں، گڈوں بھری چندھی آنکھیں اور سنک ابلتی پھینی ناک، راب میں سنی باچھیں، میل کی مروڑیاں چڑھی انگلیاں، جن کے بڑھے ہوئے میل سے اَٹے، ماس میں دھنسے راکھ رنگے ناخن۔ کریری جمے دانتوں کی تیز نوکیں جن سے وہ سب کتر ڈالتی تھی۔ وہ جو شروع دنوں میں آریا کی خاطر خود کو سک سرمہ کر کے رکھتی تھی۔ شاید وہ حربہ ناکام ہونے پر خود سے ہی بدلہ چکا رہی تھی اور اپنی بھا اُڑا رہی تھی۔

کھرے پر کھرا دھرتی چلی جاتی تھی کہ شاید ابھی کوئی سیاح خان نیازی سے سوال کرے۔

''کیا ہڑپا کی پرانی مخلوق کی باقیات ابھی بھی....''

تو پھر آریا خان کو اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ وہ منہ موڑ کر دیکھے گا تو وہ مثال پیش کرنے کو موجود ہوگی۔

کھنڈروں سے بہت نیچے ہل بیل روک کر کسان کھانا کھا رہے تھے۔ موٹی موٹی تنوری روٹیوں پر مکھن کی گولیاں پگھل رہی تھیں۔ کُٹی ہوئی لال مرچ گڑ کی بھیلیاں اور پیاز کے گنڈے پوٹلی میں بندھے ہوئے، ٹھنڈی کچی لسی سے بھری ہوئی کجیاں جن پر اُسی طرح کے نقش لیکے تھے جیسے ظروف ہڑپا کی الماریوں میں سجے ہیں۔

چناں کو معلوم تھا کہ یہ جو لال نیلی کنی والی لنگی اور پیلے زرد بھوچھن والیاں چاندی کے چوڑے کھنکھناتی ہالیوں کے گرد مورنی سی پیلیں ڈالتی ہیں تو یہ ابھی پٹیں گی۔ نوعمری کے تازہ خون اور گوشت سے بھرے چہرے جو سانولی جلد میں سے سلفے کی طرح بھنج رہے ہیں ابھی نیلو نیل ہو جائیں گے۔ ٹاہلی کے انگارے کی طرح لاتیں مارتے بدن ابھی لاتوں گھونسوں سے سوج پوج جائیں گے۔

پیلیوں میں روٹی لے کر جانے والی یہ نو بیاہتا چہرے بازوؤں پر اگر تھپڑوں کے

نیل، گھونسوں، لاتوں کی سوجن لے کر واپس نہ لوٹیں تو اس کا مطلب ہے کہ ان کا مرد نامرد ہے۔ ان کے درمیان میاں بیوی والا رشتہ قائم ہی نہیں ہوا۔ یہ سوجنیں اور نیل نو بیاہتا کو شادی کے پہلے پہلے تحفے کے طور پر ملنے ضروری ہیں اور وہ بھی فخر سے ایک ایک کو دکھاتی تھی ورنہ کسی کو یقین آتا کہ وہ روز نہانے والی ہوتی ہے۔ بیوی کا شوہر سے پٹنا اس معاشرت میں اتنا ہی ضروری تھا جتنا ضروری مباشرت۔ پندرہ سولہ برس کا دولہا اُٹھارہ انیس برس کی دلہن کو اگلے روز کھیت سے اگر سوجا پوجا کر واپس نہ بھیجے تو وہ جوان ہی نہ سمجھا جائے گا۔ جس کی ابھی مسیں ہی بھیگ رہی ہوتیں، کم خوراک اور کمزور جینز کے تسلسل میں ڈاڑھی تو بہت دیر بعد آتی۔ لیکن شہوت بچپن سے ہی جاگ اُٹھتی اور ساتھ کھیلنے والی بچیوں پر سارے تجربات وہ پہلے ہی کر چکا ہوتا۔

بالی انھیں پٹتے ہوئے دیکھتی تو سوڈے کی خالی بوتلیں ٹھرکی بوڑھوں کی پیٹھ میں نشانہ کر کر کے قہقہے لگاتی۔ جیسے سامنے پٹتی ہوئی کا بدلہ لے کر عجب طمانیت محسوس کرتی ہو۔

بوڑھے مرد کراہتے جیسے بوتل نہیں خود بالی اُن کی پیٹھ کے بیچوں بیچ آن ٹھکی ہو۔ اس چوٹ کے بدلے میں بالی کو بھرپور نظروں سے گھورنے کا جواز وہ حاصل کر لیتے اور بنا مباشرت ہی فراغت پا لیتے۔

ہر روز بالی ایک نئی چھب لے کر نکلتی تھی۔ کبھی لاچا کرتا، کبھی شلوار قمیص اور کبھی کبھی تو شہری طرز کا پتلون نما پائجامہ شرٹ پہنے ہوتی۔ کبھی سرخ پیلے پھندنوں والا لمبا پراندہ۔ کبھی کھلے بال کبھی اونچا پونی ٹیل۔ کبھی بالوں کی گھٹائیں، شانوں سے گھٹنوں کے بغلی گڑھے تک چھپ جاتے اور دیکھنے والے یوں تڑپنے لگتے کہ جیسے سانپ کا ڈسا پانی مانگتا ہو۔

ان کی بیویاں، بدبودار تہہ بند اور مہینوں کے ان دھوئے چیکٹ بال۔ پائیریا زدہ دانتوں سے چھٹتی تیوراد ینے والی بدبو، کبھی مسواک نہ کیے ہوئے بیمار مسوڑھے۔ خوراک کی قلت سے چہرے کا سوکھا ہوا چمڑا، مسوڑھوں کو ڈھانپنے سے بھی قاصر رہتا۔ سامنے کے دو

دانت کتلیوں کی طرح زرد بے جان ہونٹوں سے باہر نکلے ہوئے اور باقی کرچیوں اور ٹوٹوں کی صورت مسوڑھوں میں دھنسے کریڑے اور سیاہ میل سے اَٹے ہوئے۔ قبل از وقت جھریوں سے چڑمڑ چہرے، باریک لکیروں سے ستے ہوئے کہ موٹی سلوٹوں کے لیے گوشت ہی ناپید تھا۔ سپاٹ سینے مردوں کو بھی شرمندہ کرتے درمیانی ہڈی کہان کی طرح باہر کو ابھری ہوئی۔ سارا ماس گوشت جو چھلک چھلک پڑتا تھا جیسے چیلوں نے نوچ کھایا ہو۔ ہونٹوں کی قوسیں مسمار۔ ڈیلے سیاہ حلقوں کے کنویں میں اُترے ہوئے یہ وہی تھیں کہ چلتیں تو بلیاں ان کی ریس کرتیں۔ ٹھہرتیں تو مورنیاں مڑ مڑ کر دیکھتیں۔ تپ دق کا دیہی مرض دو چار بچوں کی پیدائش کے دورانیہ میں پھیپھڑے ہی چھلنی نہ کرتا پورا وجود بھی کھوکھلا کر دیتا۔ بالی نے نہ جنا تھا نہ گھری تھی۔

لیکن یہ اگلے سات آٹھ برس مزید سات آٹھ پیدا کرتیں اور ختم ہو جاتیں جیسے چیلوں کوؤں نے نوچ نوچ سب اُڑا لیا ہو اور خالی ہڈیاں کڑکڑانے کو چھوڑ دی ہوں۔ منہ کھولتیں تو پتا چلتا کہ پائیریا زدہ دانتوں کی کرچیوں پر ہونٹوں کا غلاف چڑھا ہے۔ لگتا رخساروں کی ہڈیاں سیاہ مردہ جلد کو پھاڑ کر باہر نکل جائیں گی۔ ڈیلے سیاہ حلقوں کے کنوؤں میں خالی بوکوں سے اُتر جاتے۔ سینے اتنے سپاٹ کہ مردوں کو شرمائیں۔ بس نپل ڈھلکے رہ جاتے جنھیں ہر وقت کوئی کتورا چوستا رہتا۔ پتا نہیں اس سوکھے ہوئے مردہ چمڑے سے دودھ کی نہر کیسے بہتی تھی۔

اگر یہ سارے مرد بالی کو دیکھ دیکھ خوش ہوتے تو بالی کتنا نیکی کا کام کر رہی تھی کہ آنکھیں اور ناک بند کر کے اپنی بیویوں کی ننگی ہڈیوں پر جسم کی مجبوری کو موت کر بھاگ نکلنے والوں کو دیکھنے اور سونگھنے کی تسکین فراہم کرتی تھی۔ وہ صرف دیکھتے رہنے کی طمانیت میں بالی کے بل ادا کرتے تھے۔ اگر بالی یہ نیک کام نہ کرتی تو وہ ایک دوسرے کو کاٹ ڈالتے اور بیویوں کو روز طلاقیں تھوکتے۔ بالی کتنے آتش دانوں کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا نیک کام کر رہی تھی۔

بالی اُنھیں جانور سے انسان بننے کا موقع فراہم کرتی تھی یعنی وہ صرف جسم کی بجائے آنکھیں، ناک، کان اور دل کا اعتبار بھی حاصل کر سکتے تھے۔ وہ دیکھ سونگھ کر مسحور ہو سکتے تھے۔ ایک صحت مند صاف ستھری خوبصورت عورت اُن کے دل میں خوشی کی طرح پھوٹتی تھی۔ اگر بالی نہ ہوتی تو یہ سب اجڈ وحشی پاگل ہو جاتے۔ یہ بالی ہی تھی جو اُنھیں اپنی حد میں رکھتی تھی۔ کتنا نیکی کا کام کر رہی تھی بالی۔ جو اُنھیں اپنے انسان ہونے کا جواز فراہم کرتی تھی۔

لیکن یہ آرائنیں، جٹیاں، گوجریاں جیسے کھیتوں میں سرسوں پھوٹتی ہے اور چل پل ساگ کے کنوں میں چڑھ جاتی ہے۔ مویشیوں کی کُھرلیوں میں بھر جاتی ہے۔ یہاں کوئی مسلی یا جانگلی کہیں سے ہجرت کر کے نہ آیا تھا۔ لیکن یہ آرائیں، جٹ، گوجر، راجپوت اور دوسری قومیں سبھی کہیں اور سے آئے تھے۔ جنھیں پُرانے لوگ مہاجر، پناہی، پناہ گیر کے نام سے پکارتے ہیں۔ اُن کے لیے بھی بالی بڑی سہولت کار تھی، کیونکہ اُن کی اپنی بیویوں تک اُن کی دسترس اُن کی ماؤں کے رحم و کرم پر تھی۔ ان گھرانوں کے مرد یا تو بھکوں میں جاگتے باڑوں میں سوتے اگر امس اور کہرے کے موسموں میں گھر میں بھی ہوتے تو بیٹھک یا چھت پر سوتے اور مائیں پورا پہرہ دیتیں کہ اُن کے پہلو میں سوئی ہوئی بہو کی چارپائی رات کے کسی پہر میں خالی تو نہیں ہو گئی۔ اگر سال میں ایک آدھ بار ایسا جرم سرزد ہو جاتا تو پھر بہو کے ساتھ جو ہو جاتی اگلے دو چار برس وہ پوری رات انگاروں کو پہلو میں لیے چاہے کُڑھتی رہے لیکن کبھی چارپائی سے پیشاب کے لیے بھی نہ اُٹھتی کیونکہ اس حاجت کے لیے بھی ساس کی اجازت لے کر جانا ہوتا تھا۔ اور وہ کھولے کے منہ پر نظریں جمائے رکھتی کہ کہیں کھولے میں اس کا بیٹا تو بیوی کا منتظر نہیں ہے۔ اگر ایسا حادثہ کبھی ہو جاتا تو ساس لتر اُٹھا کر کھولے میں بھری تاریکی میں سے بھی بہو کو دبوچ لیتی۔ بیٹا تو مجلی اٹھا کر بھاگ چکا ہوتا لیکن بہو دنوں بعد تک ٹکوریں کرتی بے حیائی کے طعنے سنتی۔ اسی لیے ان کے ہاں تین چار

بچوں سے زیادہ کبھی نہ ہوئے۔ کیونکہ جب ساس مرتی اور وہ خود ساس کی گدی سنبھال کر اپنی بہو کے ساتھ بھی وہی کچھ برتتیں جو اُن کے ساتھ بیتا تو شوہر یا تو مر چکا ہوتا یا بوڑھا صرف بہک کا ہو کر رہ جاتا۔ اگر بیٹھک میں بھی رہتا تو زندگی بھر اتنی اجنبیت حائل رہی ہوتی کہ بات کرنا بھی مشکل لگتا۔ دن میں شوہروں سے بھی گھونگھٹ کرنے کی پابندی تھی۔ کبھی کبھار رات کے کسی تاریک پل عجلت میں کی گئی دزدی سے حمل تو شاید ٹھہر سکتا تھا لیکن میاں بیوی والی بے تکلفی کبھی نہ آ پاتی تھی۔ پیلیوں میں روٹی بھی ساسیں خود لے کر جاتیں۔ بڑے بڑے خاندانوں میں بھاوجیں نندیں ہر پل ایک دوسری کی ٹوہ میں رہتیں کہ کہیں شوہر کے لاگے تو نہیں لگ گئی۔ وہ مرد جو اُن کے دو تین بچوں کا باپ لگتا تھا۔ وہ اُن سے اتنا ہی دور ہوتا جیسے ریپ کا مجرم ہو جو سامنے آ بھی جائے تو پہچانا نہ جائے۔

ان حالات میں بالی ان مردوں کے لیے بھی بڑی غنیمت تھی جو اپنی بیوی کا چہرہ بھی گھونگھٹ کی اوٹ سے کبھی شاذ و نادر ہی دیکھ پاتے۔ اگر کبھی موقع مل بھی جاتا تو پکڑے جانے کا خوف اور شرمندگی بدن کی غلاظت موت دینے کی جلدی یہ بھی احساس نہ ہونے دیتی کہ یہ عورت ہے کہ گدھی۔ لیکن بالی تو پوری عورت تھی۔ اگرچہ یہ بہویں قدرے صحت مند رہتیں کہ مسلنوں، جانگلانیوں کو تو ہر سال جنم لینے والے یہ بچے چوس لیتے تھے لیکن ان مہاجرنوں کو تو بچہ پیدا کرنے والا لمحہ بھی قسمت سے میسر آتا تھا۔ لیکن یہ کسر ساسیں پوری کر دیتی تھیں، بات بے بات گت پکڑ کر دو کنال کے احاطے میں گھسیٹتیں۔ ہر ہر پل پھوہڑ پن اور بدسلیقگی کے طعنے تشنے سب کا بچا ہوا ناکافی کھانا ان کا نصیب تھا۔ جو دن رات آنسو پیتی اور آہیں کھاتی تھیں۔ ساس اُن کا خدا تھی۔ ظالم اور متکبر خدا وہ بے بس لاچار مخلوق، جسے گوھا پھوسی اُٹھانا اوپلے تھاپنا اور چارپائی پر بیٹھی ساس کے تشدد کا نشانہ بننا مقدر تھا۔ اُس کی مدد کو باپ بھائی بھی کبھی نہ آتے تھے جیسے کہتے ہوں ہمارا فرض تجھے بیاہ دینا تھا۔ آگے موت یا زندگی دینا خدا یا ساس کا اختیار ہے۔ ہم بے بس ہیں جیو کہ مرو تمہارا مقدر۔

شوہر اور سسر دیکھتے بھی لیکن ساس اس قدر طاقتور ہو چکی ہوتی کہ شوہر یا بیٹے اُن کے سامنے سانس لینے کی بھی جرأت نہ کرتے۔ بوڑھے شوہر بھکوں میں حقے گڑ گڑاتے۔ اور پیلیوں کی حفاظت کرتے ہوئے بڑھاپے کے دن پورے کرتے لیکن اُن کی بوڑھی بیویاں تو عمر بھر اذیتیں اور ظلم سہتے سہتے جیسے انتقام انتقام پکارتی ڈریکولا بن چکی ہوتیں جس کا نشانہ بہویں اور بوڑھے شوہر بنتے۔ بہویں تو اس وقت تک ظلم سہتیں جب تک ساسوں کی روایت کو جاری رکھنے کے مقام کو خود پا نہیں لیتیں لیکن بوڑھے مرد بیوی کی بے رخی کا شکار جلد ہی مر جاتے۔ جوانی ماں کی حاکمیت کی چکی میں پستے اور بڑھاپا بیوی کی نفرتوں میں بھوگتے جو مر چکی ساس کے سارے بدلے انہی سے چکاتیں۔ ان عورتوں کا باہر کے معاملات یا پیسے دھیلے سے کوئی سروکار نہ ہوتا وہ مرد نبیڑتے اور گھر کی سیاست میں یہ مرد کبھی دخل اندازی نہ کرتے۔ حتیٰ کہ اُن کے دو چار بچے جوان ہو کر بیاہے بھی جاتے لیکن وہ دادا دادی کے فیصلوں کے پابند رہتے۔ یہ جٹ زمیندار انتہائی محنتی اور ازحد کنجوس۔ اسی لیے تو سروں پر پوٹلیاں رکھ کر آنے والے مہاجر چند برس میں بیٹھکوں والے پکے مکان، ٹریکٹر ٹرالیاں، ٹیوب ویل اور سامانوں سے بھرے مکانوں کے مالک بن سکے تھے لیکن اس خوشحالی میں سے بہوؤں کو دن بھر کام میں جتے رہنے کے بعد بس روٹی کھانے کا حق ہی حاصل تھا۔ وہ بھی پوری نہیں اچار کی پھانک بھی ساس کی دیا ہوتی۔ اچار کا مرتبان بھی تالے میں رکھا جاتا جس کی چابی ساس کے پراندے یا نالے سے بندھی رہتی۔

اور بیٹوں کو مٹی میں مٹی بن کر زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے بدلے دودھ کا چھنا رات کو اور ادھ ریڑ کے کا کٹورہ صبح کو عنایت ہوتا، بارہ بجے روٹی پر مکھن کا پیڑا بھی سرسوں کے ساگ میں پگھلتا ہوا ملتا لیکن اس ساری طاقت کو کھیت کی مٹی میں انڈیل کر اس سے فصلوں کا سونا اگانا مقصود تھا گویا وہ بھی اپنے کھیتوں کے بس بیل تھے جن کی کوئی خواہش یا جذبات نہ ہو سکتے۔ مائیں اُنھیں بیلوں کی طرح ہی خوب کھلاتی پلاتی پالتیں لیکن بیویوں

کے قریب پھٹکنے کی اجازت بھی نہ دیتیں۔ ان کا اپنی بیویوں کی سمت دیکھنا بھی معیوب تھا۔ تو پھر ان طاقت ور پنجیریوں اور دودھ مکھن کی اضافی طاقت کے اخراج کے لیے بالی کی اہمیت تپتی پیاس میں ٹھنڈی باؤلی جیسی تھی۔

یہ بالی ہی تھی کہ جس کے منہ سے ہر گالی ہر دھمکی ہر طعنہ سن کر یہ مرد مزید بشاش ہو جاتے۔ منہ، کان اور سینے طمانیت اور فخر سے بھر جاتے۔

لیکن چنی کو تو ایک نظر درکار تھی صرف اس آریا خان کی اور کوئی نہیں۔ کینیٹن پر گانا بجتا۔

بھانویں وسیں تو ولایت
اساں کرنی نہیں رعایت
تینوں لے کے جانا اے میانوالی

پتا نہیں یہ میانوالی کس دیس میں بستی ہے جہاں سے یہ آریا خان آیا ہے۔ اور اُسی میانوالی میں وہ چنی کو لے جائے گا۔ جیسے اُس کے باپ کو سنیاری ادھر ریاست میں لے گئی تھی۔

بالی رکی ہوئی ہنسی کا بوکا بھر کر انڈیل دیتی۔ ''اری ذات دی کوڑھ کرلی تے شہتیراں نال جپھے۔ وہ مجھے نہیں دیکھتا تو کس باغ کی مولی ہے ری۔ چنی، تیری تو بس موت آئی ہے ری۔''

....

اس بار ادھیارے کی بکری کا حساب کرنے جب چناں بھاگاں محتاج کی انگلی پکڑے اُسے حویلی میں لے کر گئی تو آم کے پیڑوں پر کوئل کوکتی تھی۔ جامن کے پیڑ سے پکی جامنوں کی مٹھیاں بھر بھر برستی تھیں۔ ٹپکے آم بھرے رس مست ہو ہو گرتے تھے لیموں

اور بیٹھے کے سفید پھولوں سے کھٹی مہک چھٹتی تھی اور چھوٹر بھینسیں ملاپ کے لیے دھائی دیتی تھیں۔ ہڑپا کی معاشرت کی چوتھی ارتقائی منزل شاید یہ حویلی تھی۔ خانہ بدوشوں، جانگلیوں، مہاجروں کی معاشرتوں سے زیادہ ترقی یافتہ معاشرت۔

چنی کے سینے میں اس بار تو رازوں اور معلومات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا۔ اب کی بار تو خان نیازی ڈھنڈاروں میں اُترا تھا۔ جس کے وجود سے سارے ویرانے آباد ہو گئے تھے۔

اور صنوبر بی بی کتنی کنگال تھی کہ اُس نے تو خان نیازی کو بھی نہیں دیکھا۔ اس بار تو اس کے پاس ایسے ایسے بم دھماکے تھے کہ صنوبر بی بی تو جانبر ہی نہ ہو سکے گی۔ وہ منہ کھولے کبھی اسے دیکھتی اور کبھی نظریں پیروں میں دھنسائے تھر تھر کانپتی۔ بی بی جی کی حساب کتاب والی مصروفیت میں لپٹ کر چنی چپکے سے صنوبر کے کمرے میں سٹک گئی تھی۔

''بی بی صنوبر! تجھے پتا ہے۔ ڈھنڈاروں میں آریا خان اُترا ہے۔ وہی آریا جس نے ہڑپا کی بستی کو کبھی تباہ کیا تھا۔ وہ لوٹ آیا ہے۔

تو نے آریا خان کو کبھی دیکھا؟

صنوبر نے حیرت سے چنی کو دیکھا یہ دیکھنے کا جرم اس سے کیونکر سرزد ہو سکتا ہے۔

''ہائے شوہدی چھوٹی بی بی۔ تو نے تو آریا خان کو بھی نہیں دیکھا ھائے! تو نے پھر دیکھا کیا ہے جگ میں، حیاتی میں۔''

صنوبر کے ہاتھ پیر لرزنے لگے۔ سانسیں بیٹھے بیٹھے دھونکنی کی مانند بجنے لگیں۔

اب چنی نے جو کسی غیر مرد کا نام اُس کے سامنے لے دیا ہے۔ تو پھر اس کے جسم پر کچھ ایسا ضرور اگ آیا ہو گا جو چیخ چیخ کر بتائے گا کہ صنوبر بی بی کے سامنے کسی غیر مرد کا نام لیا گیا ہے۔ اُس کے کانوں سے کسی غیر کے نام کو سننے کا جرم سرزد ہوا ہے۔ اُس کے وجود پر سؤر کی کھال چڑھ جائے گی یا سیہہ کے کانٹے نکل آئیں گے۔ کھولے کے پرانے کاٹھ کباڑ

میں چھپے سارے بچھو اپنے ڈنک اُٹھائے اُس کے وجود پر رینگنے لگیں گے اور وہ غلیظ ٹا کیوں والے لاروؤں اور ناپاک بالوں سے منہ سے لے کر گردن تک بھر جائے گی۔

''ہائے صنوبر بی بی! تو نے خان نیازی کو نہیں دیکھا تو پھر کیا دیکھا۔ اگر تو اسے دیکھے نا تو وہ بھی تیری طرف ضرور دیکھے گا۔ کیونکہ وہ بھی تیرے جیسا ہے گورا چٹا، تیکھی ناک اور چیروں آنکھ والا ہے۔''

چنی نے یوں چس لی جیسے وہ گورا چٹا اُس کے منہ میں مصری سا گھل گیا ہو اور تیکھی ناک کی قلفی سی چوستی ہو۔

''پر وہ تجھے بھی نہیں دیکھے گا پک نال نہیں دیکھے گا وہ تو بالی کو بھی نہیں دیکھتا۔ بالی اسے دیکھ کر خود سر ڈھانک لیتی ہے اور چپل پہن لیتی ہے جس چپل سے وہ دن بھر مردوں کی پسلیوں کے نشانے لیتی ہے۔ ڈھابے کے چھوٹوں کے منہ توڑتی ہے کیونکہ وہ میرے بھی پڑتے رہتے ہیں نا وہ مجھے اُن سے بچاتی ہے۔''

بالی کے ذکر پر اُس کے مٹھی بھر چہرے کی سیاہی ناگواری میں مزید گاڑھی ہو گئی۔

''پر اب تو آریا خان بھی مجھے بچاتا ہے۔ چاہے دیکھے نا پر میری ایک چیخ پر بھاگا چلا آتا ہے اور وہ حرامی اس کے بوٹوں کی آواز سے ہی ٹیلے پھلانگ جاتے ہیں وہ تو بس گوریوں کی سمت دیکھتا ہے۔ اور انھیں انگریزی میں دھنڈاروں کی کہانیاں سناتا ہے نا۔''

چنی کی کوتاہ گردن تن گئی۔

''حق ہا تجھ شوہدی نے تو گورے بھی نہیں دیکھے۔ جو ہمارے آلے دوالے چار چوفیرے پھرتے رہتے ہیں۔ تو نے تو چائے اور کوکے کولے کا ہوٹل بھی نہیں دیکھا۔ تو نے تو نو گزرے کے ملنگ بھی نہیں دیکھے حق ہا تجھ شوہدی نے دیکھا کیا حیاتی میں۔ ڈھنڈار تک نہیں دیکھے۔ جہاں پورا جگ روز اتر آتا ہے۔ اور آریا خان انھیں انگریزی میں وہاں کی کہانی سناتا ہے۔ اگر تو آریا خان کو دیکھے تو بس مر جائے اُس پر۔''

چنی آریا خان کی ٹافی کالی نوکیلی زبان پر رکھے چسر چسر چوسنے لگی۔

اب تو اس کے پورے وجود پر اگ آئی جت ریچھ سی کالی بڑھتی چلی جا رہی ہوگی۔ اور کھولے کے سارے کیڑے اس جت میں رینگنے لگے ہوں گے۔ ذرا ذرا سفید دھاگوں سے جواب اُس کے منہ میں بھی گھسے چلے جاتے تھے۔

وہ اُسے کیسے کہے کہ نکل جاؤ۔ اس زبان کو کوئی جملہ ادا کرنے کی اجازت ہی نہ دی گئی تھی۔ اگر کبھی کھلی بھی تو صرف لفظ ادا کیے۔ پورا جملہ بولنے کی تو کبھی ضرورت بھی نہ پڑی تھی۔ وہ جب نوکرینوں کو لمبے لمبے جملے بولتے سنتی تو اُن کی اس مہارت پر حیران رہ جاتی اور یہ چنی بکریاں چرانے والی چنی، کتنے لفظوں کتنے جملوں پر قادر تھی۔ جیسے لفظوں کا سیلاب بہہ رہا ہو۔ ایک صنوبر تھی جسے ایک لفظ کے بعد دوسرا سوجھتا ہی نہ تھا۔ کبھی زندگی میں کوئی جملہ پورا ہوا بھی ہوگا تو بڑی بی بی جی نے جس نظر سے دیکھا ہوگا وہ نظر کہتی ہوگی خبردار یہ لمبی زبان کتر ڈالوں گی جو دوبارہ کبھی کھلی تو۔

باہر چنی کی ڈھنڈیا پڑ گئی تھی۔ نوکرانیاں جسے گھسیٹ کر باہر لے گئی تھیں۔

محتاج بھاگاں نے دو چار دھپے اندازے سے لگائے لیکن پہلے دھپے کے بعد اگلے سبھی کسی دوسری کو پڑے یا پھر خلا میں وار خالی گئے۔

''نہ کہا کیا ہے میں نے بات ہی کی ہے نا۔ تو، انی موری ہو کر بھی کہیں امان کی نہیں۔''

چنی کی زبان میں کتنا زور تھا کہ وہ اپنی ماں کو بھی چپ کروا سکتی تھی۔ کاش اُس کی زبان میں بھی اتنا زور ہوتا کہ وہ حق بات ہی کہہ سکتی۔

''کبھی تجھ گندی کو ساتھ نہ لاؤں اگر میری ٹوہنی نہ ہو تو۔''

''ہاں تو میں تھوڑی آتی ہوں خود لاتی ہے مجھے، جا کندھ سے جا کر ٹکر مار انی، بھوری۔''

''بی بی! کوئی چھوٹی بی بی کی شلوار دے دو۔ کملی کو مجلی باندھنی بھی نہیں آتی۔ ننگی ہوتی رہتی ہے۔ اب جوان جہان ہے۔'' بھاگاں چنی کی بکواس کا کبھی جواب نہ دیتی۔ بس اپنی

کہہ دیتی جو کہنا ہوتا لیکن صنوبر اندر کمرے میں لرزتی رہی چنی کے بولنے کی سزا بھی اسی کو ملے گی۔ ابھی بڑی بی بی جی چیخیں گی۔ ''یہ لمبی زبان والی بدذات اندر کیا لینے آئی تھی۔ تو بھی چسکے لیتی ہے نامردوں کی باتیں سن سن کر'' جو بات نہیں ہوتی تھی انھیں تو اس کا بھی علم ہو جاتا تھا۔ یہ تو پھر ہو چکی تھی۔ تو پھر اب کیا ہوگا جیسے آریا خان کی اتنی بڑی لوتھ اس سے چپک گئی ہو۔ اب وہ اسے کیسے چھپائے گی۔

اس بار بھاگاں محتاج کو، اناج کے ہمراہ صنوبر کی ایک بوسیدہ شلوار بھی مل گئی۔ صنوبر کے بس میں ہوتا تو کبھی نہ دیتی۔

اسے کتنی ضرورت تھی ٹاکیوں کی لیکن خود اسے اس بوسیدہ شلوار کو پھاڑ کر ٹاکیاں بنانے کی کبھی جرأت نہ ہو سکتی تھی۔ اُسی وقت ڈھنڈیا پڑ جاتی۔ جیسے پھٹی ہوئی شلوار نہ ہو کوئی کم خواب کا جوڑا ہو۔ چنی نے شلوار اسی وقت چڑھا لی تھی جیسے پہننے کا طریقہ سیکھ رہی ہو۔

نوکرانیوں نے قہقہے لگائے۔ ''پہن تو لی پر ناڑا باندھنا کیسے آئے۔ اس کملی کو....''

چنی اُن پر اُسی طرح حملہ آور ہوئی۔ جیسے چرواہوں پر ہوتی تھی یا اب خان نیازی پر دھاوا بول دیتی تھی۔

نوکرانیوں کی بھنبھناہٹ میں بڑی بی بی جی کی شیر کی دھاڑ نے باہر مرد ملازموں کو بھی لرزا دیا۔

''اتنا دیدہ اس کا کہ میرے سامنے حویلی میں دنگا فساد کر رہی ہے۔ اُٹھا کر باہر پھنچو اسے پاخانے کا چھوڑا، جوتی کا تلوا، کھولے کی وٹوانی۔''

صنوبر کے بدن کے روئیں بھی لرزتے تھے۔ چنی نے کس رعونت سے جواب دیا تھا۔ ''جا رہی ہوں وڈی ملکانی کیوں چیکتی ہے تو۔ میں کوئی نکی بی بی صنوبر ہوں۔''

کس قدر قابلِ رشک تھی یہ چناں۔ جو دن بھر ان آثاروں میں گھومتی جنھیں دیکھنے کی

حسرت صنوبر کی عمر جتنی طویل اور اُس کی ناکام حسرتوں جیسی شدید تھی۔

ہڑپا جہاں کوئی عالیشان تہذیب بستی تھی۔ جسے دیکھنے امریکہ اور یورپ کے گورے آتے تھے۔ وہ بغل میں رہتے ہوئے بھی آج تک دیکھ نہ سکی تھی۔ بچپن میں بھی کہیں کھیلتی کودتی بھول چوک سے وہاں نہ پہنچی تھی۔

یہ چناں اُس کے لیے کس قدر قابل رشک تھی۔ جو کہہ گئی تھی۔

''تو نے تو خان نیازی کو بھی نہیں دیکھا جس نے خان نیازی نہیں دیکھا۔ اُس نے جنڈڑی میں پھر کیا دیکھا۔''

صنوبر نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیرا ابھی تک اس کے بدن پر سیاہ جت تو نہیں اُگی تھی۔

لیکن اس جرم کی سزا جلد ہی اُس تک پہنچ گئی تھی۔ ماہواری کا دن گزر گیا تھا۔ ایک دن دو دن تین اوپر۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ جس ترسے ہوئے انداز میں چنی بار بار خان نیازی کا نام لیتی رہی تھی تو اس کا کوئی نتیجہ تو نکلنا تھا نا۔ آریا خان کا حمل اُسے ٹھہر گیا ہے۔

وہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتی تو پیٹ ابھرا ہوا صاف معلوم ہوتا جو کھاتی ابکائی آجاتی۔ جی متلاتا اور کبھی کبھی تو اُسے پیٹ میں کسی دوسرے وجود کی دھڑکن بھی سنائی دے جاتی۔

ہائے میریا ربا اب وہ کیا کرے گی۔

موت تو اسے آنی نہیں دعائیں اس کی قبول ہوتی نہیں۔ خودکشی کے لیے اسے کچھ دستیاب نہیں۔ اسے تو پرانی ٹاکیاں نہیں ملتیں۔ زہر کہاں ملے گا۔ اگرچہ انبار خانے کیڑے مار ادویات سے بھرے تھے لیکن اس کی جرأت کہ ہاتھ لگائے۔ اس کے تو غلیظ بال گرمیوں میں تکلیف دہ ناسور بن جاتے پسینے اور شدید حبس میں پھنسیاں اور پیپ بھرے دانوں سے وہ لتھڑ جاتی۔

لیکن ان سے نجات کی اُسے ہرگز کوئی صورت سمجھ نہ آتی۔ سردیاں تو سکون سے گزر

جاتیں لیکن گرمیوں میں جیسے بغلیں نہ ہوں دکھتے پھوڑے ہوں۔ جیسے جاہنگوں کے بیچ کوئی ناسور رکھا ہو۔

ایک بار اُس نے زندگی کی پہلی چوری کی۔ سلائی مشین میں رکھی قینچی چرالی اور کھولے میں لے جا کر جاہنگوں کے بیچ چپہ چپہ بڑھے گھنے بال کاٹ کر مٹی میں دبا دیے۔

لیکن بال کٹنے کے بعد اس قدر نوکیلے ہو گئے کہ سیہہ کے کانٹوں کی طرح چبھنے لگے۔ وہ کھولے سے نکلی تو لگا وجود میں ببول کی سولیں پروئی گئی ہیں لیکن اس تکلیف سے زیادہ یہ مسئلہ کہ اب قینچی کسی کی نظر میں آئے بغیر واپس اپنی جگہ پر کیسے پہنچائی جائے۔ اس نے قینچی نیفے میں اُڑس لی لیکن وہ اتنی بڑی تھی کہ چلتی تو وہ سامنے لاٹھی کی طرح اکڑ جاتی اور رکتی تو وہ جھنجھنا کر اپنی جگہ پر تھمتی۔ جب کھولے سے نکل کر صحن میں آئی تو سامنے برآمدے میں بڑی بی بی جی سات آٹھ مزارعیوں سے دھنکی ہوئی روئی کی پونیاں بنوا رہی تھیں۔ اب اُسے ان سب کے بیچ سے گزر کر اپنے کمرے میں جانا تھا۔ یعنی یہ کیسے ممکن تھا کہ گدھ جیسی مشک کی حس رکھنے والی یہ دس عورتیں اُس کے انگوچھے میں چھپی اتنی بڑی قینچی نہ دیکھ پاتیں۔ وہ تو شاید محض ذومعنی نگاہوں کے تبادلے کے بعد نظریں جھکا لیں گی لیکن بڑی بی بی جی نے کہیں دیکھ لیا یا جھنکار سن لی تو؟

وہ تو پھر یہ بھی نہ دیکھیں گی کہ یہ دس عورتیں سن رہی ہیں کیونکہ نگاہیں اُٹھا کر دیکھنے کی تو شاید انھیں ہمت نہ ہو گی۔ لیکن وہ کانوں میں روئی بھی نہ ٹھونسیں گی۔

اُس کا یہ گناہ کہ بغیر اجازت قینچی کو ہاتھ لگایا اور پھر اس راز کا افشا کہ کسی گناہِ کبیرہ کی سزا میں خدا نے اُس کا بدن بدنما پھوڑوں اور پھنسیوں سے بھر دیا ہے۔

وہ برآمدے کے پہلے کونے میں رکھی چارپائی پر بیٹھ گئی۔ قینچی کی نوک نیفے کو پھاڑتی ہوئی اس کے پیٹ میں مسلسل چبھ رہی تھی۔ جیسے تیز تلوار کی دھار نیام سے باہر آ گئی تھی۔ ذرا حرکت کی نہیں کہ پیٹ پھاڑ کر انتڑیاں باہر ابل پڑیں گی۔ پہر گزر گئے۔ نہ وہ اُٹھ سکتی تھی نہ

ہل سکتی تھی۔

سر کٹے ہوئے نوکیلے بال چبھ رہے تھے اور قینچی کی نوک پیٹ میں دھنس رہی تھی خوف کی لرزش اور راز فاش ہو جانے کا ڈر چہرے پر زردی بن کر لیپ ہو گیا تھا۔ پیاس سے خشک گلا اکڑ گیا تھا اور پپڑی جمے سفید ہونٹوں کے کنارے بھی جیسے معدوم ہو گئے تھے۔ تھرتھراتی ہوئی خوف کی دو پیلی زرد قاشیں منہ پر سلی تھیں۔

پونیاں بناتی عورتیں آنکھوں ہی آنکھوں میں سوال و جواب کر رہی تھیں آخر ماسی ستاں نے پیار سے کہا۔

"چھوٹی بی بی! پانی کا گلاس لا دوں پیاسی دکھتی ہو۔"

تو اس کا جی چاہا ماسی ستاں کے گلے لگ کر رو دے اور کہے خدا کے لیے مجھے کچھ ایسا لا دے ماسی! جسے کھا کر میں مر جاؤں مجھے تو خود سے مرنے کی بھی جرأت نہیں ہے۔ یہ میرے وجود کے ساتھ خدا کیا کھیل کھیل رہا ہے۔ عورتیں اپنے سامنے پراتیں اوندھائے تونبی ہوئی روئی کا پھاھا اوپر رکھتیں اور سرکنڈے کی باریک تیلی پر لپیٹ کر ہتھیلی سے اُسے پرات پر گھماتیں اور روئی جب پیڑی ہو کر بل جاتی تو اس میں سے تیلی باہر کھینچ لیتیں یوں ہاتھ برابر لمبی براق پونیوں کے ڈھیر چڑھ رہے تھے جنھیں چرخے پر کتنا تھا۔

اب تو صنوبر آریا خان کا قصہ سن چکی تھی۔ یہ گناہ تو اُس کے وجود میں ضرور کوئی نیا گل کھلائے گا۔ اور پھر وہی ہوا۔ اُس کے دن چڑھتے گئے تھے اور اسے یقین ہوتا چلا گیا تھا کہ آریا خان کا نام سنتے ہی وہ حاملہ ہو چکی ہے۔ اب ہر ہر پل وہ موت کی کوئی تدبیر ڈھونڈنے لگی۔ لیکن ہر تدبیر کے انجام میں وہ خود کو مرتے ہوئے نہ دیکھتی۔ موت اس سے اتنے فاصلے پر کیوں کھڑی منہ چڑا رہی تھی۔ خود کو چُھری سے ہلاک کرے تو گھر میں ساری چھریاں کند ہیں۔ گولی مارے تو بندوق پستول اُسے چلانا ہی نہیں آتے۔ کنویں میں

چھلانگ لگا دے تو سنا تھا کہ وہ پاٹ دیا گیا ہے۔ اب گندم میں رکھی چوہوں کی گولیاں اور کپاس پر کیا جانے والا اسپرے کارگر ہو سکتے تھے اور گاؤں کی تاریخ میں جو بھی دو چار خودکشیاں ہوئی تھیں وہ انہی کے استعمال سے ہوئی تھیں لیکن انبار خانے کو ہر وقت تالے لگے رہتے تھے اُسے ان اندھے کوٹھوں میں جانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ قیامت کے پانچ دن گزر گئے دکھ کے سات پہاڑ مزید سرک گئے۔ آٹھواں روز اُس کے آنسوؤں کا پورا مدفون ختم ہو چکا تھا۔ نویں روز اس کی دماغی حالت پر نوکرانیاں شک کرنے لگیں۔ دسویں روز کپاس کے اسپرے کی دو خالی ڈرمیاں کسی نے انبار خانے کے بند دروازے کے سامنے لا کر رکھ دیں یعنی قدرت راہ سجھا رہی تھی۔ جب اُس سے کچھ بھی سرزد نہ ہوا تھا تب بھی قدرت اس کے وجود کو تختہ مشق بنائے ہوئے تھی۔ اب تو جرم ہو چکا تھا، اُس کی سماعتیں کسی خان نیازی کے نام سے آلودہ ہو چکی تھیں۔ اس نے کپاس پر چھڑکنے والی خالی ڈرمی کو رات کی تاریکی میں تھوڑا سا پانی ڈال کر ڈرمی کی سطح پر لگے سارے زہر کو اکٹھا کر کے سوڈے کی بوتل میں بھر لیا اور مطمئن ہو گئی۔ بس اب پینے کا مرحلہ باقی تھا۔ خوفزدہ تھی کہ کہیں الٹی نہ آ جائے اور اس کا راز فاش نہ ہو جائے۔ اسے گاؤں کی وہ جٹی دھیان میں آئی جو دس برس سے بیوگی کاٹ رہی تھی اور ان برسوں میں اس کے تینوں بیٹے کڑیل جٹ جوان ہو گئے تھے۔ بی بی جٹی اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی پڑھی لکھی لگتی تھی۔

جب بھی وہ کسی کام سے حویلی میں آتی تو اُسے بیٹھنے کو پیڑھی پیش کی جاتی اور لسی سے تواضع کی جاتی۔ اسے دیکھ کر صنوبر کو احساس ہوتا۔ اَن پڑھ ہونے کا مطلب جاہل ہونا تو نہیں ہے۔ اس کے اردگرد ساری نوکرانیاں مزراعیاں جاہل تھیں لیکن بی بی جٹی کے چہرے پر، انداز و اطوار میں کہیں جہالت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ جیسے وہ کہیں اندر سے پڑھی لکھی ہو۔

پورا گاؤں اُس کی عزت کرتا، برادری میں اُسے پنچائتوں میں بٹھایا جاتا۔ اُس کی

رائے اور فیصلوں میں بھی کہیں کچھ پڑھا لکھا ضرور موجود تھا۔ شاید وہی پڑھا لکھا جو قدرت کبھی کسی شخص کو خود پڑھا دیتی ہے اور ماحول کی جہالت اس کے وجود پر سے مٹا دیتی ہے۔

شاید اس کی وجہ شوہر اور ساس کی تلخی ترشی سے پاک زندگی تھی کہ وہ کوئی کارنامہ انجام نہ دینے کے باوجود سب کے لیے قابلِ احترام تھی۔ وہ جواز خود کسی شخصیت کا رعب اس کی بات کا اعتبار اور رائے کا لحاظ پتا نہیں کیسے پیدا ہو جاتا ہے، اندر سے کہیں کچھ پڑھا لکھا پھوٹ پڑتا ہے۔ وہی اس کی شخصیت کا چہرہ بن گیا تھا۔

وہ دائی تھی۔ بچے جنوانا اور خاموشی سے جو محنت کوئی دے قبول کر لینا۔ شاید اس عزت کی ایک وجہ ہو۔ جس روز وہ نیلا تھوتھا کھا کر مری تو یہ خبر نجانے کہاں سے نکلی اور ہر سو پھیل گئی کہ وہ حاملہ تھی۔ اسی شرمندگی سے مر گئی۔

یعنی موت نے بھی اُس کی پردہ داری نہ رکھی اور غسل دینے والیوں نے ہر سو یہ راز افشا کر دیا۔ کیونکہ غسل دینے والیوں نے مردہ وجود میں بھی سب دیکھ لیا تھا۔

اُسے ڈر تھا کہ مر کر بھی اس کا راز بی بی جنتی کی طرح کہیں افشا نہ ہو جائے۔ اُسے یقین تھا کہ ایسا ضرور ہوگا، اُس کا پردہ تو کبھی خدا نے نہیں رکھا غسل دینے والیاں کیونکر رکھیں گی کہ اسی روز حمل ضائع ہو گیا۔

وہ خون جس کے خارج نہ ہونے کی وہ سارا مہینہ دعائیں کیا کرتی تھی اب اس کی نوعیت جاننے کے بعد اس کے خروج سے ایسے خوش تھی جیسے دست پناہ کے ساتھ کسی نے اُسے موت کے بھیانک حلق سے باہر کھینچ لیا ہو لیکن اُسے واہمہ سا ضرور رہا کہ اُس کے پیٹ میں خان نیازی کے نام والا حمل تھا جو ضائع ہو گیا۔

▪▪▪▪

اب تو چناں کو شلوار مل گئی تھی۔ جو اتنی لمبی تھی کہ پائنچے پیروں تلے گھسٹتے رہتے تھے

لیکن دھوتی کے ٹکڑے سے بہتر تھی کہ ساتھی چرواہوں اور چھوٹوں سے دھینگا مشتی کے دوران ذرا مشکل سے ہی اُترتی تھی۔ دھوتی تو پہلے ہلے میں ہی یہ بدتمیز لڑکے کھینچ وہ مارتے لیکن شلوار کی گرہ باندھنا اس کے بس میں نہ تھا۔

ایک بار بندھ گئی تھی تو بس اُسے کھسکا کر رفع حاجت کے وقت گرہ کھولے بنا نیچے اُتار لیتی اور پھر چڑھا لیتی دو چار دن میں گرہ اتنی ڈھیلی ہو چکی تھی کہ چوتڑوں سے اُترتی رہتی اسے ہاتھ سے قابو کر کے رکھنا پڑتا اور دھینگا مشتی کے دوران اکثر گھٹنوں تک چلی جاتی تو لڑکے خوفزدہ ہو کر الگ ہو جاتے۔ اُس کے تبدیل ہوتے جھاڑ جھنکار سے ڈر جاتے۔

''گندی بھتی بو ماری۔''

وہ شلوار چڑھا کر دوبارہ مقابل آ جاتی۔ اس انتظار میں کہ ہر بلوے پر وہ خان نیازی دوڑا چلا آتا۔ اور دور سے ڈپٹتا۔

''اوئے کتیک وادھا۔''

''ہم اس کے کبھی کب پڑتے ہیں۔ یہ خود ہی ہمارے گلے پڑ جاتی ہے۔'' لڑکے اپنی صفائی پیش کرتے جیسے یہ خان نیازی کوئی چودھری ہو کہ تھانیدار صاحب۔

چنی دھول کے طوفان اُٹھاتی اس کے پیچھے لپکتی رشید خان اپنی رہائشی کوٹھری والے ٹیلے کی سمت بھاگتا اور اندر سے کواڑ بھیڑ لیتا۔

''ڈر گیا، ڈر گیا''، وہ بھوتنی سی قہقہے لگاتی ''اتنا بڑا خان نیازی آریا خان چنی سے ڈر گیا۔ بھاگ گیا۔''

وہ اس کے نام بگاڑ بگاڑ کر آوازے دینے لگتی۔

اوئے شیدو.... اوئے خانو.... اوئے آریو....

لیکن یہ سب بگاڑ اُس کے نام کے تو تھے ہی نہیں۔

البتہ شیدو، خانو، دوڑے چلے آتے۔

''کیوں بلاتی ہے کہیں درد ہو رہا ہے تیرے۔ بہتی تکلیف ہے۔ ٹکور کر دیں تتے وٹے سے۔''

جب سے خان نیازی آیا تھا۔ وہ خود بخود ان ذو معنی جملوں کو سمجھنے لگی تھی۔

''جاؤ اپنی ماؤں کے ٹکور کرو۔ اپنی بہنوں کے تتے وٹے رکھو۔''

بالی تالی بجاتی۔

''سیکھ گئی ہے۔ چھوکری سیکھ رہی ہے۔

سیکھے گی نہیں تو مفت میں بٹ جائے گی۔''

▪▪▪▪

ملنگ

مدفونوں کے قدموں میں بچھی اس ذرا سی بستی پر اندھیرا چاروں اطراف سے اترا تھا۔ جیسے سیاہ گھوڑوں پر سوار سیاہ نقاب پوش حملہ آور ہوئے ہوں۔ اچانک اور یکبارگی.... بالی کی کوٹھری آج خالی تھی۔ آثاروں میں تو ہفتہ وار تعطیل تھی۔ سارے پہرے دار تو اپنی تلے کی تارسی دلہنوں کے پہلو میں میٹھی نیند سوئے تھے۔ دھت کالی کوٹھری میں ٹمٹماتے دیے کی واٹ تیل کا آخری تومبا چوس کر بجھ گئی تھی۔ جیسے محتاج بھاگاں کی آنکھوں کے دیے نور کا آخری تومبا چوس کر نجانے کب کے بجھے تھے۔ لیکن اندازے اور تخمینے جاگتے تھے۔ جیسے ہڑپا کے مدفونوں میں دفن بجھی چنگاریاں جن کے اندازے اور تخمینے ہر کوئی اپنے حسابوں لگا تا رہتا تھا۔ پہرے داروں سے لے کر آرکیالوجسٹ تک۔ ریوڑوں کی اُڑائی ہوئی دھول میں، مضافات کی دھند میں پل پل دور بھاگتے سراب خالی پڑے تھے بس آسیب جاگتے تھے۔ بھاگاں محتاج نے باچھوں کے کناروں ہاتھ کی اوک بنائی "ونتر بالی! چنی تیری کوٹھی میں ہے کیا؟"

"نہ ماسی وہ تو ابھی ہٹی ہی نہیں نہ ہی اس کا اجڑ مڑا۔" بالی نے کوٹھری میں بھری تاریکی سے چہرہ باہر نکال کر آسمانوں سے گرتے دھواں دھواں اندھیرے میں لونگ والی

تیکھی ناک پھلائی جیسے چنی والی بو سونگھتی ہو۔ پھر ریوڑ کی پشم والی مہک اس نے پالی۔ دونوں نتھنوں کی درمیانی ہڈی میں پڑے بلاک کی مچھلی جھنجھنائی۔ ان دیہاتیوں کو سونگھنے سننے مٹی اور عناصر فطرت میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی اور یہاں حیات کرتے جانداروں کے اذہان اور ارادے کی ہر حرکت کو وقوع پذیر ہونے سے قبل ہی سمجھ جانے کی عجب خو قدرت نے بخشی ہے۔ نقشِ قدم سے وجود کی ہر کیفیت اور سانس کی ہر حرکت کی شناخت تک فضا ہوا کو سونگھ کر وہ بتا سکتے ہیں کہ اردگرد کون موجود ہے۔ یا گزر گیا ہے۔ یہ خراٹے کون لے رہا ہے اور سانس کی گرمی جو ہوا میں گھلی ہے تو یہ کس کی ہے۔ یہ چھینک یا ہنکورا کس نے مارا ہے۔ ان کے محسوسات نابیناؤں سے تیز ہوتے ہیں کہ انھیں فطرت کی گھٹی ملی ہے۔ خارج سے مصنوعی ان دیکھا ان جانا کچھ بھی ٹھونسنے کی قبولیت ہی نہیں ہے۔

چناں کا ریوڑ لٹے قافلے کی مانند انے وا اپنے باڑے کی پناہ گاہ میں گھسا تھا، جیسے پیچھے بھیڑیا لگا ہو۔ جس نے ایک ادھ بھیڑ بکری چیر پھاڑ ڈالی ہو۔

''ماسی اجڑ تو پہنچ آیا پر چنی.... ای.... خبرے.... اے۔'' بلاک والی تیکھی ناک پر سوچ کی انگلی دھری رہ گئی جیسے کہتی ہو۔ دیکھا نا مفت میں بٹ گئی۔ کہا تھا۔ چار چھلڑ کھرے کر لے۔ بھاگاں محتاج ایک ہاتھ سے نیلی دھوتی کے ڈب اڑستی دوسرے سے ٹوہنی گھماتی دن بھر کی مشقت سے تھکی ہاری استراحت کرتی دھول میں ننگے پیروں فٹ فٹ بھر گہرے موگھے بنانے لگی۔

جیسے چنی کو نگلنے والی یہی صدیوں پرانی ہڑ پائی مٹی ہو۔ جس پر وہ لٹھ لے کر حملہ آور ہو گئی ہو۔

بالی کے سونگھتے نتھنوں سے پھنکار سی چھٹی۔ ''کہاں جائے گی۔ اس انی بولی رات میں تو ٹھہر میں دیکھتی ہوں ماسی....''

محتاج نے سانس اندر تک کھینچ کر چنی والی مہک کو دماغ تک پہنچایا۔ ''نہ میرے

دیدوں میں کوئی چانن بچا ہے جو دن چڑھے دکھ جائے گا۔ اس انی بولی رات میں کیا جھن چڑھا گئی تو چنی ادھل گئی۔

کہ کسی کے پیچھے نکل گئی باپ کی طرح کہ کوئی بندھی بنا لے گیا۔

نی چنی، وڑ چناں، او چنو.....''

گھپ رات کی گم خاموشی کو چیرتی آوازیں.... ڈھنڈاروں کی ہولنا کی، ڈھنڈاروں میں اوندھائی۔

''کس کھو میں گرمری۔ نوگزے والے ٹبے میں دھڑک مار گئی۔
سر کھل گیا کہ ٹانگیں ترٹ گئیں۔''

بالی نے جیسے بین کا انترا اٹھایا۔

''وہ خان نیازی تو تجھے ساتھ بھگانے سے رہا۔ بھگیاڑوں نے چیر پھاڑ کھائی کہ سؤروں نے تیکھی کنسیوں سے کھو مچھ لی کہ ساہ پیونا ساہ پی گیا۔''

بالی نے ٹین کے دیے کی واٹ والا حصہ کھولا اور کپی میں تیل ٹپکایا اور ہاتھ کی اوٹ دے کر دھول کے اندھے سمندروں میں اتر گئی۔ منوں ٹنوں باریک سفوف جس کے اندر پانچ ہزار سال پرانی ترقی یافتہ تہذیب سوتی تھی۔ جس کے چاروں اور دس ہزار سال پرانی رہتل آج بھی اسی ابتدائی ڈھنگ سے جیتی تھی۔

''نہ ماسی لگتا ہے ڈھنڈاروں کے اندھے کھو میں ڈھ گئی کہ منڈی والے ٹیلے سے لڑھک گئی۔ کیا جانوں پکی پٹڑی پر نج کر سر کھل گیا ہو کہ راہ وسر گئی ہو۔''

صدیوں کے دکھوں نے اس ابتدائی نسلِ انسانی کے گلے میں حزن بھر دیا تھا۔ جو بینوں کے کھرج میں پوری فضا کو سوزگار بنا تا تھا۔ بالی بہلاوے والی دلیلیں دیتے دیتے جیسے خود ہی ان کی گردن مروڑتی ہو۔

''نہ چپہ چپہ گھاہ چھوڑا تھا اس کے کھروں نے۔ کیوں گرتی۔ کیوں رستہ بھولتی۔

آنکھیں میٹ کر سارے ڈھنڈار جھاگ جائے۔ سارے بے ٹیلوں میں ٹھل جائے۔ نہ وہ کیوں راہ وسرے۔''

بھاگاں محتاج نے بین کی سوچ کو آگے بڑھایا۔

''سوتے کی بانگ ہوئے پہر دو ٹپ گئے۔ جیتی ہوتی تو مڑ آتی یا بھگیاڑ چیر پھاڑ گئے یا کوئی بندھی بنا لے گیا۔ ہوتی تو مڑ آتی۔''

بھاگاں محتاج جیسے بین کے آخری نتیجہ خیز بند پر چھلانگ لگا کر پہنچ گئی ہو۔ سیاہ دھوتی نیلی قمیص اور کالی چادر میں لپٹی وہ بانہیں الارنے لگی۔ ''ونڑ چیتاں بھگیاڑوں نے تیری بوٹی بوٹی تیکھے تیز دانتوں سے بھنبھوری ہوگی۔ کتنا لہو نکلا ہوگا۔ کتنی ہڈیاں کڑکی ہوں گی۔ کتنی چیخیں ماری ہوں گی تو نے۔ نہ کسی نے سنی ہوں گی۔ نہ کوئی پہنچا ہوگا۔ ونڑ چیتی، ونڑ چیتاں۔''

اندھی ماں کے بین کھنڈروں کی پختہ اینٹوں پر منہ کے بل بجتے تھے۔ گپھائیں بنائے کھڑے جنڈ ریکائینں جنھیں اپنی گھنی جٹاؤں میں راز کی طرح لپیٹے تھے۔ جن میں کھنڈر ہڑپا کا آسیب جاگتا تھا۔ عجائب گھر میں ٹمٹماتا بلب یکدم تڑک کی آواز سے فیوز ہوگیا۔ ڈھنڈاروں کے پانچ ہزار برس کے بوجھ سے لدے اندھیاروں کو اجالنے کی کوشش میں بےبس ہوگیا ہو جیسے۔

جو خلقت یہاں کبھی نسل در نسل بستی تھی۔ اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنی خاک کو اڑاتے ہوکارے نوگزے والے ٹیلے پر چڑھے اور دھول کے بادل کی طرح برسے۔

''چیتاں ونڑ چیتی، نی چینو۔''

اللہ لوگ سرمستی و خود فراموشی کی بکل میں لپٹے تھے۔ اوائل شب کے چلے نے بدن میں اتنی بھی طاقت نہ چھوڑی تھی کہ آنکھ کھلے کہ وجود جنبش کرے۔ وہ پانچوں اللہ لوگ مست ملنگ جنھیں ہر بھول چوک معاف تھی۔ جن کا کوئی فعل کسی شرع قانون کی ذیل میں پکڑ نہ رکھتا تھا۔ وہ برہنہ رہیں گالیاں بکیں۔ کوڑے ماریں بھنگ چڑھائیں کہ حشیش سلگائیں۔ وہ اپنے

کسی فعل کے جوابدہ نہ تھے کیونکہ وہ پہنچے ہوئے اس مقام پر تھے جہاں سے خود انھیں اپنی خبر نہ آتی تھی۔ عام مخلوق اس درجے کو پالے تو گردن زدنی ٹھہرے۔ لیکن انھیں ہر شرع، ہر عبادت، ہر اخلاق، ہر کردار، ہر عمل کی عام معافی تھی۔ تمام سماجی اخلاقی حدود سے اتم۔ ان کا ہر فعل ان کی پہنچ کی علامت۔ ہر بے خبری معرفت کا درجہ، ہر شرک فنافی اللہ، ہر وہ فعل جس کی دنیا میں تعزیر مقرر ہے۔ جنتیوں کے لیے آخرت میں وہی انعام کی صورت موجود ہے۔ تو پھر دنیا میں پہنچے ہوؤں کے لیے انعام کیوں نہ ہو۔ جیسے جنتی دسترخوانوں پر سجے تیتر، بٹیر، دودھ، شراب اور ناکتخدا حوریں۔ اسی طرح زمینی دسترخوانوں پر چڑھاوے، ہدیے، بھرے ہوئے غلے، بھنگ حشیش اور چنی جیسی مریدنیاں۔

یہ خدائی انعامات ہیں ان پر اعتراض کیسا، وہ جسے چاہے نواز دے جسے چاہے بخش دے۔ جسے چاہے دے اور پھر لٹا لے۔ اعتراض تو انسانی فیصلوں پر ہوتے ہیں کہ انھیں بدلنے کی گنجائش رہتی ہے۔ خدائی فیصلوں پر اعتراض تو تقدیر سے لڑائی ہے۔ وہ جسے جس سطح پر رکھتا ہے وہ اسی قابل ہوتا ہے۔ وہ کسی کو اس کی ہمت سے زیادہ نہیں آزماتا۔ چنی کو بھی اس کی طاقت سے زیادہ نہیں آزمایا گیا ہوگا۔ تعزیر، تقدیر، رزق، بھوک، سزا جزا، موت زندگی، اچھا برا، سب روزِ پیدائش ہر ایک کے ساتھ اس کا سربہ مہر لفافہ روانہ کر دیا جاتا ہے۔ جو مقسوم گھڑی پر باری باری سب موصول ہوتا رہتا ہے پھر پریشانی کیسی۔

''ونڑ چناں۔ نی چنو.... او چنی....''

کھنڈروں میں بچھی آب دوز نالیوں میں بہتی یہ صدائیں چناں کے کانوں میں اندھے جالوں کی صورت لپٹتی تھیں۔ جیسے چمگادڑوں کے باریک سیاہ پروں کی سنسناہٹ۔ لیکن دن بھر کی چیخوں کوکوں نے حلق میں سیسہ بھر دیا تھا۔ اٹھنے بولنے کی ساری طاقت تو وہ مست ملنگ پہنچے ہوئے بابے اپنے جنتی وجودوں میں کشید کر کے لے گئے تھے اور منحنی سا وجود خالی مشکیزے سا چڑمڑ چمڑا چھوڑ گئے تھے۔ پہلے بالی ہی پہنچی تھی۔ دیے کی

اولین کرنیں تجوری جیسے خانوں والی نکی بنیان کے جگ مگ موتیوں پر پڑی تھیں۔ جسے وہ کل سے ڈھونڈ رہی تھی۔ جوانہی پہرے داروں میں سے کوئی ساہیوال کی صنعتی نمائش میں سے بڑی مہنگی خرید کر لایا تھا۔

بالی نے چنی کے نتھنوں کے سامنے تین انگلیاں لہرائیں اور خوشی سے چیخ سی ماری۔

محتاج چیخ کی شدت سے دو قدم پیچھے لڑھک گئی۔ جیسے کوڑیوں والا پنڈلی سے لپٹ گیا ہو۔

"جیتی ہے ابھی ساہ آتا جاتا ہے۔ ماسی لبھ گئی۔ اللہ سائیں تیرا شکر لبھ گئی۔ جیتی جاگتی لبھ گئی۔"

"وڑ چنی! ہوا کیا۔ ٹیلے سے گر ٹانگیں تڑوا بیٹھی کہ آنکھوں کا نور گنوا بیٹھی۔ یہ بولتی کیوں نہیں، جیب پر دو موہنی ڈنگ مار گئی کیا۔" منحنی سی اندھی بھاگاں کے منہ میں اتنا بڑا حلق نجانے کہاں سے کھل گیا تھا۔ بین ڈھنڈاروں پر یوں بجتے تھے۔ جیسے تاریکی کے بطن سے پتھروں کی بوچھاڑ ہوتی ہو۔ ارزل طبقے کی نشیبی رہائش گاہیں اعلیٰ طبقے کے محلات، منڈی بازار سب گونجتے تھے۔

"اری بول ہوا کیا۔"

"ہونا کیا تھا ماسی! وہی جو ایک نہ ایک روز تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ ساریوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ کل کا ہوتا آج ہو گیا۔ پہلی بار تو پیڑا سہنا ہی پڑتی ہے نا۔ پھر عادت ہو جاتی ہے۔ چپ کر ماسی! کچھ نویکلا نہیں ہوا اس کے ساتھ جیتی ہے۔ موئی نہیں ابھی۔"

"پر کیا کس نے..... اس کھوتی کے ساتھ یہ برا بھلا..... کہتی تھی ڈھنڈاروں میں اجڑ نہ لے جایا کر نہ ہنیرا پڑے باہر نکلا کر، پر آگ لگی تھی جوانی والی اس کے پنڈے میں۔ بجھالی آج ٹھنڈ پڑ گئی۔ بول کون تھا۔ ماہنا، لاہنا، سوہنا۔ کون کون بولتی کیوں نہیں۔"

محتاج بے نور دیدوں سے چور کا کھرا دماغ کی اندھی کوٹھی میں ڈھونڈتی تھی اور فضا میں دو ہتھڑ مارتی تھی۔

بالی نے نچی کھرچی چنی کی لوتھ کندھوں پر سوار کر لی اور ڈھنڈاروں کی پکی پٹڑی کی

ڈھلان پر دوڑنے لگی۔ سر پر لدے وزن کی وجہ سے رفتار میں جو تیزی آجاتی ہے۔ وہی
اس کے مضبوط قدموں میں بھر گئی تھی۔ ”ماسی نام جان کر تو کرے گی کیا۔ کسی نہ کسی نے تو
پہل کرنی ہی ہوتی ہے نا۔ جیسے کوڈی میں پہل ہوتی ہے۔ واڈی میں، گدے میں۔ جیسے تنور
میں روٹیوں کا پہلا پور لگتا ہے۔ پہل تو کوئی نہ کوئی کرتا ہی ہے نا۔ آج نہیں تو کل....“

بالی نے چنی کی زخمی لوتھ کندھوں سے اتار کر کوٹھری میں پھینکی۔ چمگادڑوں کا جھنڈ باہر
کھلے میں شب بسری کے بعد کوٹھری کی گپھا میں گھسا اور سرکنڈوں کی چھت سے لٹکتے
سروٹوں سے چپک گیا۔ پوری چھت بڑے بڑے پھیلے پروں سے سیاہ ہوگئی۔ دیواروں پر
رینگتی بالشت بالشت بھر کوڑھ کرلیاں ساکن ہوگئیں۔ مٹی سے اساری اناج کی مٹکیوں تلے
گھسے چوہے لکن میٹی کھیلنے لگے۔ بالی نے چڑمڑ چنی کے بوسیدہ کپڑے کونے میں پھینکے اور
نکی بنیان انگوچھے میں پھنسا لی جسے وہ کل سے ڈھونڈ رہی تھی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے
مارے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ بھرے تھنوں والی بکری کی ٹانگیں گھٹنوں میں دبا کر
مونگر میں دھاریں چوائیں اور چنی کے منہ سے چتر کاری والا کانسی کا مونگر لگا دیا۔ وہ
غٹاغٹ پی گئی۔ جیسے عمر بھر کا کھایا پیا نچوڑ لیا ہو سب نے مل کر اور خالی کھوکھا چھوڑ دیا ہو اور
وجود کے اس خالی کنستر میں اب کچھ بھی بھرا جا سکتا ہو۔

محتاج بھاگاں نے چمگادڑوں سے لپی سرکنڈوں کی چھپری میں ہاتھ گھمایا اور چھت
میں ٹھنسی میل خوری چادر اندازے سے باہر کھینچ لی اور چنی پر پٹخی۔

”اٹھ چل آگے لگ۔“

چنی کو چارپائی سے کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ تازہ لہو کا پرنالہ چھٹا اور کوٹھری کی کچی تمن پر
لوتھڑوں کی شکل میں جم گیا۔ سیاہ اور بھوری چیونٹیوں کی قطاریں برآمد ہوئیں اور گول گول
دھبوں کے گرد دائرہ بنا اندھے منہ لہو میں گھسیڑ لیے اور یوں ساکن ہوگئیں جیسے لہو کے دریا
میں ڈوب کر مر گئی ہوں۔

پہلے تو چنی محتاج کی ٹوہنی بنتی تھی۔ آج محتاج بھاگاں چنی کی ٹوہنی بن اسے کھینچے چلے جاتی تھی۔ جیسے بیمار بھیڑ کی رسی قصائی کھینچتا ہو۔ منہ سے رالیں، ناک سے جھاگ اور پشت سے بوکن چھڑکتی ہوئی جس کی اون اور پیچھا غلاظت سے لتھڑے ہوں لیکن جو ابھی بھی اونے پونے بک سکتی ہو۔

حویلی کے وسیع و عریض صحن میں ابھی لسی لینے والیوں کا جمگھٹا لگا تھا۔ جو ریڑکے کی تھم تھم مدھانی کے ردھم میں دور پرے دیوار سے لگی اپنے اپنے کجے یا بلٹوئی کی اوٹ میں یوں دم سادھے بیٹھی تھیں کہ بولیں تو چاٹی میں اچھلتے مکھن کے پیڑے پھوٹ پڑیں گے۔ جب لسی کی سطح پر مکھن کی سفید سفید جھاگ چڑھ آئے تو بولنا منع ہوتا ہے نہ صرف بولنا بلکہ کسی عورت کا سایہ بھی نجس سمجھا جاتا ہے۔ ماہواری والی تو کوسوں دور رہتی ہے۔ یہ ماہواری بھی کیسی غلیظ شے ہے۔ نماز روزہ تو منع ہے ہی مسجد درگاہ میں پیر دھرنا اسے ناپاک ہی نہ کرتا بلکہ جرم کی جرأت کرنے والی بھی عمر بھر کے لیے گنہگار ٹھہرتی ہے۔ عجب غلیظ شے ہے یہ حیض بھی۔ جو نسل انسانی کی بقا کا ضامن ہے اس غلاظت، شرم اور ناپاکی سے جنم لینے والے پاک لیکن اصل ناپاک۔ کسی درخت پودے پر اس ناپاک کا سایہ پڑ جائے تو وہ سڑ جائے۔ دودھ مکھن گھٹ جائے۔ کسی دوسری پر سایہ پڑے تو اس کے بال جھڑ جائیں۔ لیکن خود ڈھیٹ۔ ہر مہینے اچھی بھلی اس غلاظت کو چھڑا کر آپ ستھری نکل آئے۔

حیض والی ہی نہیں مکھن چڑھنے پر تو ہر عورت اپنی زبان دانتوں تلے اور چاپ پیروں تلے داب لیتی ہے۔ ورنہ دودھ مکھن کی بے حرمتی ہو جاتی ہے اور ناراض ہو کر اپنا وجود مختصر کر دیتے ہیں۔ بڑی بی بی جی نے چھوئی کی اوٹ کر کے آدھ آدھ سیر کے تین پیڑے مکھن والے پتیلے میں اوپر نیچے رکھے۔ جس میں پہلے ہی دس بارہ پیڑے بھرے ہوئے تھے اور فی الفور سفید ململ کے کپڑے سے دیگچے کا منہ باندھ دیا کہ کہیں نظروں سے نکل نہ جائے۔ چھپی شے کو جھٹ نظر لگتی ہے۔ دوسریوں کی نظروں سے بچا کر آئے کی مٹھی

دیگچے میں ڈالی اور عالی ماچھن کو حکم دیا۔

''مٹھی دھیمی آگ پر رکھ، منہ پر بھار دے چھوڑ، دھیان رکھنا ابال کھا کر رُڑھ نہ جائے۔ نیچے دو گوہوں کے بیچ کیکر کی پکی مڈھی لگا دے۔ چھڑیوں کی چل پل آگ پر مت دھرنا۔''

اس سارے عرصے میں بھاگاں محتاج ریڑکے اور مکھن کے احترام میں دیوار سے لگی تھر تھر کانپتی اور جھڑ جھڑ بہتی چنی ایک دوسری سے چپکی چپ بیٹھی تھیں۔ لسی کے انتظار میں بیٹھی عورتوں میں بھی کسی بھنبھناہٹ کی جرأت نہ تھی۔ محتاج حالات کا اندھا جائزہ لے رہی تھی۔ لیکن دودھ مکھن کے احترام میں اپنے ہی وجود میں سسک سسک کر بہہ رہی تھی۔

جب بڑی بی بی جی نے کرخت حکم دیا۔

''لے آؤ اپنے بھانڈے نیڑے نیڑے۔''

لسی لینے والیوں کے وجود یوں بھنبھنائے جیسے مدھ مکھیوں کا چھتہ چھڑ گیا ہو۔ بلٹوئیوں، گاگروں کمنڈلوں، کجیوں، گڑوئیوں کی کھنک کے ساتھ ہی محتاج کے حزنیہ کھرج والے گلے میں بینوں کے باٹ آنسوؤں میں پگھلنے لگے۔

''لٹ گئی۔ ھال اوئی بادشاہ زادی مشومنی لٹ گئی۔ نیائے کر مجھ انی بوری کے ساتھ انصاف کر۔''

عورتیں لسی بھرے برتن سر پر رکھے یا کچھڑ چڑھائے ماں بیٹی کے گرد دائرہ بنا گئیں۔ جیسے آج صبح سویرے ہی لذیذ ناشتہ تیار مل گیا ہو۔

''بھاگاں بند کر یہ رولا رپا ملک جی اندر سوئے ہیں۔ ناراض ہوں گے۔ سانبھ کے رکھتی نہیں ہیں ان گندیوں کو اور مقدمے اٹھا کر یہاں لے آتی ہیں ویلیاں۔''

بڑی بی بی جی نے بڑبڑاتے ہوئے چاٹی کا منہ مزید نہورایا کیونکہ چاٹی میں لسی مزید کم ہو گئی تھی۔ اور گم صم چنی کے گرد جھمگٹ کو ڈپٹا۔

''لے آؤ باری باری اپنے اپنے بھانڈے اور جاؤ گھر وگھری چسکے لے رہی ہیں جیسے

ان میں سے تو کبھی کسی کے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو۔''

''ہائے بڑی بیبی! انی بولی رات اچ ہنیر مچا تانیں تے مشومنی نال برا بھلا کیتا نیں۔''

''کس نے کیا۔''

بی بی جی نے کجا آدھا کر کے پکڑا یا.... جیسے اس اطلاع کی سنگینی کا کوئی اثر ہی نہ ہو۔ ریڑ کے کے وقت ایسے مقدمے تو معمول تھے۔

''بول بتا کس نے کیا یہ سب۔ آپ ہی بتا''

محتاج نے چنی کی پیٹھ میں اندازے سے دھموکا مارا۔

''آپ بتا خود پر گزری آپ سنا۔ اپنی ہڈ بیتی آپ سنا کر ماں سڑی۔ بخت پٹی آپ بتا۔''

پر سوز حلق کے دلگداز بین جیسے خونِ جگر سے سنے ہوں۔

''جی بی بی جی برا بھلا ہوا قلندروں نے کیا۔ میرے ساتھ کیا.... برا بھلا....''

چنی نے یوں اطلاع دی جیسے کہتی ہو:

یہ اندھی ماں تو پرانے زمانے کی ہے یونہی رولا ڈال رہی ہے۔ ڈھنڈاروں میں تو ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ آج نہیں تو کل ہونا تھا ہی۔ لیکن لسی کے انتظار میں ساکت بیٹھی عورتوں لڑکیوں، نابالغ بچیوں میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ جیسے گڑ کی بھیلی پر استراحت کرتی مکھیوں کے جھنڈ کو کسی نے پنکھا جھل کر اڑا دیا ہو۔ برتنوں کی کھٹ پٹ، آوی کے پکے کچے، سلولائیڈ کے دیگچے، پیتل کی بلٹوئیاں، جھجھریاں، کمنڈل، تانبے کی بند ڈھکن والی سرسائیاں، جگ اور کلائی کلائی بھر لمبے چتر کاری گلاس اور گڑوئیاں۔ پرانی اور نئی بیاہی عورتوں کے جہیز کے برتن باہم ٹکرانے لگے۔ بالکل اسی طرز کے ظروف ہڑپا کے عجائب گھر کی الماریوں میں بھی بند پڑے تھے۔ جو زہر میں بجھے تھے اور جنھیں چھونا منع تھا۔ پتا نہیں کیوں ورنہ تو انہی جیسے یہاں ہر گھر میں استعمال ہو رہے تھے۔

صنوبر نے کھڑکی کی جھیت میں سے باہر تاکا۔ اس تنکے کی سی دراڑ میں سے اس قدر

مکمل اور پورا منظر۔

عورتوں کے جھرمٹ میں گھری چنی، چاٹی پر مٹھیاں بھر بھر لپی ہوئی مکھیاں۔ لاوارث پڑے لسی والے انواع واقسام کے برتن جن کی حفاظت ان کی مالکائیں بھول چکی تھیں۔ جن پر مکھیوں کے پرے آزادانہ بھنبھنارہے تھے۔ لسی کی سطح پر چند ایک مریل سی تیرتی ہوئیں۔ سامنی دیوار پر دھوپ چڑھ آئی تھی جو ابھی فرشِ زمیں پر نہ اتری تھی۔ کھڑکیوں، دروازوں اور دیواروں پر بکھری دھوپ کو مکھیوں کی سیاہی دھندلا رہی تھی۔ جیسے شب بھر کی ٹھٹھری ہوئی مکھیاں مری مری سی سورج کی گرمی سے زندگی کی حرارت اپنے وجود میں بھرتی اور سیاہ غلاظت پوتتی ہوں۔

البتہ چنی لڑکیوں عورتوں میں گھری دکھائی بھی نہ دیتی تھی۔ نجانے وہ کس اعزاز سے آج سرفراز ہوئی تھی کہ یوں مرکزِ نگاہ تھی۔ اگر صنوبر نظارہ کرنے کو باہر نکلتی بھی تو بی بی جی اسے گھور کر واپس کمرے میں بھجوا دیتیں۔ وہ کسی بھی وقوعے کی شاہد کیسے ہوسکتی تھی۔ لیکن یہ نادار لڑکیاں تو آزاد شہزادیاں تھیں۔ جنھیں بولنے سننے دیکھنے کی کھلی اجازت تھی۔ تمام تر مفلسیوں اور جبر کے باوجود ان کی حیات ان سے کوئی چھین نہ سکتا تھا کہ چودہ پندرہ برس کی عمر تک وہ زندگی کے تمام ذائقے چکھ لیتی تھیں۔ صنوبر کے کانوں میں مکھیوں کی بھنبھناہٹ ایک بامعنی صوت میں ڈھل رہی تھی۔

برا بھلا، بھلا برا۔

لسی والی چاٹی کا منہ سفید ململ کی دھجی سے بندھا تھا۔ جس پر مکھیوں کا جمگھٹ چڑھا تھا کہ سفید کپڑا سیاہ چھتہ معلوم ہو رہا تھا۔ اتنی ہی چیونٹیاں چنی کے پیروں پر بھی چڑھی تھیں۔ جو لہو کے جمے ہوئے اور تازہ ٹپکتے قطروں کو مسلسل چوس رہی تھیں۔ ان کی سرخی کو زردی میں تبدیل کر رہی تھیں۔

بڑی بی بی جی نے ڈپٹا۔

''نہ جو اس کے ساتھ ہوا ہے تم میں سے تو کبھی کسی کے ساتھ نہیں ہوا تھا نا۔ دفع دور اپنے اپنے کام سے لگو۔ چاٹی مکھیوں سے ترکی ہوئی ہے۔ اس کے منہ پر دورہ دھرو، چولہے راکھ سے اٹے ہیں۔ صحن گھٹے سے بھرے ہیں۔ سارا گھر کھلرا پڑا ہے۔ ڈاہڈے چسکے۔''

نوکرانیاں چنی کے چھتے سے اڑ کر اپنے اپنے کام کی سمت بھاگیں۔ کسی نے آوی کا پکا ہوا دورہ اٹھا کر چاٹی کے منہ پر اوندھا دیا۔ مکھیوں کا قافلہ آدھ فٹ اوپر اڑا اور پھر دورے پر استراحت کرنے لگا۔ اور ذرہ ذرہ گندگی کے سیاہ نشانوں سے اسے فی الفور لیپ دیا۔ مزید ایک جھنڈ چنی کی لوتھ پر بھنبھنانے کو رخ بدل گیا اور لہو کی سرخی پل پل میں چوس چوس کر زردی میں تبدیل کر دی۔

کاڑھنی کے سوراخوں سے اوپلوں کا گاڑھا گلا گھوٹو دھواں بگولوں سا لہراتا دھوپ میں تپتے بنیروں پر چڑھنے لگا۔

مکھن کے پگھلتے پیڑوں پر سفید سفید لسی کی جھاگ چڑھ آئی تھی۔ جس کے نیچے پیلا زرد گھی ابلتا تھا۔ دیگچے کی تہہ میں آٹے کی مٹھی سے چکنی لئی سی بن رہی تھی۔ جب اوپر سے گھی نتھار لیا جائے گا تو پھر اس میں شکر اور سوجی یا آٹا ڈال کر نوکرانیاں حلوہ بنالیں گی۔ جو صنوبر کو بھی پسند ہے۔ جس میں آن ٹپکنے والی مکھیاں موت گھاٹی میں سے زندہ باہر نہ نکل پائیں گی۔ چمچہ چلانے کو جونہی تھالی ہٹتی تو چند ڈھیٹ مکھیاں بھاپ کی شدت سے اوندھے منہ اندر آن گرتیں۔ جو چولہے کی آگ اور دھویں بھاپ کے باوجود دو فٹ اوپر منڈلاتی رہتیں۔ پھر اس چکنے مواد میں دھنس کر بھرے پیٹ کے ساتھ مر جاتیں۔ نجانے گاؤں میں مکھیوں کی افزائش اس قدر کیوں تھی۔ بچوں کی پشت اور جاہنکوں کی اصل رنگت کبھی نظر نہ آتی تھی۔ گندی غلیظ جھونپڑیوں سے صاف ستھری حویلیوں تک مکھیوں کی قلعی سی پتی رہتی۔ بھین بھین کی فطری موسیقی، تبھی حویلی کے باہر جنگلی حلق کی بلند کھرج سے آواز آئی۔ ''چھما کاکی، چھما کاکی جی پردہ جی پردہ۔''

سر پر لدے بوجھ نے آواز میں ایک چیخ سی پیدا کر دی تھی۔ منہ پر منڈاسے لپیٹے تین چار مرد بڑے بڑے گٹھڑ اٹھائے سرعت سے نگاہیں جھکائے ہوئے اندر داخل ہوئے جن کے ننگے پیروں کی کھلری ہوئی انگلیاں اور ادھڑی ہوئی ایڑیاں اور فلیٹ تلوے اینٹوں کے فرش پر ڈغ ڈغ بجتے تھے۔ نگاہیں پیروں سے اوپر اٹھتی نہ تھیں۔ تربوزوں، خربوزوں کے بھرے چرنے دیوار کے ساتھ اوندھا دیے، بھنڈی، توری، کدو، کریلے، تازہ لچکیلی ہری کچر سبزیوں کی پنڈیں بچھا کر اسی سرعت سے باہر نکل گئے۔ لمبی لمبی بلاہنگیں بھرتے پتھر جیسے تلوؤں کی آواز کو گھونٹنے کی کوشش کرتے۔ کہ کہیں ان کے قدموں کی آہٹ بھی پردہ دار بیبیوں کی سماعتوں سے ٹکرانے کی جسارت نہ کر جائے۔ کیونکہ ان کی آنکھوں کے ساتھ سماعتوں کے بھی پکے پردے تھے۔ مکھیوں کا ایک بڑا قافلہ ان کی پگڑیوں پر سوار ہو کر باہر نکل گیا۔ خربوزوں، تربوزوں کے ڈھیروں کو حسرت سے دیکھتی چنی جیسے اپنی تکلیف برداشت کر چکی ہو۔ بس یہ اضافی خون تھا جو ابھی بھی اس کے پیروں پر سوکھے ہوئے لوتھڑوں کو بھگو رہا تھا۔ جنھیں مکھیاں چوس چوس کر بدرنگ بنا رہی تھیں۔ جن کے بیچ سبز پروں اور لال آنکھوں والے بڑے بڑے مکھ گھس آئے تھے۔ جن کی اونچی جنگلی بھین بھین پر گھریلو مکھیاں پریشان ہو رہی تھیں۔

بڑے ملک صاحب ابھی تک برآمدے میں بچھی رنگلے پائیوں والی چارپائی پر سوئے تھے۔ پیڈسٹل کی گھوں گھوں میں جیسے صحن کی مکھیوں اور عورتوں کی بھنبھناہٹ گھل مل گئی تھی اور وقوعے کی اطلاع ان تک پہنچنے نہ پا رہی تھی۔ وہ دھوتی اُڑستے غسل خانے میں گئے اور کچھ دیر بعد واپس چنی کے قریب رک گئے۔

''کاکی یہ کس نے کیا۔''

''جی قلندروں درویشوں نے میرے ساتھ برا بھلا کیا۔ ملک صاحب جی....''

محتاج نے دونوں ہاتھ جوڑ کر سوکھی لکڑی جیسی بانہیں فضا میں اُلاریں اور اندازے

ہے سر ملک صاحب کے قدموں پر رکھ دیا۔
''نیاں مائی باپ سُچا نیاں کر۔ میں تیری رعیت.... انصاف بادشائیاں انصاف، مجھ انی موری کے ساتھ ڈاہڈا ظلم کمتا نیں۔ پھل بھر بالڑی چیر پھاڑ دی ظلمیوں نے بے کسوں کے والی میری فریاد سن۔''
ملک صاحب نے محتاج کے سر پر دستِ شفقت رکھا۔ ''پتر صبر کر گھر جا جن کا نام لیتی ہے۔ ان سے تو ڈنٹ لینا بھی اوکھا پھر بھی ہزار دو دلا ہی دوں گا۔''
اس رہتل میں گاؤں کا چودھری ہر ایک کو پتر کہتا ہے۔ چاہے وہ عمر میں اس سے دوگنا ہو لیکن مرتبے میں تو ہمیشہ پتر ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور پتر ہی مرجاتا ہے۔
محتاج اب گلے میں چادر ڈال کر ایک ٹانگ پر کھڑی دونوں ہاتھ جوڑے ہوئے تھی۔ نیاں مائی باپ نیاں۔ مجھ انی موری نال ڈاہڈا ظلم کمتا نیں۔
بڑی بی بی جی نے محتاج کی جھولی میں تربوز، خربوزہ اور کچھ سبزی ڈالی۔
''جالے جا اسے پکا کر کچھ کھلا۔ خون بہت نچڑ گیا ہے۔ پیلی پڑ رہی ہے۔ کہیں مر مرا ہی نہ جائے۔ نی لکھی! دودھ کا گلاس دے اسے ہلدی کا چمچ ملا کر، جلد بھر جائیں گے زخم، ہرجانہ بھی لے دیں گے کچھ نہ کچھ پر نہ کوئی گواہ نہ ثبوت کون مانے اس کملی رملی کی بات کو۔ پر خیر تسلی رکھ کچھ نہ کچھ تو لے ہی دیں گے ملک صاحب۔'' محتاج نے اندازے سے سر نہورا کر بی بی جی کے قدموں پر رکھ دیا۔
''آپ ہی مائی باپ ہو بادشہزادی۔ مہتر سے ظلم ہوا۔ عمروں حیاتیوں کی میں تیری نوکر غلام۔ تیری خدمتوں میں نیر بھی گنوا بیٹھی۔ انصاف بادشہزادی انصاف....''
اس قوم کے ساتھ کیسی مجرمانہ کارروائی ہوئی ہو قتل ہو کہ ظلم زیادتی۔ یہ غلامانہ عاجزی، خوشامد اور بے بسی والی خُوشاید نسل در نسل احساس محکومیت نے خون میں گھول دی ہے۔ ہڑپا کی مٹی کے خمیر میں مطیع ہونا ہے۔ حاکم ماننا محکوم رہنا، مظلوم ہو کر عمر بھر آہ و بکا کرنا کسی بھی

غاصب کے خوف میں مبتلا رہنا۔ اپنے حقوق کو دوسروں کی تحویل میں دے کر سمجھوتے کرنا چاہے باہر سے آریا آئیں یا یہ ملک کہ چودھری یہ مٹی سب کے قدموں تلے بچھ جاتی ہے۔ صنوبر کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا یہ فعل بھی اس کے لیے قابل رشک ہو سکتا ہے۔ یہ ذرا سی چرواہی چنی جو عمر میں شاید اس سے بھی کم تھی پر کیسے کیسے تجربات سے گزر چکی تھی اور اب تو ہر سو وہی موضوعِ گفتگو تھی۔ کتنی اہم اور خاص ہو گئی تھی یہ چنی۔

ریوڑ اگلے روز خود ہی چرنے کو چلا گیا تھا اور مغرب کے وقت تک لوٹ بھی آیا تھا۔ یہ سدھائی ہوئی خوصدیوں سے ان کے خون میں گھلی تھی۔ انھیں جس باڑے سے چھوڑا جاتا اسی میں اندھیرا پڑے لوٹتیں بھی۔ چاہے سانگل والی کوئی چناں چرواہی نہ بھی ہو ہر حال میں لوٹنا اور باڑے میں پناہ گزین ہونا ان کی فطرت تھی۔

محتاج نے ایک ایک جانور کو سینگوں سے پکڑ کر شمار کیا۔ ایک بھارو کم نکلا اور ایک کے سوا باقی سارے تھن بھی خالی۔ بوجھیاں اتری ہوئیں اور حوانے نچڑے ہوئے تھے۔

اس کے اگلے روز دو کم لوٹیں اور ساری ہی خالی تھنوں کے ساتھ۔ اس سے اگلی صبح آثاروں کے ٹیلوں کی پشت پر ابھی شفق بکھری تھی۔ جیسے سورج کے ساتھ کسی نے برا بھلا کر کے ہڑپا کے کسی ٹیلے پر زخمی حالت میں پھینک دیا ہو۔ جس ٹیلے کے نیچے دنیا کی کوئی انتہائی تہذیب یافتہ بستی دفن تھی جس کی کھدائی ابھی باقی تھی۔ اس سات تہوں میں دبی سب سے ترقی یافتہ بستی جیسی ہی ایک بستی اس وقت سطحِ زمین پر بھی موجود تھی۔ جو شاید ساتویں یا پھر پہلی تہذیب سے بھی پرانی تھی۔

محتاج نے اس کی جھلنگا چارپائی پر کیکر کی ٹیڑھی میڑھی لاٹھی برسا دی۔ چارپائی کے سیاہ بوسیدہ بان پر ابھی لہو کے نشان تازہ تھے۔ ٹوٹ کر نیچے لٹکتی بالشت بالشت بھر رسیاں خشک لہو سے اکڑی تھیں۔ جنھیں مکھیوں نے اپنی غلاظت سے لیپ دیا تھا۔

''بچ گئی ہے نا مری تو نہیں۔ ایک ٹیم میں پانچ سات بھگتا کر بھی نہیں مری تو پھر بچی

کیوں توڑتی ہے۔ تین دن میں چار بھاروکھلے کھاں ہو گئے۔"
"بھگیاڑ کہ اللہ لوگ، چور کہ چوکیدار۔
بے وارثی تو چڑی بھی نہ ہو۔"

بالی نے دونوں گھروں کو الگ کرنے والے دوفٹ اونچے اوٹے سے روٹی کی چنگیر بڑھائی۔ اوٹے کے ساتھ چکنی مٹی کے واروں سے اُسارے دو اونچے بھرولے ابھی کھڑے تھے۔ جو دونوں اس وقت خالی تھے۔ چکی کا من ٹوٹا تھا اور تنور کی مٹھ بھر گئی تھی کیونکہ انھیں اُسارنے والی تو مدت ہوئی اپنے نیر گنوا بیٹھی تھی۔

"ماسی کیوں ناراض ہوتی ہے۔ بھیڑیے کہ اللہ لوگ چور کہ چوکیدار۔ غریب لاوارثی کی عزت تو نرا گھوگو گھوڑا کب بھر جائے مڑک جائے تڑک جائے کہ بجھ جائے شوہدی کا قصور کوئی نا۔"

محتاج نے روٹی کی چنگیر پکڑی۔ اکروڑی کے ساگ میں چند پتے باتھو کے بھی ملے تھے۔ اسی لیے اکروڑی کی کرواہٹ گوارا ہو گئی تھی۔ تین روٹیوں پر ڈلے کے اچار کی تین گولیاں دھری تھیں۔

یہ دیہاتی بھی زمین سے اگنے والی کوئی شے چھوڑتے نہیں ہیں۔ کوئی جڑی بوٹی کوئی جڑ بٹا ٹانڈا۔ کسی نہ کسی شکل میں کھا ہی جاتے ہیں جو نہ کھا سکیں وہ اپنے مویشیوں کو کھلا دیتے ہیں۔

"تو بٹھا لے نا اسے اپنے ساتھ کسی آرہے تو لگے۔ برا بھلا ہوا ہے نا ہونا ہی تھا۔ اجڑ کی بکری بکروں سے کب بھی بچی۔ آج نہیں تو کل کھلی پھرتی کو سا ہنی بکرے تو سونگھیں گے ہی نا۔"

محتاج نے مٹی کی رکابی ناک تک لا کر سونگھی۔ "باتھو کا تو سنواں ہی نہیں ہے۔ کہیں کوئی بوٹا کنک میں اُگ آیا ہوگا بے سنواں۔"

چنی کو آریا کا خیال آیا۔ جو یہاں کا بوٹا ہی نہ تھا۔ بے سنواں کہیں سے آ گیا۔ اور یہاں کی اکروڑی آک کنیر کا ذائقہ خراب کر گیا۔ گلاب موتیے کی خوشبو سے جنگلی مہک کو

خراب کر گیا۔ باہر لو بھری ہوا نے آک کے آم نما پھل کی تیز نوک والے منہ کھول دیے تھے اور اب ذرا ذرا سفید ریشے میں ایک ایک سیاہ بیج لپیٹے اُڑے چلے جا رہے تھے۔ اس پھل کا پیٹ جیسے چاک ہو گیا تھا اور ہر تیز جھونکے کے ساتھ لپٹی بے شمار سفید بالوں والی مائیاں ہر سمت سے باہر نکلتی تھیں۔ بے سمت عازم سفر۔ ہواؤں کے دوش پر۔ ہرے آم نما پھل میں سے ہوا کے ہمراہ بے شمار ریشے اڑتے چلے جا رہے تھے اور پل دو پل میں سارے پھل خالی ہو کر صرف چھلکے باقی رہ گئے تھے۔

''ہاں ماسی! پر ایک بار ہوا ہے۔ بار بار نہ ہو۔ جھا کا کھل جاتا ہے۔ دوسروں کا بھی اور خود کا بھی.... چل چنی روٹی کھا کر تیار ہو جا۔ دیکھتی ہوں اب تجھے کوئی ہاتھ لگائے کھکھو نے ٹھیل دوں گی۔ اللہ لوگ کہ چوکیدار۔ بالی نہیں ڈرتی اللہ کے سوا کسی سے بھی ہاں نہیں ڈرتی ہوں۔ چودھری ڈرتے ہیں بالی سے۔ اپنی عزت سے ڈرتے ہیں۔ جس کی کوئی عزت ہی نہ ہو وہ کسی سے کیوں ڈرے۔''

کھنڈر بستی کے اطراف و جوانب میں چنی کی آمد کی خبر اس کے گھر سے نکلتے ہی پھیل چکی تھی۔

چرواہوں سے پہرے داروں تک اور قلندروں سے مریدوں تک سب کے دلوں میں عجب گدگدیاں ہوتی تھیں۔ وہی تحقیر انگیز حرص کی گدگدی جو اپنی دسترس میں محکوم کو بے بس دیکھ کر تحکم کی پسلیوں میں ہوتی ہے۔

چرواہے سیٹیوں کی تال پر گنگناتے تھے۔

برا بھلا، برا بھلا۔

قہقہے حلق میں گھٹ گھٹ پلٹتے تھے۔

''برا بھلا، برا بھلا۔'' جیسے یہ دو لفظ چوسنے کو لذیذ ہڈی ہوں۔ تماش بین عورتیں افسوس کرتیں۔

"ہائے شہدی برا بھلا ہوا...."

وہی جو اسے کھنڈروں سے دھتکارتی تھیں۔ اس کے برے بھلے سے ان کی کھڑکھڑاتی پسلیوں میں گم قہقہوں کی مدھانی گھومتی۔ اس سے دھینگا مشتی کرنے والے چرواہے بہانے بہانے سے اپنے ریوڑ ہانکتے اس کی کوٹھری کے احاطے سے گزرتے اور سیٹیاں بجاتے۔ باچھوں کے دونوں اطراف ہاتھ کی اوک بنا کر چلاتے۔ "برا بھلا"

چنی کے مدعے پر جو پنچائیت ملک صاحب نے بلائی تھی۔ اس میں ملنگوں قلندروں کی نمائندگی امام مسجد نے کی تھی۔ ان اللہ لوگوں کو تو اپنے وجود کی سدھ بدھ نہ تھی۔ اپنے افعال کی خبر کہاں ہوگی۔ انھیں تو شرک تک کی معافی تھی۔ دنیاوی بے ضابطگی کی کیا حیثیت تھی۔ ان کی ایک نگاہ یا دھاڑ راندۂ درگاہ کر دیتی تھی۔ کسی انصاف کی پنچائت میں ان سے جوابدہی کرنے والا خود خاکستر ہو سکتا تھا۔ ملک صاحب نے تو پھر بھی انھیں طلب کرنے کی جرأت کی تھی۔ جس کی سزا آئندہ ان کے مقدر میں لکھ دی گئی تھی۔ جو وقت آنے پر ضرور ملنی تھی۔ امام مسجد نے فتویٰ دیا تھا کہ اس فاتر العقل چھوکری کے الزامات پر اللہ لوگوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا گناہ کبیرہ ہے۔ انھیں ہر فعل سے بریت حاصل ہے۔ ان کے کسی فعل کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ جنتوں میں ان کے لیے حسین و جمیل حُوریں محوِ انتظار ہیں جو خدا کا تحفہ ہیں۔ تو پھر زمین پر چنی جیسی کی کیا حیثیت ہے۔ یہ بھی خدائی تحفہ۔ اس جیسیوں کے پیدا کرنے کا دوسرا کوئی مقصد ہے ہی کیا۔ ان پہنچے ہوئے بابوں سے پوچھ پرتیت کرنا خود خدائی احکامات سے روگردانی ہے۔ فتویٰ جاری ہو چکا تھا۔ تو پھر فتوے سے کسی کو انحراف کی کیا جرأت بلکہ اس فتویٰ کی رو سے چنی کا مقصدِ حیات بھی واضح کر دیا گیا تھا اور بستی کے ہر مرد و زن تک اس کی حقیقت پہنچ چکی تھی۔

▪▪▪▪

باجیاں اور صاحب

برا بھلا ہوئے وہ تیسرا روز تھا۔ جب چنی اپنا ریوڑ لے کر کھنڈروں میں نکلی تھی۔

آثاروں میں طلوعِ آفتاب کا منظر پینٹ کرنے والی باجی نے چنی کا سایہ لہولہو سورج میں گھلا ملا دیا تھا۔ شفق کے لہو میں لتھڑا انسوانی سایہ سورج کے تیروں سے زخمی تھا۔ یہ تصویر کمال کا فن پارہ تھی۔ چنی کی شبیہ سیاہ رنگ فرشِ زمین پر معدوم ہو رہی تھی۔ سورج کی شعاعیں ترچھے تیروں کی مانند اس کے پورے وجود کو چھید رہی تھیں اور لہو کی کلیجی رنگ دھاریں ابل رہی تھیں۔

لڑکی نے تصویر مکمل کرنے کے بعد پوچھا۔

''یہ کیا ہوا تیرے ساتھ چنی!''

''باجی برا بھلا ہوا۔ ملنگوں نے کیا۔ خورے چار تھے کہ پانچ'' یہ جملے وہ اتنی بار بول چکی تھی کہ اب جیسے چناں کے موٹے لٹکے ہوئے سیاہ پپڑی جمے ہونٹوں سے پھسلا ہو۔

''پیر تلک گیا، تپ چڑھ گئی باجی۔''

"باجی میں چیکی بھی تھی۔ ساری رات چیکتی رہی۔ پر کوئی نہ آیا تھا نہ چوکیدار نہ

پاہی۔"

"ملا کہتا ہے۔ اللہ لوگوں کو سب معاف ہوتا ہے۔ اللہ میاں نے مجھے ان پر حلال کر دیا ہے۔ میرے جیسی ساری چنیاں ان پر حلال ہوتی ہیں۔ چاہے پانچ مہینے کی کہ پندرہ سال کی میری طرح۔ پنچائیت نے انھیں بخش دیا ہے۔ مجھے ان کے لیے حلال کر دیا ہے۔ بڑے ملک صاحب نے ان پر ڈنٹ ڈالا تھا۔ پر مولبی نے پورے گاؤں پر تقسیم کر دیا ہے۔ وہ تو اللہ والے ہیں۔ انھیں تو سب معاف ہوتا ہے نا۔ ڈنٹ بھی معاف ہوتا ہے۔"

اور وہ تیرا آریا۔

"وہ تو باجی گیا اپنی تلے کی تارسی دلہن کے پاس۔"

"اور تو لٹ گئی اس کی چاہ میں۔ چل اٹھ چل میرے ساتھ۔"

لڑکی نے اپنا کینوس اور رنگ سمیٹ لیے۔ جب چنی اس کی گاڑی میں بیٹھی تو چوکیدار دوڑتے آئے۔

"باجی آپ اسے کہاں لے کر جا رہی ہیں۔ اس کی ماں پوچھے گی تو ہم کیا جواب دیں گے۔ یہ ہماری سپرد داری میں ہے۔"

"کہہ دینا تھانے لے جا رہی ہوں۔"

"پر باجی ہمارے ہاں عورتیں تھانے کچہریوں میں نہیں چڑھتیں۔ ان کے فیصلے پنچائتوں میں ہوتے ہیں۔ اس کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے۔ آپ ہماری بے عزتی کر رہی ہیں۔ ہمیں بے غیرت بنا رہی ہیں۔" تیز رفتار گاڑی دھول کے چھینٹے ان کے چہروں پر اڑاتی بہت دور نکل گئی تھی۔

رنگوں والی باجی اسے جن باجیوں کے پاس لے کر گئی تھی۔ اس طرز کی عورتیں چنی نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھیں۔ ان کے رنگے ہوئے بالوں اور لباس کی تراش خراش انھیں ایسا

رعب، غرور اور اعتماد بخش رہی تھی کہ دیکھنے والے کا سارا اعتماد اور رعب ہڑپ لیں۔ دوسروں کو اپنی پرسنیلٹی سے زیر کرنے کا فن صرف ان عورتوں کو حاصل تھا۔ اس کلاس کے مردوں کو بھی نہیں۔ وہ پھر بھی زمینی انسان سے لگتے تھے۔ لیکن حقوق نسواں کی تنظیموں کی یہ عورتیں کوئی آسمانی مخلوق سی۔ ان کی انگریزی بھی کوئی خلائی زبان تھی۔ حالانکہ چناں پہرے داروں والی انگریزی اچھی بھلی سمجھ لیتی تھی جو وہ گوروں سے بولتے تھے۔ لیکن یہ انگریزی زیادہ ہی ولایتی تھی۔ وہ اس مسئلے پر یوں پرجوش تھیں جیسے ان کے بوتیکس کو کوئی بڑا آرڈر مل گیا ہو۔ وہ بھی کہیں بدیس سے۔ منافع بخش آرڈر۔

اسے لمبی ٹھنڈی گاڑی پر پریس کلب لے جایا گیا۔ کیمروں کی چکا چوند بیسیوں مائیک بے شمار لوگ اور سوالات۔ لیکن جواب وہی مخصوص۔

''برا بھلا ہوا جی۔ پتا نہیں چار تھے کہ چھ۔ قلندر کہ درویش'' یہ سب تو پچھلے تین دن سے وہ بار بار دہراتی رہی تھی۔ لیکن اب یہ الفاظ پوری دنیا میں گونج گئے تھے اور ملک بھر میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ہر ٹی وی چینل پر چنی نظر آتی تھی۔ ایک عوامی ردِعمل تھا۔ جس کا جھیلنا حکومت وقت کے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ یہ ردِعمل بنا کون رہا تھا۔ یہ سوچنا عوام کا کام نہ تھا۔ انھیں تو اس دباؤ میں بس بہہ جانا تھا۔

ساری این جی اوز، حقوقِ نسواں کی تنظیمیں، وکلا تنظیمیں، بار کونسل، حزبِ اختلاف کی جماعتیں عالمی انسانی حقوق کی تنظیمیں جیسے کوئی برا خواب دیکھ کر سبھی ہڑبڑا کر جاگ اٹھے ہوں۔ چناں کے نام پر فنڈ ریزنگ کے لیے ویب سائیٹ بن گئی۔ Chanh_ Harapa, Come ہر سو چناں کی تصویروں والے بینرز آویزاں ہو گئے۔ پتا نہیں کون چھپوا رہا تھا۔ کون کون سپانسرز تھے۔ عوام کا یہ جو سیلاب سڑکوں پر نکل آیا تھا تو اسے باہر نکالنے کھلانے پلانے کا بندوبست کون کر رہا تھا۔ ایسے غیر متعلق سوالات کسی دماغ میں آ بھی نہ رہے تھے۔ سبھی ظلم کے خلاف باہر نکلے تھے اور انصاف ملنے تک یہ احتجاج جاری رہنا تھا۔ یہ فیصلہ کس

کی طرف سے ہوا تھا۔ یہ بھی کسی کو معلوم نہ تھا اور نہ ہی جاننے کی ضرورت تھی۔ مظلوم کو انصاف دلانا ہر ایک کی زندگی موت کا مسئلہ بن چکا تھا۔

اس بستی کی وہ لڑکیاں جو دن میں کم از کم ایک دو بار تو کسی کماد کے کھیت میں یا کسی خشک کھال کی پلی تلے اس عمل سے روز گزرتی تھیں۔ وہ حیران تھیں کہ ان کی قربانیاں تو روز ہی رائیگاں جاتی ہیں۔ ان کے خاندان کو تو لعنتوں ملامتوں کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ لڑکی کو سنبھال کر نہ رکھنے پر انہی سے باز پرس بھی ہوتی اور لڑکی ہی موردِ الزام ٹھہرتی۔ اس لیے تو وہ ان کارروائیوں کا تذکرہ اب کرتی ہی نہ تھیں۔ البتہ مائیں اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں ہر مہینے مستعد رہتیں کہ کہیں ماہواری کا سلسلہ بے ربط تو نہیں ہو گیا۔ وہ السی اور گڑ کی پنیاں انھیں کھلاتی رہتیں چھواروں کا کاڑھا پلاتی رہتیں اور جلد از جلد انھیں کسی کے نکاح میں سیڑھنے کی تگ و دو میں لگی رہتیں۔ پھر بھی نکاح کے دن تک دو تین حمل گرانے ہی پڑتے۔ اسی لیے ''بھورے اور پواڑے'' کر کر کے کچھ نہ کچھ مردوں کی نظروں سے اوجھل بستروں والے صندوق میں چھپا رکھتیں۔ اور رانی دائی کا کاروبار کبھی ماند نہ پڑتا۔

اس چنی کے ساتھ کیا کچھ وکھرا ہو گیا تھا کہ محتاج بھاگاں کی مورت بھی ٹیلی ویژن پر دکھائی جا رہی تھی۔ جو بتا رہی تھی کہ اس کی بیٹی کی یہ حالت اللہ لوگوں نے بنائی ہے جب کہ وہ خوداندھی موری تھی لیکن اس کی گواہی ہر کوئی مان رہا تھا۔ ان اللہ لوگوں کے خلاف جنھیں ہر عمل کی معافی ہے۔ کیا کوئی درویشوں مستوں سے بھی بڑا موجود تھا اوپر کہیں۔ وہ تو پھر خدا جیسا ہی کوئی ہوا نا۔

چناں کو لگتا تھا جیسے یہ سارے این جی اوز والے اس کی جان کے دشمن ہوئے جاتے ہیں۔ ان امدادوں سے وہ تھک ہار جاتی تھی لیکن اس کے مددگار کبھی نہ تھکتے۔ چناں کے دکھ کو خود اس سے بھی بڑھ کر اپنی جانوں پر جھیل رہے تھے اور اب اس کی حفاظت کے لیے باہم برست و گریباں بھی۔ جیسے بستی کے بچے شام گئے گھروندوں کی ملکیت کے لیے باہم دست و

گریاں ہو جاتے تھے۔

چناں کو لگتا سارے ٹی وی چینلز اس کے وکیل ہیں۔ انسانی حقوق کی ساری تنظیمیں اس کی مائی باپ ہیں۔ جس طرح سارے گاؤں کے مائی باپ ملک صاحب ہیں۔ لیکن اس کے مائی باپ اب بدل گئے ہیں۔ جو یہ جلوس نکال رہے تھے۔ اجلاس منعقد کر رہے تھے۔ ان جلوسوں اجلاسوں میں جو کہا جاتا تھا وہ تو چناں کی سمجھ میں نہ آتا تھا لیکن اس قدر ضرور سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ضرور ہو گیا ہے۔ جس نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ جس کی شدت کو وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ ایسا سب کچھ وہاں بچوں کے بیچ کھیل ہی کھیل میں تو ہوتا ہی رہتا تھا۔ جب سب بچے گھروندے بنا انھیں پھوڑنے سے پہلے ایک بستی سجاتے جو اصل بستی کی ہو بہو نقل ہوتی۔

لڑکیاں فرضی بچے جنتیں۔ چادر کی جھمی تان کر فرضی دردوں کی ماری فرضی زچہ چیخ پکار بھی کرتی۔ فرضی دائیاں دو تین اہم لڑکیوں کے علاوہ کسی کو جھمی کے اندر داخل نہ ہونے دیتیں۔ جو زچہ کی ماں بہن کہلاتیں۔

کسی گھروندے میں بین ڈال ڈھول اڑا، منہ سر پیٹ پیٹ کر کسی فرضی موت کا ماتم بھی کیا جاتا۔ جوڑا گھوڑا اڑا کر بدائی کے گیت بھی الاپے جاتے۔ میاں بیوی والا کھیل بھی کھیلا جاتا۔ جب گھروندے بنا کر پھوڑے جاتے۔ ڈھول کے پردے آسمانوں تک تن جاتے۔ لڑکیاں اس تخریب کو روکنے کے لیے لڑکوں سے بھڑ جاتیں۔ اور وہ انھیں اٹھا اٹھا کر پٹختے۔ اس وقت پتا نہیں کیسے غیر ارادی طور پر کھالوں کی پلیوں تلے اور چارے کی کھرلیوں تلے وہ ماں باپ والا کھیل کھیلنے لگتے۔ جسے وہ شب کے اولین پہر میں اپنی اپنی کوٹھریوں میں محسوس کرتے لیکن گھپ تاریکی میں دکھائی کچھ نہ دیتا۔ لیکن سجھائی سب دے رہا ہوتا۔ عورتیں جو دن بھر مشقت اور تشدد سے گزرتیں وہی مرد جو انھیں لاتوں گھونسوں سے سوجا دیتے۔ وہ اس جسمانی کھیل سے گویا انھیں خوش کر دیتے۔ وہ بھی دن بھر کی مشقت اور تشدد

کا انعام وصول کر کے اگلے دن بھر کی مشقت اور تشدد سہارنے کو تازہ دم۔ کیونکہ وہ اس کے علاوہ کچھ جانتی ہی نہ تھیں۔ پر بالی تو سب جانتی تھی۔ وہ کہتی تھی۔

"اری ہمارا تو گھوگو گھوڑا جسے ٹوٹنا تڑکنا ہی ہوتا ہے آج مُڑ کے کہ کل بُھرے۔ اس شے کا کیا گمان جو اپنی ہو ہی نا۔ یہ تو پرایا مال۔ بس ہوا یہ ہے کہ مول تیری مرضی کا نہیں ہوا۔ اگر آریا تجھ سے مانگتا تو کیا انکار کر دیتی۔ نہیں دیتی۔ بر حق دیتی پر من مرضی سے دیتی۔ جو شے اپنی ہو ہی نہ اس پر اختیار کیسا۔ چار چھلڑ کھرے کر اور رولا مکا۔"

پر یہاں تو چھلڑوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ملک سے بیرون ملک سے ڈالروں میں پاؤنڈوں میں، ریالوں میں، روپوں میں، چنی کا جی چاہتا بھاگ بھاگ کر انھیں لوٹنے لگ جائے۔ جیسے گاؤں کی برات پر برستے سکوں کو بچے لوٹتے تھے۔ لیکن اس لوٹ کے سمیٹنے کو تو یہاں با قاعدہ مینیجر رکھے گئے تھے۔ اسے سکھانے پڑھانے کو اس کے سیکرٹریز رکھے گئے تھے۔ جو اسے سکھاتے تھے کیا بولنا ہے کیسے بولنا ہے۔

کیونکر بات کو زیادہ پُر تاثیر بنانا ہے کہ انصاف پسندوں کو ہلا کر رکھ دے اور وہ اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیں۔ دوسروں سے نکلوانے کا فن۔ دراصل ان کا پیشہ تھا جس کی وہ بھاری تنخواہ لیتے تھے۔ پرموٹرز، انسانی پروڈکٹ کو پرموٹ کرنے والے.... اسے کبھی ایک شہر میں لے جایا جاتا تھا تو کبھی کسی دوسرے میں۔ جلسے جلوس سیمینارز، پریس ریلیز.... جیسے ترازو کے پلڑے میں موجود کانٹر دور کرنے کو ذرا سی وٹی باندھ دی جاتی ہے۔ اور یہی ذرا سا باٹ پلڑا جھکا دیتا ہے۔

عورت کے حقوق کے ایوانوں میں وہ صدر نشین ہوتی۔ بڑے بڑے جلسوں کی قیادت اس سے کروائی جاتی۔ وہی چنی جسے ڈھنڈاروں سے باہر رگید نے کو پوری دنیا اس کے درپے رہتی تھی۔ چرواہوں سے لے کر پہرے داروں تک بھک منگی عورتوں سے لے کر آریا خان تک۔

چناں کو لگتا ان ملنگوں کو سزا دلوانے کی بجائے ان نوٹوں میں سے کچھ حصہ ان کا بھی بنتا ہے۔ یہ نوٹ انہی کی وجہ سے تو اس پر برس رہے ہیں۔ ہڑپا کے کھنڈروں میں رلنے والی اس ذرا سی کنک چنی کو یوں کاشت کیا گیا تھا کہ وہ پھل پھول کر ثمر دار درخت بن گئی۔ ہر جھونکا اس پر سے میٹھے رسیلے پھل برسا دیتا تھا۔ اتنا تو بالی کو بھی نہ ملا تھا۔ جسے روز اس سب سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہاں تو چناں ہی نہیں خود ہڑپا کے کھنڈرات کی قسمت بدل گئی تھی۔ پھر سے اس قدیم ترین تہذیب کی جانب دنیا متوجہ ہوگئی تھی۔ ماہرِ آثارِ قدیمہ اور ان کی تنظیمیں جیسے ان کھنڈروں کو بچانے کے لیے پھر سے کمربستہ ہوگئی تھیں جیسے چنی کے لیے انسانی حقوق کی تنظیمیں.... جیسے ان آثاروں کے ساتھ بھی برا بھلا ہو گیا ہو۔ دنیا کو پہلی بار ان کی قدامت اور اہمیت کا احساس بھی چناں نے ہی دلایا ہو۔ اگر اس کے ساتھ یہ نہ ہوتا تو سوشل میڈیا کلاس کے تو شاید علم میں بھی یہ قدیم ترین تہذیب نہ آسکتی۔ اس ذرا سی چنی نے پوری دنیا کو ہلا ڈالا تھا۔ سرمایہ دار پیسہ لگانے والے انوسٹرز پروڈکٹ کی مانگ اور منافع کا بروقت اندازہ لگا لیتے ہیں جیسے چنی کا لگا لیا گیا تھا۔

اس کے بعد ہی کھنڈرات کی حفاظت اس قدر سخت کر دی گئی تھی کہ ریوڑوں اور چرواہوں کا داخلہ ممنوع قرار پایا تھا۔ خاردار باڑوں کا اضافہ کر دیا گیا تھا۔ کھدائی والے حصے میں غیر متعلقہ افراد کے داخلے پر پابندی بھی لگا دی گئی تھی۔

وہ ٹیلے جن کی ابھی کھدائی ممکن نہ ہوسکی تھی۔ جن پر بستی کے ریوڑ دوڑتے بھاگتے رہتے تھے۔ حفظ ماتقدم کے طور پر ان کے گرد بھی آہنی باڑیں لگا دی گئی تھیں۔ کیا معلوم ان کے اندر ایسا کیا چھپا ہو کہ دنیا کی معلومہ تاریخ ہی بدل ڈالیں۔ شاید پانچ ہزار برس سے بھی پرانی کوئی تہہ دریافت ہو جائے۔ کتنی تہذیبیں تہہ در تہہ یہاں وہاں مدفون ہیں۔ ابتدائی تہذیب ترقی پذیر تہذیب ترقی یافتہ تہذیب۔ اور پھر سب گم۔

چنی سوچتی۔ پہلی تہذیب تو اس کا اپنا گاؤں ہے۔ دھوتیاں باندھے مرد عورتیں کھیتی

باڑی کرتے، تانیاں تنتے جولاہے، سوئے اور سیسے سے جوتے سیتے موچی، چاک پر ظروف گھڑتے اور بھٹیاں دہکاتے کمہار۔

پھر وسطی تہذیب جیسے ہڑپا شہر۔ تانگوں، ریڑھیوں، چھابڑیوں کا ازدہام کچے مکان اور چھوٹی چھوٹی گلیاں اور تنگ سڑکیں بھیڑ بھاڑ منڈیاں اور آڑھتیں۔ اور پھر یہ ترقی یافتہ تہذیب جیسے یہ شہر لاہور۔ موٹر گاڑیوں کے شور بڑے بڑے مکان، دکانیں اور بازار جیسے ہڑپا کی کھدائی والا حصہ.... تو یہ شہر لاہور شاید اسی ترقی یافتہ تہہ والے دور کا حصہ ہے۔ جہاں عالی شان محلات اور نکاسی آب کا نظام بہترین شکل میں موجود تھا اور جوان کھدے ٹیلے ابھی باقی ہیں۔ وہاں غربا کی بستیاں ہوں گی۔ جن میں پہلی تہہ والی تہذیب کے آثار دفن ہوں گے۔

چناں اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ ہر دور میں یہ تینوں طرح کی تہذیبیں ساتھ موجود رہتی ہیں۔ جیسے آج موجود ہیں تو پھر ترقی کیا ہوئی۔ بالی کہتی تھی۔

"جب انسان طبقوں اور گروہوں میں تقسیم ہیں تو پھر تہذیب ایک جیسی کیسے۔ تہذیب کو کمائی کے وسائل ترتیب دیتے ہیں۔ جب وہ یکساں نہیں تو پھر معاشرت ایک کیسے ہو سکتی ہے۔ تو پھر معاشرت کسی دور سے نہیں معیشت سے منسلک ہوگئی نا۔

تہذیب امیروں کی ہوتی ہے غریبوں کی بس رہتل ہوتی ہے۔ تو پھر کیا؟ آخر تو سب ختم ہی ہونا ہے نا۔ جب سب تباہ ہو جاتا ہے تو بنانے کا فائدہ۔ بالکل ویسے ہی جیسے گاؤں کے بالک روز گھروندے بناتے اور پھر اندھیرا پڑے ڈھا دیتے ہیں۔ یہ ہڑپا کی بستی بھی کچھ ایسی ہی رہی ہوگی۔ بنانا اور پھر ڈھا کر جشن منانا۔"

"ہتھاں نال بنایا سی پیراں نال ڈھایا اے"

▪▪▪▪

ترجیحی بنیادوں پر سنے جانے والے اس مقدمے کی پیشیوں میں [illegible] ہمراہ ایک جلوس چلتا تھا۔ بیرونی ممالک سے آئے انسانی حقوق کی تنظیموں کے نمائندے، میڈیا رپورٹرز، وکلا برادری، کھمبیوں کی طرح اگی ہوتی خواتین کے حقوق کی تنظیمیں کیمروں کی چکا چوند، ہیجانی رپورٹنگ، سنسنی خیز انٹرویوز اور ہڑپا کی ہزاروں برس پرانی تہذیب کی کہانی دہرائی جارہی تھی۔ پانچ ہزار برس قبل کی عورت کی حاکمیت، مادرسری خاندانی نظام اور دیوی ماتاؤں کے فلسفوں کو پیش کیا جارہا تھا۔ جیسے یہ سبھی غم گسار اس دور کے چشم دید گواہ تھے اور اب وہی مقام اور بالادستی ہڑپا کی چناں کو دلا کر دم لیں گے۔ جو پانچ ہزار برس قبل یہاں ہڑپا کی عورت کو حاصل تھی۔ اپنے رزق اور شوہر کے انتخاب کے علاوہ تمام امورِ حیات میں خودمختار جیسے آج خانہ بدوش عورت ہے لیکن ان کی اپنی عورتیں چاہے کیسے عقوبت خانوں میں سڑ رہی ہوں لیکن ہڑپا کی چناں تو انہی حقوق کی مستحق ہے جو ہڑپا کی قدیمی عورت کو حاصل تھے اور یہ سارے روشن خیال مرد چنی کو یہ سب حاصل کروا کر چھوڑیں گے۔

ہر تنظیم کی یہ خواہش تھی کہ چنی انہی کی جہازی سائز گاڑی میں تشریف فرما ہو۔ انہی کے دفتر میں رونق افروز ہو۔ چناں نے تو انھیں گویا مقصدِ حیات بخش دیا تھا۔

ان ٹھنڈے کمروں کے باہر پورا ملک جل رہا تھا۔ آگ اگلتی سڑکوں پر گاڑیاں اور ٹائر نذرِ آتش تھے۔ حکومتی کارندے مظاہرین پر آنسو گیس اور ربڑ کے شیلز برسا رہے تھے۔ لیکن جوش و جذبہ تھا کہ یہ نہتے عوام کسی مسلح لشکر سے ٹکرانے کے درپے تھے۔ بڑے بڑے ایوانوں اور نظاموں کو ہلا دینے کی وجہ یہ ذرا سی چنی تھی۔ عجب نظام صارفیت کہ نیا بیچنے کو پرانا ملیا میٹ کرنا ضروری تھا۔ ذرے کو پہاڑ اور پہاڑ کو ذرہ بنا دینا اُن کی نگاہِ کرشمہ ساز کا کمال تھا۔

ان ہنگامہ خیز پیشیوں میں دنیا جہاں کے وکیل اسے بیان رٹانے کو کوشاں تھے۔ ایک ایک لفظ پڑھایا جارہا تھا۔ پر وہ پڑھنے والا دماغ ہی نہ رکھتی تھی۔ اس نے تو فطرت سے اکتساب سیکھا تھا۔ اس نسل کے پاس انسانوں سے سیکھنے، کتابوں سے پڑھنے کا تو دماغ ہی

نہ تھا۔ ہر ایک کی اپنی اپنی سیکھ اپنے اپنے تجربات۔ کسی دوسرے کی سیکھ پر انحصار کسی دوسرے کے تجربے سے استفادہ اس نسل کی دانش کا حصہ ہی نہ تھا۔

اسے سکھانے والے بے شمار پر وہ سیکھ کر ہی نہ دیتی تھی۔ بکریوں سے بڑے بڑے چھوچھ کھول دیتی اور بھیڑوں سی خالی خالی آنکھیں جھکا دیتی۔ مجسٹریٹ کے سامنے تو این جی اوز کی عورتوں نے ہی اس کا بیان قلم بند کروا دیا تھا۔ لیکن عدالت کے روبرو جب وہ آریا وہ خان نیازی آن کھڑا ہوا تو وہ سارا رٹا بھول گئی اور اپنی فطرت اور تجربے کے مقابل آگئی۔

وہ آج بھی اسی طرح تن کر کھڑا تھا جیسے کھنڈروں کی حفاظت کے لیے گھوڑے کے سے مضبوط سموں پر کھڑا ہوتا تھا۔ آج بھی اسے نیازی صاحب کہہ کر مخاطب کیا جا رہا تھا۔ اس قدر سنگین الزمات کے باوجود اس کے چہرے پر وہی اعتبار تھا کہ جس کے رعب میں اس کا نام بگاڑنے کی جرأت کسی کو نہ تھی۔ این جی اوز کی چٹر پٹر عورتیں بھی اس کے روبرو گم صم تھیں۔

جس مقدس کتاب پر چناں سے ہاتھ رکھوایا گیا تھا۔ اس سے متعلق وہ اس کے سوا کچھ نہ جانتی تھی کہ جب گاؤں میں کسی کی چوری ہو جاتی یا ڈنگر کھل جاتا یا دھی بہن اغوا ہو جاتی یا برا بھلا ہوتا تو اس پر ہاتھ رکھوا کر نیاں لیا جاتا۔ اس موٹی کتاب کا ایک ہی مصرف چناں کو معلوم تھا کہ پنچائتوں کے بیچ رکھ کر جھگڑے ختم کروائے جاتے ہیں لیکن وہ کیوں نیاں یا قسم دے رہی تھی۔ جبکہ چوری بھی اسی کی ہوئی تھی۔ اس کتاب پر ہر جانے کے پیسے بھی نہ رکھے گئے تھے۔ کہ اگر تو سچی ہے تو اٹھا لے۔ تب تو وہ اٹھا لیتی کیونکہ وہ سچی تھی۔ لیکن اسے تو کہا جا رہا تھا کہ وہ قسم کھائے کہ وہ جھوٹ نہیں بولے گی۔ جو کہے گی سچ کہے گی۔ یعنی یہ ''برا بھلا'' جھوٹ بھی ہو سکتا ہے۔ جبکہ اس سے زیادہ تو اس کی گواہی پوری خلقت دے رہی تھی اور یہ آریا بھی تو گواہ تھا جو واردات کی رات اسے ڈھنڈاروں کے آسیب میں پھینک کر بھاگ نکلا تھا۔

▪▪▪▪

وکیل نے جرح شروع کی:

''آپ اس شخص کو جانتی ہیں۔

ہاں جی۔

کون ہے یہ؟

یہ جی ہڑپا کے کھنڈروں کا پہرے دار ہے۔

یہ آپ پر بری نظر رکھتا تھا۔

نہیں جی۔

چھیڑتا تھا آپ کو تنگ کرتا تھا۔''

''یہ تو جی میری طرف دیکھتا تک نہ تھا چھیڑنا کیسا۔ پر تنگ بہت کرتا تھا۔''

''اس نے آپ کو ورغلایا۔ ذہن پر زور دے کر تسلی سے جواب دیں۔ کسی خوف اور لحاظ سے بالاتر ہو کر جواب دیں۔ یہ آپ کو بہکانے کی مسلسل کوشش کرتا رہا اور واردات کی رات اس نے آپ کو کھنڈروں میں تنہا چلے آنے پر مجبور کر دیا اور آپ اس کے اکسانے میں آ گئیں۔''

''ہاں جی۔''

کمرۂ عدالت نے جج سمیت سکون کا لمبا سانس کھینچا۔ جج بھی اس تنکے کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا جس کی کمزور سی دفعہ پر قانون رکھ کر خلقت کے جذبات کو ٹھنڈا کیا جا سکے۔

وہ خان نیازی آج بھی اس سے ایسی ہی بے اعتنائی برت رہا تھا۔ جیسے وہ ابھی بھی ڈھنڈاروں کی چرواہی چنی ہو۔ جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ اب چاند بی بی ہو گئی ہے۔ جس نے حکومت کی بنیادوں کو ہلا دیا ہے اور حکمرانوں کے قدموں تلے سے تخت لرزا دیا ہے۔ وہ غضب ناک ہو کر اس پر ایسے ہی حملہ آور ہوئی جیسے کھنڈروں میں اپنے ریوڑ کے ہمراہ اس پر ہلہ بول دیا کرتی تھی۔

"اس سے پوچھیں یہ میری طرف دیکھتا کیوں نہیں تھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگتی رہتی۔ یہ مجھ سے دور بھاگتا۔ اگر اس رات یہ مجھے دھکا مار کر اپنی تلے کی تارسی و وہٹی کے پاس نہ چلا جاتا۔ میں ڈھنڈاروں میں بے ہوش ہو کر نہ گرتی اور ان اللہ لوگوں کو نہ ملتی۔ تو پھر یہ سب بھی نہ ہوتا۔"

خواتین کی تنظیموں کی عہدے دار اس باریک نکتے اور نازک خیالی پر چناں چرواہی کو داد دیے بغیر نہ رہ سکیں۔ لیکن اس دلیل کی گنجائش قانون میں نہ بنتی تھی۔ وکیل نے ہڑبڑا کر پینترا بدلا۔

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کا اصل مجرم رشید نیازی ہے۔"

"ہاں جی جیسے ہڑپا کی بستی میں آریا آئے تھے نا اور سارا ناس مار گئے تھے۔ اسی طرح یہ آریا بھی ڈھنڈاروں میں اترا اور ناس مار گیا۔ یہ وہاں نہ آتا نہ یہ سب ہوتا۔"

اس دلیل کو بے اثر ہوتے دیکھ کر وکیل نے جرح کا رخ تبدیل کر دیا۔

"یہ چاروں ملنگ پہلے بھی آپ نے دیکھے ہیں کہیں۔"

"ہاں جی مزار پر ہوتے تھے۔"

"آپ مزار پر کیا کرنے جاتی تھیں۔"

"مکھانے کھانے پر اس رات نہیں گئی تھی۔"

"یہ خود آئے تھے۔ خان نیازی کی کوٹھری میں جہاں میں بے ہوش پڑی رہ گئی تھی۔"

"آپ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ خان نیازی نے آپ کی مخبری کی اور انھیں آپ کے پاس بھیج دیا۔"

"نہیں اس نے بھیجا نہیں لیکن یہ مجھے چھوڑ کر نہ جاتا تو پھر وہ بھی وہاں نہ آتے۔"

خان نیازی یوں مضبوط قدموں پر کھڑا تھا جیسے یہ سارے الزامات کے تیر اس کے بدن پر چڑھی زرہ بکتر سے ٹکرا کر واپس پلٹ رہے ہوں۔ اور وہ ابھی بھی کھنڈروں کی

حفاظت پر مستعد کھڑا ہو۔

''کیا آپ وثوق سے کہہ سکتی ہیں وہ یہی چاروں ملنگ تھے۔ جنھوں نے آپ کے ساتھ ''برا بھلا'' کیا۔'' چنی نے چاروں کو ترچھی آنکھ سے گردن گھمائے بغیر دیکھا۔

''ڈھیر سارے تھے۔ ان میں یہ بھی ہوں گے۔''

''یعنی آپ انھیں اچھی طرح سے نہیں پہچانتیں۔''

کمرۂ عدالت میں کھلبلی مچ گئی۔

''سارے ایک جیسے ہی تھے۔''

''تھے کتنے۔''

''پانچ سات تو ہوں گے۔'' چناں نے مٹھی بند کر کے کھولی۔

''یہ چاروں ان میں شامل تھے کیا؟''

''سبھی ایسے ہی تھے۔ گھپ اندھیرے میں شکلیں تھوڑی نظر آتی تھیں۔ پر چغے ایسے ہی، ڈاڑھیاں، کریڑے والے دانت بھی۔ رالوں والی باچھیں بھی۔ کچھوں کی بو بھی ایک جیسی۔ منہ کی ہواڑ بھی سارے ایک جیسے تھے۔ الگ الگ تھوڑی شناخت ہوتا ہے۔ اجڑ ایک جیسا ہی تو ہوتا ہے نا۔''

کمرۂ عدالت میں شور مچ گیا۔ مقدمہ ہاتھ سے نکلتا محسوس ہوا۔

''وکیل صفائی مدعی کو بہکا رہا ہے۔''

این جی اوز کی عورتیں دیوانی ہو اٹھی تھیں۔ ''وکیل صفائی وکٹم Victim کو جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مغالطے میں ڈال کر مجرموں کو بچایا جا رہا ہے۔''

ہنگامی پریس کانفرنس میں وکیل استغاثہ کی بے تکی اور فحش جرح کو عورت ذات پر رکیک حملے قرار دیا گیا اور فی الفور اس کی برطرفی کا مطالبہ کیا گیا۔

حکومتِ وقت اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ وہ ہر ہلنے والے پتے کی ہوا سے بھی لرز جاتی

تھی۔ وکیل استغاثہ کو فی الفور فارغ کر دیا گیا۔ عدالتی نظام پر سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ مقامی و عالمی اخبارات میں مضامین لکھے گئے جج کی جانبداری، عورت کی مظلومیت، قوانین کے سقم پر ٹی وی شوز میں طوفانی بحثوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اندرون ملک اور بیرون ملک ایک ہنگامہ کھڑا تھا۔ عدالت، انصاف، حقوق، سیاست، معاشرت سب اس بالشت بھر چرواہی کے سامنے تھرتھرا رہے تھے۔

''سارے ایک جیسے ہی تھے۔ میں نے شکلیں تھوڑی دیکھی تھیں۔ بس چغے تھے ہرے ہرے۔ اور ڈاڑھیاں تو وہ ساروں کی ایک جیسی تھیں۔ خورے پانچ تھے کہ سات۔ خورے دس ہوں۔ ساری رات میں چیختی رہی تھی۔ کوئی بھی چھڑانے نہ آیا۔ کسی نے بھی نہ دیکھا نہ سنا۔''

اس کے اسی بیان کی بنیاد پر سیشن کورٹ سے وہ سارے بری ہو گئے۔ سوائے اس کے کہ خان نیازی کو ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ کوئی قابلِ سزا جرم ہی نہ بنا۔ این جی اوز کا احتجاج، ٹاک شوز عوام کا غم وغصہ ملک کے طول و عرض میں پھیلے حکومت مخالف مظاہرے جلاؤ گھیراؤ لاٹھیاں گولیاں.... ملزموں کے بری ہونے کے باوجود رہا نہ کیا جا سکا۔ ملک میں ایسی فضا تھی کہ اختلافِ نظر رکھنے والا کوئی زندہ بچ نہ سکتا تھا۔ احتجاج میں شریک بیشتر کو تو واقعے کی حقیقت کا علم بھی نہ تھا۔ ایک بلوائی فضا، بلوائی دہشت جس میں منطق یا دلیل نہیں صرف جذبات کا ابال ہوا کرتا ہے۔ پانی کے حمام کے نیچے ایندھن جھونکا جا رہا تھا۔ ایندھن ختم ابال ختم۔ لیکن اس انسانی حمام کے نیچے ایندھن جھونکنے والے نظر نہ آتے تھے۔

▪▪▪▪

جس میٹنگ میں یہ اصولی فیصلہ کیا گیا کہ اس نافرمان حاکم وقت کو اقتدار سے الگ کیا

جائے گا۔ اس خفیہ اجلاس میں سیاسی جماعتوں کے لیڈر، مذہبی تنظیموں کے سربراہ، کئی خفیہ اہم ہستیاں، میڈیا ہاؤسز کے مالکان اور عدالت عالیہ کے معزز جج صاحبان تشریف فرما تھے۔ سب کو اپنے اپنے کام کی نوعیت سمجھا دی گئی تھی۔

تیسری آنکھ کے خفیہ ہرکارے پورا روڈ میپ ترتیب دے چکے تھے۔ اس پوری احتجاجی تحریک کو چلانے کے لیے جو کثیر بجٹ مختص کیا گیا تھا۔ اس کا اندراج کسی بینک اکاؤنٹ میں نہ تھا۔ یہ وہ رقوم تھیں جن کا کبھی آڈٹ نہیں ہوسکتا۔ جن سے متعلق کوئی سوال نہیں کرسکتا۔ سوال کرنے والا غدارِ وطن کہلاتا ہے اور غدارِ وطن کی سزا خود آئین میں درج ہے۔ ملک وقوم سے غداری کا مجرم ہے ہر وہ شخص جو اس سماوی والہامی بجٹ کے مصرفات کا سوال بھی زبان پر لائے اور یہی جرم حکومتِ وقت کے سر پھرے سربراہ سے سرزد ہو چکا تھا اور اب وہ گردن زدنی قرار دیا جا چکا تھا۔

شہر کی تاجر تنظیموں کو شٹر ڈاؤن ہڑتال کے لیے بڑی رقوم مختص کی گئیں۔ وکلا تنظیمیں، گدی نشین، میڈیا اینکرز کے علاوہ ہر حکومت میں ہمیشہ وزیر/مشیر رہنے والے تیسری آنکھ کے مستقل مہرے جو اس حکومت میں بھی کلیدی عہدوں پر موجود تھے۔ سب کو منہ مانگے داموں اس تحریک میں شامل کیا گیا۔

ملک کے وہ چند افراد جو پوری معیشت کو اپنی مٹھی کی چابی سے گھماتے ہیں۔ جو الیکشنوں میں ان گھوڑوں پر پیسہ لگاتے ہیں جن کی راس ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان گھوڑوں کا انتخاب وہ اسی تیسری آنکھ کے اشارے پر کرتے ہیں۔ یہ تیسری آنکھ جس ماتھے پر لگی ہے وہ سلمانی ٹوپی میں چھپی رہتی ہے۔ صرف اشارے کی ضرورت پر ٹوپی سے اشارہ زنی کرتی ہے لیکن غداری کا یہ جرم اس قدر سنگین تھا کہ اس بار تیسری آنکھ یہ ٹوپی اتار کر برہنہ ہوگئی اور یہ موقع ہڑپا کی اس چناں نے فراہم کر دیا تھا۔ جس موقع کی تلاش مدت سے جاری تھی۔ قدرت نے ان کھنڈروں میں سے اچانک برآمد ہو جانے والی قیمتی مورتی کی

طرح نکال سامنے کیا تھا۔ ملک کی فضا ایسی ہیجانی بنا دی گئی تھی کہ اب اس طوفان کا رخ کسی بھی سمت موڑا جا سکتا تھا۔ اس منہ زور طاقت سے من چاہا کام لیا جا سکتا تھا۔ اب اس طاقت کو اخراج چاہیے تھا جو کسی کے بھی مقاصد کو پورا کرنے کا ہدف ہو سکتا تھا۔

لوہا اتنا گرم کیا جا چکا تھا کہ آخری چوٹ لگانے کا وقت آ گیا تھا۔ اس پگھلتے سیال کا رخ من مرضی کی سمت موڑا جا سکتا تھا۔ ٹھوس حالت میں آنے سے پہلے حسبِ ضرورت بت ساخت کیا جا سکتا تھا۔

میڈیا نے بخار چڑھا دیا تھا۔ اس حادثے کا ذمہ دار براہ راست حکومتِ وقت کو ثابت کیا جا چکا تھا۔ عوام کے اذہان میں نفرت کا زہر بھر دیا گیا تھا۔ مفتیان نے فتویٰ جاری کر دیا تھا۔

نیل کے ساحل پر کتا بھی بھوکا مر گیا تو اس کا جوابدہ حاکم وقت ہوتا ہے۔ یہ مرا ہوا کتا زندہ کرنے کو ریاست کے سبھی ستون یک مشت ہو گئے تھے۔ جن کی آبیاری وہ دولت کر رہی تھی جو ملک کی اشرافیہ کو عطا ہوتی ہے۔ اسی تیسری آنکھ کے میچ لینے سے اسی آنکھ کی مہمیز سے اس کی جگہ ادل بدل ہوتی رہتی ہے۔ ناپسندیدہ حاکم وقت کے خلاف عدالت عالیہ نے سوموٹو لے لیا تھا اور ذاتی حیثیت میں پیش ہو کر جواب طلب کیا گیا تھا۔ فاضل منصفوں نے اس نافرمان اور خودسر کے کردار اور اخلاق کی وہ دھجیاں اڑائی تھیں کہ اگر اس میں غیرت کی رتی بھی ہوتی تو عہدے سے ہی نہیں زندگی سے بھی دست بردار ہو جاتا۔ لیکن وہ ڈھیٹ انسان پہلے بھی اس زور زبردستی کے عمل سے گزر چکا تھا۔ اسی لیے زیادہ ڈھیٹ ہو چکا تھا۔ پورا عدالتی نظام، انتظامیہ تیسری آنکھ سے اشارے وصول کر کے فیصلے سنا رہے تھے اور انھیں نافذ کروا رہے تھے۔ اسی انتظامی مشینری سے جو ناپسندیدہ حاکم کی حکومت کے کل پرزے تھے۔ اب اسی کے خلاف استعمال ہو رہے تھے۔ کیونکہ اس بستی میں بھینس اسی کی ہوتی تھی جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی۔ چنی چرواہی کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ذمہ دار

یہی ڈھیٹ حکمران قرار پا چکا تھا۔ عوام کی سوچ ذہن اور اعصاب کو میڈیا اینکرز نے اپنی مٹھی میں جکڑ رکھا تھا۔ جو تاریخ اور مذہب سے تاویلیں تلاش کر کے بتاتے تھے کہ ریاست میں ہر غلط کاری کا جوابدہ حاکم وقت ہوتا ہے۔

عوام وہی سوچتے تھے وہی سمجھتے تھے جو میڈیا انھیں سوچنے اور سمجھنے کو پیش کر رہا تھا۔ اسی کی مانگ تھی جو بیچنے والے بیچنا چاہتے۔

اگر کسی اینکر نے ہوا کے رخ کے الٹ کچھ کہنے کی کوشش کی تو پھر اس پر ملک دشمنی، غداری کا مقدمہ عدالت عالیہ میں دائر ہو گیا۔ وہ دشمن ملک کا ایجنٹ ثابت کر دیا گیا۔ سادہ لوح عوام کے حب الوطن جذبات سے کھیلنے والا نفرتوں اور گالیوں کا ہدف۔ پوری عوامی فطرت کے غیض و غضب اور متشدد جذبات کے نکاس کا ہدف۔ اٹھوا لیا گیا، مروا دیا گیا یا پھر عبرت کا نشان بنا دیا گیا۔

سچ وہ تھا جس سمت تیسری آنکھ اشارہ کرتی تھی۔ حب الوطنی وہ تھی جس کا حکم تیسری آنکھ صادر کرتی تھی۔ اختلافِ رائے کی جرأت کرنے والا ملک وقوم کا غدار تھا۔ جسے عدالتِ عظمیٰ دیدۂ عبرت نگاہ بنا دیتی تھی۔

تیسری آنکھ کے اشارے کو سمجھنے والوں پر ہن برس رہا تھا۔ ان کے کاروبار یورپ و امریکہ میں پھیل رہے تھے۔ ان کی دولت میں دن دوگنا رات چوگنا اضافہ ہو رہا تھا۔ سارے اقتدار اور عہدے، سارے قانون اور آئین، سارے عدل اور انصاف، سارے فیصلے اور مقدر ان کے ہم رکاب ہو جاتے تھے۔ یہ ذرا سی چناں کس قدر منافع بخش پروڈکٹ بن چکی تھی۔ کتنی توانائیاں اس پر خرچ ہو رہی تھیں۔ ''جسٹس فار چناں'' کے بینرز پورے ملک میں لہرا رہے تھے۔

چناں جن تنظیموں کے ہاتھوں میں تھی وہی طے کرتی تھیں کہ ملکی اور غیر ملکی شوز میں اس کے چارجز کیا ہوں گے۔ انٹرنیشنل میگزینز کے کور ٹائٹل پر اس کی تصویر کتنے میں چھپے گی۔

انٹرویو کس کو اور کتنے میں دیا جائے گا۔

چناں کا ایک ایک منٹ بکتا تھا۔ یہ ساری قیمتیں کہاں استعمال ہو رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ اسے روسٹ بروسٹ کوکے کولے اور چائے بسکٹ کھلائے جاتے ہیں۔ جیسے بالی کو ڈھابے پر کھلائے جاتے تھے تو یہ سارے پیسے اسی میں کٹ جاتے ہوں گے۔ یہ نت نئے فیشن کے کپڑے، میک اپ، جوتے مفت میں تھوڑی آتے ہیں۔ چناں کو بعض اوقات لگتا وہ تماشے والی بندریا یا دولے شاہ کی چوہیا ہے۔ جسے ڈگڈگی بجا کر گلی گلی گھمایا اور پیسے مانگے جاتے ہیں۔ وہ سانپ ریچھ والے تماشے میں سانپ یا ریچھ ہے۔ وہ جادو والے تماشے میں بچہ جمورا ہے جس کے کرتب پر پیسے برستے ہیں۔

اور پھر عدالت نے جس روز ملزموں کو ضمانت پر رہا کیا تو یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ آخر ان کی زرِضمانت دی کس جری نے تھی اور کسی منصف کو یہ ضمانت منظور کرنے کی جرأت ہو کیسے گئی۔ دم سادھے بیٹھے تاریخ پر تدبر کرنے والوں کو معلوم تھا کہ یہ کس اشارۂ ابرو کا کمال ہے۔ بس اس روز سے احتجاج متشدد ہو گیا۔

عوام سر کٹانے کو نعرے لگاتے گھروں سے نکل آئے۔ فورسز نے آنسو گیس کے شیل ہی نہیں احتجاجی جلوسوں پر سیدھی گولیاں چلا دیں۔ جو براہ راست ٹیلی ویژن سکرین پر ہر ہر چینل نے دکھائیں۔ اس فائرنگ میں خصوصاً عورتوں اور بچوں کو ٹارگٹ کیا گیا۔ ناظرین نے اس دلچسپی سے بار بار دیکھا جیسے کوئی ھارر مووی۔ مرتے ہوئے بچے بہتے ہوئے لہو، اُڑتے ہوئے پارچے۔ اس فائرنگ کا حکم کس نے دیا کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ ان ہلاکتوں کی ویڈیوز بار بار ہر چینل پر سلوموشن میں دکھائی جا رہی تھی۔ جن جلسوں کی کوریج چوبیس گھنٹے ٹی وی سکرین پر کی جا رہی تھی۔ اُنہی پر سیدھی گولیاں برسائی جا رہی تھیں۔ حکومتِ وقت اتنی بے بس ہو چکی تھی کہ اس کے احکامات کی پیروی کوئی کانسٹیبل بھی کرنے کی جرأت نہ کر رہا تھا۔ ایک زیریں سطح حکومت مروج تھی۔ جس کی پیروی عدلیہ سے

انتظامیہ تک لازم تھی۔ کب اور کہاں سے احکامات جاری ہو رہے تھے۔ نام نہاد حکمران سب جانتے ہوئے بھی کچھ بتا نہ سکتا تھا۔ بے بس حاکم کی معطل حکومت تماشا گاہ اور عبرت نگاہ بنا دی گئی تھی۔ انھیں بھی احکامات کی پیروی کی خبریں ٹی وی کے ذریعے موصول ہو رہی تھیں۔ جو انھوں نے کبھی دیے ہی نہ تھے لیکن نشر اُن کے نام سے ہو رہے تھے۔ جن میں اخلاق، تہذیب، انسانیت کے پرخچے اڑا دیے گئے تھے۔ جس طرح ہمارے آئینی محافظ دن رات دشمن کے پرخچے اڑانے کی نوید قوم کو سناتے رہتے تھے۔ بالکل اسی طور اس اندرون ملک دشمن کے پرخچے اڑائے جا رہے تھے۔ ٹی وی چینلز کے اشتہارات تک روک دیے گئے تھے کیونکہ معاوضہ کئی گنا بڑھا کر ایک ایک منٹ خرید لیا گیا تھا۔

اینکرز کے تبصرے، مرنے والوں کے لواحقین کے انٹرویوز جو بڑی محنت سے انھیں رٹائے جاتے تھے جو حکومت وقت کو اپنا مجرم ٹھہراتے تھے۔ وزیر اعظم سے لے کر وزرا تک ہر قتل کی ایف آئی آرز اُن پر کاٹی جا چکی تھیں۔ عدالتیں دن رات حتیٰ کہ چھٹی والے دن بھی فیصلے سنا رہی تھیں۔ سبھی کا ٹارگٹ وہ ڈھیٹ بے بس حکمران تھا جو سب گنوا کر بھی استعفا پیش کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس ایک استعفا کے لیے پورے ملک کی معیشت، کاروبار، تعلیم اور طالب علموں کا اخلاق اور کردار داؤ پر لگا تھا۔ لیکن یہ کیسا بدبخت تھا کہ استعفا دے کر نہ خود نجات پاتا تھا نہ عوام کو نجات دلاتا تھا۔

تیسری آنکھ کے اشارے سے روگردانی کا جرم ایسا بھیانک جرم تھا جو آج تک کسی سے سرزد نہ ہوا تھا۔ یہ جرم کرنے والا ہمیشہ نشانِ عبرت بنا دیا گیا تھا۔ پورا ملک، ادارے، آئین، انصاف، قانون و فرائض سب ایک طرف اور وہ تیسری آنکھ ایک طرف۔ ہمیشہ اس تیسری آنکھ والا پلڑا ہی جھکا تھا اس ریاست خداداد میں۔ معیشت تباہ ہو رہی ہے تو ہو جائے۔ تیزی سے ترقی کرتی سٹاک مارکیٹ اسی تیزی سے منہ کے بل گرتی ہے تو گر جائے۔ مسلسل ہڑتالوں سے عام آدمی کا جینا دوبھر ہو چکا تھا۔ کاروبار ٹھپ، بازار بند،

املاک جل رہی تھیں۔ ملک برباد۔ اس بربادی کو وہ سپانسر کر رہے تھے۔ جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اسی لیے وہ ہر بھینس کو ہانکنے کا پورا استحقاق رکھتے تھے۔ جو اس آگ میں بارود کی طرح ملکی خزانہ جھونک رہے تھے۔ اس ناپسندیدہ اور نافرمان کو اقتدار سے باہر کرنے کے لیے وہ ملک کو کسی بھی انتہا سے دوچار کر سکتے تھے۔ اس ملک کے سیاہ وسفید کی مالک یہ تیسری آنکھ حکم عدولی کے مرتکب حکمران کو مزا چکھانا چاہتی تھی۔ یوں کہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں کہ آئندہ کسی کو حکم عدولی کی جرأت نہ ہو سکے چاہے وہ ملک کی سلامتی اور عوام کی تباہی کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔ ورنہ تو ہر کہہ ومہ من مانی کرنے لگ جائے تو پھر یہ نظام چلے کیسے۔ اور وسیع تر قومی مفاد کی حفاظت کے لیے تو قوم ہر قربانی دینے کو تیار تھی۔ اُن کے لیے جو بالادستی کے، استحکام کے محافظ تھے اس لیے ہر آئین اور قانون سے بالاتر تھے۔ وہ سب جو کرنے کا پورا استحقاق رکھتے تھے۔ وہ کوئی دوسرا کرے تو آئین شکن اور غدار کہلائے۔ کیونکہ ان کے پاس طاقت تھی۔ اس لیے کچھ بھی کرنے کی اجازت تھی جیسے آریاؤں کے پاس طاقتور گھوڑے تھے جو اپنی ٹاپوں تلے سب روند سکتے تھے۔ دھات کے بنے تیز دھار ہتھیار تھے جو کوزے اور مرتبان بنانے والوں کو چیر پھاڑ سکتے تھے۔ ان کے پاس تنومند جسم تھے اس لیے ان کمزور ہیئت والے دراوڑوں کو ساری ہنرمندیوں سمیت نیست ونابود کر سکتے تھے۔ ان کے مذہب، عقیدے، آئین قانون اصول قواعد سب ملیامیٹ کر سکتے تھے۔ کیونکہ وہ مضبوط گھوڑے تیز دھار ہتھیار اور تنومند جسامتیں رکھتے تھے۔

قانون وہی تھا جو انھیں فائدہ دے سکتا تھا۔ آئین وہی مانا جاتا تھا جو انھیں تحفظ دیتا تھا۔ اخلاق اقدار وہی تھیں جنھیں وہ نافذ کرتے تھے۔ اس ہڑپائی تہذیب میں آج تک ان اصولوں میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا نظریہ ازل تا ابد نافذ تھا۔

اس چنی چرواہی نے ملک کے ایوانوں کو ہلا ڈالا تھا۔ حکومتِ وقت لرز رہی تھی اور کسی

بھی وقت منہ کے بل گر سکتی تھی۔ اسے گرانے کو ملک کے اعلیٰ ترین ادارے دن رات جوڑ توڑ میں مصروف تھے۔ وسیع تر قومی مفادات کی خاطر ملک کی اعلیٰ عدالتیں ہفتہ وار تعطیل کو بھی عدالت لگاتی اور از خود نوٹس کے ذریعہ حکومتِ وقت کے ہر کام ہر حکم اور ہر ترقیاتی منصوبے کو معطل کر رہی تھیں۔ سب وزیروں، افسروں کو ہر روز پیشیاں بھگتنے پر لگا دیا گیا تھا اور عقوبت خانوں میں سڑنے کو چھوڑ دیا گیا تھا۔ حاکم وقت کے تمام ترقیاتی منصوبوں پر کرپشن کے الزامات لگا کر متعلقہ افراد کو وعدہ معاف گواہ بننے کی پیشکش کی جاتی تھی۔ جو قبول کر لیتا تھا وہ انعام واکرام کا سزاوار ٹھہرتا۔ جو انکار کی جرأت کرتا تھا اسے تماشائے عبرت نگاہ بنا دیا جاتا تھا۔

وسیع تر قومی مفادات کی خاطر سارے ملکی ادارے ان منکرین کے خلاف بدعنوانی کے کیس بنانے پر جتے تھے۔ حکومت وقت کے خلاف میڈیا چینلز پر کرپشن کے کیس بنائے جاتے۔ خود ہی مدعی خود ہی وکیل خود ہی منصف بنتے اور فیصلے سناتے۔ جن میں حاکم وقت کو تاریخ کا بدعنوان ترین حکمران ثابت کر دیا جاتا۔ ڈھیٹ اور نافرمان حکمران پیشیاں بھگت بھگت کر عدالتوں سے باہر نکلتا تو عوام کا بپھرا ہوا ہجوم اس پر گالیاں اور پتھر پھینکتا اور نفرتوں کے تازیانے برساتا۔

لیکن وہ ڈھیٹ مستعفی ہونے پر کسی صورت رضامند نہ تھا۔

یہ تیسری آنکھ جو سبھی طاقتوں کی مالک تھی۔ ان پست قد، دست کار دراوڑیوں کی جرأت کہ وہ ہتھیار بند کے سامنے کھڑے ہونے کی طاقت حاصل کریں۔ کچھ عرصہ قبل بنگال میں بسنے والے دراوڑوں نے یہ جرأت کی تھی۔ ان طاقت ور آریاؤں نے ان سے وہ انتقام لیا کہ ان کی نسلیں بگاڑ دیں۔ ان غیوروں نے اپنی غیرت ہر قیمت پر بچا لی تھی ریاست کے بدن پر چاہے نا قابل تلافی زخم آئے ہوں لیکن قوم کو اپنے محافظوں کی حفاظت کے لیے قربانیاں تو دینا ہی پڑتی ہیں۔ یہ چنی چناں مسلن ہڑپا کی چرواہی ملکی وقومی سطح پر

لڑی جانے والی قومی مفادات کی اس جنگ میں قدرت نے چارے کی صورت میں پیش کر دی تھی۔ یہ قدرت بھی اپنے جیسے طاقتوروں کے ہمرکاب ہو جاتی ہے۔

بیس افراد کے قتلِ عام کی وڈیوز ٹی وی چینلز ہر ہر زاویے سے بار بار چلا رہے تھے۔ خون میں لت پت مرتی ہوئی عورتیں اور بچے، پچکے ہوئے بھیجے، لہو اگلتی آنکھیں، مسخ شدہ چہرے، بے گناہ معصوم لاشے، بار بار اور مسلسل دکھائے جاتے۔ معصوم بچے خوفزدہ ہو کر ماؤں کی گودی میں آنکھیں میٹ لیتے لیکن ان کے جذبات کی کسے پروا تھی۔ مقصد ہی صدمہ پہنچانا تھا۔ دیکھنے والوں کے جذبات مشتعل کرنا تھا۔ یہ سیدھی گولیاں کس کے حکم سے چلائی جارہی تھیں۔ حکومتِ وقت کے وزیر مشیر خود حیران و پریشان تھے۔ ریاست کے اندر خفیہ ریاست وہ نظام جو دکھتا نہیں ہے لیکن اصل اقتدار اسی تیسری آنکھ کی جنبش پر قائم ہوتا ہے۔ تقدیریں بنانے والے، قسمتیں لکھنے والے، اچھا یا برا مقدر دینے والے، موت اور زندگیاں بانٹنے یا چھین لینے والے، زمینی خدا یہی تو ہیں۔ ان کی طاقت، اقتدارِ اعلیٰ کی حقیقت جاننے سمجھنے کے باوجود حکم عدولی کی جرأت کرنے والا یہ ڈھیٹ حکمران عبرت کا نشان بنا دیا جائے گا۔ ہر کوئی جانتا تھا۔ ہواؤں اور موسموں کی موافقت پر ہجرت کرنے والے پرندے اسے چھوڑ چھوڑ کر موافق موسموں کی سمت پروازیں بھر رہے تھے۔ وہ تنہا ہو رہا تھا۔ اس پر لگے الزامات سچ ثابت کرنے کو پورا نظام برسرِعمل تھا۔ اس پورے نظام کو حرکت دینے والی یہ چنی تھی۔ ہڑپا کے کھنڈروں کی بے وقعت چرواہی۔ بے قیمت پتھر جس کے کھسکنے سے پورا پہاڑ دھڑام سے آن رہتا ہے۔ ساری سڑکیں انفراسٹرکچر تباہ و برباد۔ یہ وہی ذراسی وٹی یا گیٹی تھی جو بہانہ بنتی ہے۔ جان لیوا لینڈ سلائیڈنگ کا کتنی اہم تھی یہ ذرا سی چرواہی اس ملک کے دستوروں کے لیے۔

▪▪▪▪

یہ جو سکیورٹی رسک تھا ملکی سلامتی کے لیے خطرہ تھا۔ ملک دشمن عناصر کا سرغنہ تھا۔ یہ جو دشمن ملکوں کا ایجنٹ اور غدارِ وطن تھا۔ یہی کبھی اس تیسری آنکھ کا منظورِ نظر بھی رہا تھا۔ جسے اقتدار میں لانے کے لیے کبھی اس وقت کے مخالفین کے خلاف بھی ایسا ہی جال بچھایا گیا تھا۔ ایسی ہی شطرنج کی بساط بچھا کر انھیں بھی شاہ مات دی گئی تھی۔ انھیں ملک دشمن غدارِ وطن سکیورٹی رسک قرار دے کر اسے تخت پر بٹھایا گیا تھا۔ وہ تخت جو چار حبشی غلام اٹھائے رکھتے ہیں یہ چاروں انتہائی مضبوط اور حکم کے گولے ہیں۔ جو تیسری آنکھ کی ہر ہر جنبش سے آگاہ رہتے ہیں۔ جونہی کوئی حرکت ناگوارِ خاطر گزرتی یا طے شدہ فارمیٹ سے متجاوز ہوتی ہے۔ وہ چاروں اپنے لوہے کے کنٹوپوں میں چھپے بڑے بڑے سر نفی میں ہلاتے اور حکم کا بادشاہ ڈول جاتا اور دھڑام سے ان کے قدموں میں آن گرتا ہے۔

لیکن اب کی بار یہ حکم کا غلام یکہ بننے کی جسارت کر بیٹھا تھا اور تیسری آنکھ کے غضب کو للکار رہا تھا۔ اور اب اسے رنگ کی چال کی مات ہونے والی تھی۔

▪▪▪▪

اس منصوبے کو کوڈ ورڈ دیا گیا تھا۔ ''کل دی بلیک کیٹ'' اس مشن کی بریفنگ ہر ہفتے دیگر ارکان کو دی جاتی تھی۔ مشن ''کل دی بلیک کیٹ'' پر پیش رفت سے آگاہ کیا جاتا۔ ہر ایک کو اس کی ذمہ داریاں سمجھائی جاتیں اور فنڈز ریلیز کیے جاتے۔ تیسری آنکھ کے ہٹتے ہی حلق میں سنٹھ ہوئے قہقہے چاروں اور سے ایک دوجے پر حملہ آور ہوتے۔ ڈن ہل کے مرغولے اڑاتے۔ بلیک وسکی کی چسکیاں لیتے۔ جھینگوں، تیتروں اور چنکارا ہرن کے نمکین گوشت کو چکھتے اور اپنے فنڈز پر ٹوٹ پڑتے ہر ایک کو اس سے زیادہ کی امید تھی۔ وہ اسے اگلی قسط سمجھ کر قبول کرتے اور اس مشن کو مزید طول دینے کی حکمت عملی دل ہی دل میں بناتے رہتے۔ انتہائی ٹیکنیکل بنیادوں پر اس منصوبے کو کامیاب بنانے کی کاوشیں جاری تھیں اور

اس کی ناکامی کے زیرِ و چانسز رکھے گئے تھے۔ اس لیے سیکنڈ اور تھرڈ ڈیفنس لائن بھی طے کی جا چکی تھی۔

اور اب سیکنڈ ڈیفنس لائن میں آخری فورس جھونک دی گئی تھی۔

اس ڈھیٹ حکمران ننگِ وطن ننگِ قوم کے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا گیا تھا۔

ہر ہر گلی کے تہ خانوں میں طویل سرنگیں بنے مدرسوں میں سے ٹخنوں تک شرعی شلواریں چڑھائے اور حرم پاک سے لائی گئی ٹوپیاں سروں پر جمائے طالب علموں کی کھیپ در کھیپ نکل رہی تھی۔ جن کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ یا شاید ابھی دو چار سال کی دیری تھی۔ جو صرف یہ جانتے تھے کہ کوئی شخص گستاخِ رسول کا مرتکب ٹھہرا ہے۔ کیسے، کیوں، کب سے، یہ جاننا ان کے دائرہ عمل میں آتا ہی نہ تھا۔ ان کے لیے بس اتنا جاننا کافی تھا کہ اس گستاخ کی وجہ سے اسلام خطرے میں ہے۔ کوئی نبی آخر الزماں ﷺ کی شان میں گستاخی کا مرتکب ٹھہرا ہے۔ کیوں کیسے یہ سوال تو ان کے دائرۂ اختیار میں تھا ہی نہیں۔ دماغ کی افزائش جس سانچے پر ہوئی تھی اس میں 'کیوں'، 'کہاں'، 'کیسے'، 'کیا' جیسے لفظ ڈالے ہی نہ گئے تھے۔ جن احکامات سے ان کے دماغوں کے چراغ جلتے تھے، ان احکامات میں استفہامیہ کہیں استعمال نہ ہوتا تھا۔ صرف پیروی کا حکم تھا۔ یہ نو عمر جہادی اپنے اساتذہ کی قیادت میں چھوئیاں چڑھے ڈنڈے لہراتے نعرۂ جہاد، نعرۂ شہادت بلند کرتے بڑھے چلے آتے، چڑھے چلے جاتے۔ جن کے گرم خون کو مزید گرمانے کو لاؤڈ اسپیکروں پر مذہبی ترانے بجائے جاتے تھے۔ کفر کے فتاویٰ دہرائے جاتے تھے۔ گستاخ کی تقریر کے ٹوٹے سنائے جاتے تھے۔ ہے وہ بدبخت جس کے وجود کے چیتھڑے اڑا دینا عین ثواب ہے اور اسے جہنم واصل کرنے کی سعادت حاصل کرنے والا جنتی ہے۔

ایسا جوش، جذبہ اور کٹ مرنے کی ایسی آرزو اور اپنی اپنی حوروں کے پہلو گرمانے کی ایسی شتابی کہ دنیا کی ایک بڑی فورس انتہائی جدید خطوط پر تربیت یافتہ فورس پہلے ہلے میں

ہی پسپا ہوگئی تھی اور ان کے لیے سب دروازے کھلتے چلے گئے تھے۔ بلوائی حساس عمارتوں پر علاقوں پر قابض ہو گئے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے ان کے سامنے بے بس ہوتے چلے جا رہے تھے۔ پسپائی اختیار کرنے کے احکامات عالم غیب سے مل رہے تھے۔ حاکمِ وقت کے احکامات ہوا میں تحلیل ہو رہے تھے۔

یہ سب اس ذرا سی چناں کے تحفظ کے لیے ہو رہا تھا۔ جو نہیں جانتی تھی کہ آخر اس نے کون سا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ جس کا انعام اسے اس صورت میں مل رہا ہے۔

لگتا تھا کہ چنی کوئی پاک کتاب ہے۔ جو پرچھتی پر سے گر گئی ہے جس کے تلے موتیوں والے غلاف میلے ہو گئے ہیں۔ صفحے پیروں تلے کچلے گئے ہیں وہ کوئی خانہ کعبہ کا کنگرا تھی۔ جو ہل گیا ہے جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔

....

رشید خان نیازی

چناں نے سوچا یہ جو بالی کو چائے بسکٹ اور کوکے کولے پلاتے ہیں کتنے گندے کالے بھتے۔ با آواز گندی ڈکاریں مارنے والے، دھوتیوں میں کھجانے والے، جن کے جسموں کی بدبو اور سانسوں کے تعفن میں بالی نجانے کیسے کھایا پیا ہضم کر لیتی ہے۔ ایک وہ آریا جس کی آنکھوں سے شہتوت کی گولھوں سا رنگ رس ٹپکتا ہے۔ جس کی گردن شیش ناگ کے پھن سی اکڑی ہے۔ جس کے قدم مشکی گھوڑے کی ٹاپوں سے پڑتے اور چنگاریاں اُڑاتے ہیں۔

جس کا نام رشید خان ہے۔ یہ سارے ماہنے، چھبے، بگے، کالے بھتے، نیچ اور حقیر مخلوق۔ مٹی کی دراڑوں میں سے لقمے چننے والے۔

وہ تو پورا رشید خان، جسے افسر بھی خان نیازی کہتے۔ گورے مسٹر کہہ کر بلاتے ہیں۔ اگر یہاں کوئی دوسرا رشید ہوتا تو وہ کب کا شیدا بن چکا ہوتا۔ شیدا پہرے دار۔ چھیدا ماچھی، شیدی نائی، چھیدو موچی۔

یہ تو رشید خان صاحب ہے، آریا صاحب، آریا خان صاحب۔ اگر وہ بھاگی بھی تو لوگ کہیں گے خان نیازی چنی کو بھگا لے گیا۔ بالی کی طرح کر مانیاری والا نہیں۔

اُس کے ساتھی پہرے دار تو سارے چھبے، ماہنے، کالے، بگے لیکن یہ سارے کالے بگے اسے خان نیازی کہہ کر پکارتے تو چنی کی گردن فخر سے اکڑ جاتی جیسے اُس کا نام چنی سے چاند بی بی ہو گیا ہو۔ بلکہ چاند نیازی ہو گیا ہو۔ اتنے سارے پہرے داروں میں سے یہ عزت صرف اسی کو کیوں ملتی تھی۔

نجانے اُس میں ایسا کیا تھا کہ اس کے نام کو بگاڑنے یا تصغیر کرنے کی جرأت کسی بڑے افسر کو بھی نہ ہو پائی تھی۔ بالی تک کو نہ ہو پاتی، وہ بھی چھیدو شیدا کی بجائے نیازی ہی کہتی۔

جو دن بھر آوازے لگاتی رہتی تھی۔

"اوئے چھوٹے کو کے کو لے پلا پلا کر نرا ٹھنڈا ٹھار کر دیا ذرا کڑک سا دودھ پتی لا۔ ساتھ میں نائیس بسکٹ بھی بل چاچے چھبے کے کھاتے میں ڈال دے۔"

چھبا تیورا کو اُٹھتا۔ دھوتی کے بل کھل کھل جاتے۔ وہ دونوں ڈب اُڑستے ہوئے غصے اور خوشی سے جھولتا۔

"نہ میری ماں تو میرے باپ کے گھر میں بستی ہے۔"

"نہ تیرا باپ مجھے بسانے کے قابل ہے کیا۔"

کینٹین سے اُٹھنے والے قہقہوں کی گولیوں سے سایہ فگن صدیوں پرانے ون کی ہر ہر شاخ سے پرندوں کے پرے ساں ساں کی آوازوں سے اُڑتے۔

اچھا ماہنے کے حساب میں ڈال دے۔

جھنڈ کے چھتناروں سے کوئل کو کنے لگتی، جو کبھی نظر نہ آتی شاید اُس کی آواز کا سحر اسی پوشیدگی میں ہے۔ بالی سیاہ ناگن گت کمر پر یوں پٹختی جیسے ماہنے کی پیٹھ پر کوڑا مارا ہو۔

کھنڈر ہڑپا
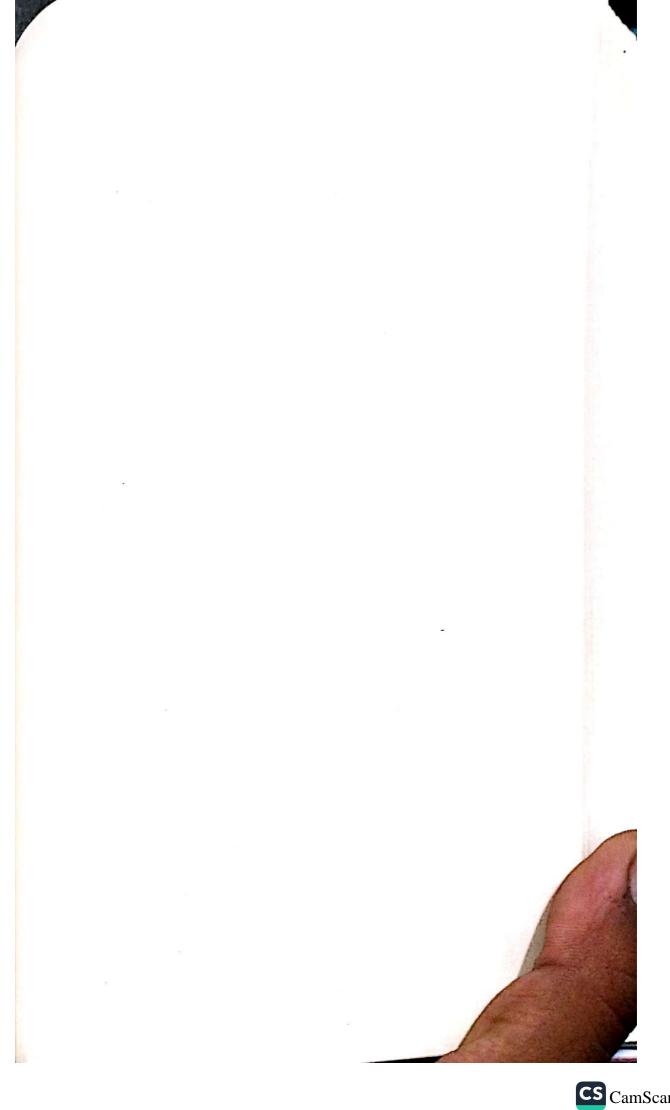
ملی

صنوبر ان تین چار برس میں اپنے بدن میں برپا ہونے والی شرمناک تبدیلیوں کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ ہر مہینے کے اختتام پر اسے گندی ٹاکیاں چوری کرنی ہیں۔ یہ ٹاکیاں وافر تعداد میں نہ ملنے کی وجہ سے اطراف بدل بدل کر بار بار استعمال کرنا ہیں۔ جب وہ شرابور ہو کر ٹپکنے لگ جائیں تو پھر پہلے سے استعمال شدہ خشک اکڑی ہوئی ٹاکیوں کو دوبارہ جاہنگوں کے بیچ پھنسا لینا ہے۔

بچپن میں جب اسے باہر نکلنے کی اجازت تھی تو انہی کی ہر سو رل پڑی رہتی تھی۔ ہراڑوڑی کے ڈھیر پر کھیتوں میں، رڑے میدانوں میں۔ خصوصاً بارش کے بعد تو جیسے ہر کہیں دھوبی گھاٹ لگا ہو جیسے خدا کی پوری زمین سندھی رلی میں تبدیل ہو چکی ہو۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ جھاڑو لے جاتی اور پھیر کر اس نایاب خزانے کو سمیٹ لیتی۔ اس وقت اس سے قیمتی کوئی دوسری شے نہ ہو سکتی تھی لیکن وہ اس خزانے کی مالک کیسے ہو سکتی تھی۔ اسے تو اس کھیت میں سے بھی جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔ جس میں سے باڑے کی صورت حال کا جائزہ لینے کو بڑی بی بی جی دن میں کئی بار جھانکتی تھیں۔ وہ تو اپنی جان کے دشمن اس تبدیل

شدہ بدن کو اکلوتی گرم چادر میں کس کے باندھے رکھتی، ریڑھ کی ہڈی دوہری کیے پھانچھا
گرمیوں کی امس بھری طویل دوپہریں ہوں کہ حبس نچڑتی، وجود کا پسینہ پگھلاتی جہنم خیز
راتیں ہوں۔ اس گھٹڑی وجود کی گرہ سوتے میں بھی کبھی ڈھیلی نہ پڑتی۔
بڑی بی بی جی کی نظروں سے وہ خود کو کونوں کھدروں میں چھپائے رکھتی۔ لیکن ان کے
غصے کی کمان سے چھٹے طنز کے تیر اسے ہدف کرتے ہی رہتے۔

''پاگل! گرمیوں میں بھی گرم چادر لپیٹے رکھتی ہے۔ نہ مم نکالتی نہ چھپانے پڑتے۔
جا دفع ہو جھلے ملی کے ساتھ جا کر بیٹھ جا۔ پاگل گدھی۔''

ان جسمانی تبدیلیوں کو مکمل ہوئے بھی تین چار برس گزر گئے۔ لیکن اس ناکردہ گناہ
کی سزا اسے شاید عمر بھر بھوگنا تھی۔ کاش اسے ملی کے ساتھ بیٹھنے کی اجازت مل جاتی۔ تو خوشی
کے احساس سے بھی وہ واقف ہو جاتی۔ اس کے محسوسات کو دکھ کا پہلا احساس بھی اسی ملی
نے ہی بخشا تھا۔ یہ ملی ہی تھا جس نے اس کے اندر تحقیر اور تذلیل سے نفرت پیدا کی تھی۔ یہ
ملی ہی تھا جس کی وجہ سے بہت بچپن میں اس کے اندر ممتا کا جذبہ بیدار ہوا تھا۔ ٹیڑھی لرزتی
ٹانگیں چھوٹا سر اور ٹیڑھے جبڑے سے رالیں ٹپکاتا ہوا ملی پیچھے لگے بچوں کے غول.... پتھر
روڑے تھپڑ گھونسے لاتیں کھاتا وہ ڈھینچوں ڈھینچوں ہنستا تو اسے ہنسی سے نفرت محسوس
ہوتی۔ ہنسی سے نفرت بھی اسی ملی کی دین تھی۔ جب وہ پتھر چھمکیں کھاتے ہوئے تکلیف
سے روتا، رالیں اور آنسو ٹیڑھے جبڑے پر آمیز ہوتے کھلے منہ سے لعاب کے تار تالو اور
زبان کو تر از و کر دیتے۔ اسے آنسوؤں کا دکھ بھی پہلی بار اس ملی سے ہی ملا تھا۔

ملی کی ہیبت کذائی پر قہقہے لگاتے کسان چرواہے اور گلیوں سے گزرتے مرد و زن....
اسے قہقہوں سے نفرت بھی تبھی ہوئی تھی۔ قہقہہ احساس برتری کا تحکمانہ اظہار، برتری اور تضحیک
کے احساس کی سرخوشی۔ اسے سرخوشی کے احساس سے نفرت بھی اس ملی نے دلائی تھی۔

ان سارے جذبوں کا پہلا پہلا احساس اس کے اندر ملی نے ہی جگایا تھا۔ پھر یہ

سارے احساسات اس کے وجود کو یوں لپیٹ گئے تھے۔ جیسے سوئیاں چنی کوئی گڑیا۔

ملی جو اپنی اکلوتی جھلی لپیٹے ٹیڑھی کمزور ٹانگوں اور کمزور دماغ کے ساتھ دن رات گرتا پڑتا لیکن یہ بوسیدہ جھلی کبھی بدن سے جدا نہ کرتا۔ نجانے یہ جھلی کہاں سے اس کے ہاتھ آئی تھی۔ اسے تو خدا نے کبھی کچھ نہ بخشا تھا۔ انسان کیا دے سکتے تھے۔ پھر یہ کٹھور دل انسان.... وہ بھی بدن ڈھانپنے والی جھلی۔ گاؤں کی عورتیں پرانے کپڑوں کو تہہ در تہہ اوپر نیچے جوڑ کر باریک باریک ٹانکوں سے انھیں سی لیتیں اور ایک موٹی دبیز چادر بنا لیتیں۔ کناروں پر کپڑے کے کٹاں بنا کر لیس لگا تیں جسے جھلی کہا جاتا۔ جس میں ہر رنگ اور ہر قسم کے پرانے کپڑے کا ٹوٹا جڑا ہوتا ہے۔ اس گاؤں میں پرانے کپڑے دھجیاں ٹوٹے ٹاکیاں کس قدر اہم تھے۔

ملی اسی جھلی میں کہر زدہ سرد راتیں مویشیوں کے کسی باڑے میں ٹھٹھرتے ہوئے گزارتا۔ گرمیوں کی خاکستر دوپہریں بھی۔ گرمی سردی کی بارشیں بھی جیسے ڈرتا ہو کہ یہ شریر لڑکے چھین کر بھاگ نہ جائیں۔ اس کی کل کائنات یہ بوسیدہ جھلی.... وہ بھی اس گرم چادر کو ملی کی جھلی کی طرح کبھی خود سے جدا نہ کرتی۔ اگر ہڑپا کے ھاڑ جیٹھ میں گرم چادر لپیٹنا پاگل پن ہے۔ تو بڑی بی بی جی اسے کوئی ٹھنڈی چادر کیوں نہیں بخش دیتیں۔ جس میں وہ اپنے واہیات وجود کو گرہ بند کر سکے۔ اس کے سبھی گناہ اس جسم کی دراندازی کی بنا پر ہیں تو بڑی بی بی جی پل پل اسے تکلے میں پرونے کی بجائے ایک ہی بار دفن کیوں نہیں کر دیتیں۔ جیسے گندی ٹاکیاں گڑھا کھود کر دفنا دی جاتی ہیں۔ جو ہر بارش میں ناحق خون کی طرح خود کو ظاہر کر دیتی ہیں۔ سرِزمیں.... وہ اگر ان گندی ٹاکیوں کی طرح دفنا دی جائے تو پھر وہ اپنی برتری، عظمت حاکمیت کی نفسیاتی تسکین کو بار بار کیونکر حاصل کر سکیں۔

■■■■

حویلی

وہ ہر طعنے کو سنے کا منطقی جواب رکھنے کے باوجود بولنے کی جرأت نہ رکھتی تھی۔ سکڑتی سمٹتی۔ بدن کی غلاظتوں کو گھونٹتی لیکن انہی غلاظتوں کی اکڑ اکڑ کر نمائشیں لگاتی یہ ساری خادمائیں جیسے یہ غلاظتیں نہیں زینتیں ہوں۔ اسے چنی یاد آئی جس کی مچلی کا ٹوٹا کھل کھل پڑتا تھا اور چرواہے چھوکرے دھینگا مشتی میں کُرتا بھی چیر ڈالتے اور وہ الف ننگ کھڑی انھیں خود پر حملہ آور ہونے کو اکساتی رہتی۔ وہی بدن چنی کے بدن سے کہیں خوبصورت بدن گرم شال میں سکڑ سمٹ کر بھی صنوبر کے لیے باعثِ شرمندگی کیوں تھا۔ فطری جبلتوں کو اپنے اظہار کی یہاں اجازت نہ تھی۔ اس کے دونوں بازو خود کو چھپاتے چھپاتے بغلوں اور پسلیوں سے چپک گئے تھے۔ سینے کی ہڈی باہر نکل آئی تھی اور شانے جھک کر کُب کی شکل بنا گئے تھے۔ آخر وہ اس مکوڑا سے وجود کو کس بل میں اتار دے۔ اس وقت اس کی زندگی کی قیامت خیز پریشانی یہی متجاوز وجود تھا۔ لیکن اس کا دماغ ہر صورت حال کو جانچنے، ہر شخص کے دماغ کو پڑھنے، ہر ارادے سوچ اور حرکت کو وقوع پذیر ہونے سے بیشتر جان لینے کی عجب صلاحیت

حاصل کر چکا تھا۔ یہ تنہائی کا سفر بھی کتنی دانشوں کے صدر دروازے کھول دیتا ہے۔ وہ جاننے لگی تھی اور جاننا وجود سے کہیں بھاری گناہ جیسا آلودہ کر دینے والا۔

وہ کئی روز سے محسوس کر رہی تھی کہ ''امتیاز'' چھوٹا ملک جو اس سے تین سال بڑا تھا اور ساہیوال کالج میں فسٹ ایر کا طالب علم تھا۔ کچھ عرصے سے اس میں عجب تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ حیرت تھی کہ صنوبر کے سوا کوئی دوسرا ہرگز محسوس نہ کر رہا تھا۔ وہ گردن اکڑا کر کمرے میں بیٹھا رہتا۔ جیسے گردن میں سریا ٹھونک دیا گیا ہو۔ پپری جمے زرد ہونٹ بھینچے رہتے جیسے ان کے اندر دانت اور جبڑے خشک لکڑی کے بنے ہوں۔ شربتی آنکھیں حلقوں میں دھنستی چلی جاتی تھیں۔ صنوبر کو لگتا جو کچھ ملی کے اندر سے باہر ابل پڑا ہے وہی کچھ ملک امتیاز کے اندر گھٹا پڑا ہے۔ ملی کے دماغ کو ان کے اظہار کی اجازت ہے لیکن ملک امتیاز کو یہ اجازت نہیں ملی۔ ماں باپ کا انتہائی لاڈلا اور پیارا۔ جسے بولنے جھگڑنے شور مچانے گند پھیلانے، کچھ بھی کھانے یا توڑنے کی کھلی اجازت تھی۔ وہ اپنی ان اجازتوں سے دستبردار ہوتا چلا جا رہا تھا اور اپنے وجود کے قلبوت میں سکڑتا جا رہا تھا۔

جس کا پورا بچپن شکایتیں لگا لگا کر افتخار کو پٹوانے میں گزرا تھا جو اپنی ہر ناکامی، ہر مایوسی، ہر محرومی، ہر کمی، ہر دکھ کا ذمہ دار افتخار کو سمجھتا تھا۔ چھوٹا ملک امتیاز جو بڑی بی بی جی کا لعل اور ملک صاحب کا یوسف تھا۔ وہ اب ٹھیک نہ تھا لیکن اس محبت کے باوجود وہ نہ دیکھ پا رہے تھے جو صنوبر دیکھ سکتی تھی کہ اُس کے دماغ میں ہڑپا کے ڈھنڈاروں کے آسیب آ گھسے ہیں۔

ایک روز وہ آنکھ بچا کر اس کے کمرے میں چلی گئی اور ہاتھ کے اشارے سے استفسار کیا کہ وہ گردن کیوں اکڑائے رکھتا ہے۔ ہونٹوں پر پپری چڑھے زرد چہرے اور سیاہ حلقوں میں دھنسی آنکھوں میں خوف کے پھنیر ناگ جیسے سیاہ پھن لہرانے لگے۔ گردن کو جنبش دیے بغیر برف کی قاش سے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلایا اور سفید لٹھا جمے

ہونٹ اس کے کان سے لگا دیے۔

''سر جھکانے سے سجدہ ہو جاتا ہے۔ شرک خدا کی ذات میں۔ گناہ۔ گناہِ کبیرا''

صنوبر اگر اظہار رائے کی صلاحیت رکھتی تو چیخ پڑتی اور وہ حلقوم کے اندر ہی اندر چیخ بھی تھی۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے۔'' لفظ بانوں کی طرح اٹکنے لگے۔

لیکن اس کی سنتھ زبان مزید سوکھ گئی اور پتھر سے حلق میں چبھنے لگی۔ حیرت پیشانی پر کئی سلوٹوں میں سکڑ گئی۔ جبلی ذہانت امتیاز کے چہرے پر قلبوت ہوئی۔ ذہنی پراگندگی جو ملی کے بدصورت چہرے پر یک پرت سادہ اظہار ہوتی۔ وہی امتیاز کے انتہائی حسین چہرے پر پیچیدہ آکاس بیل کی رسیوں کی صورت جکڑی تھی۔ ایسا تو ملی بھی نہیں سوچ سکتا، ملی پر تو سوچ کی حد ختم ہو جاتی ہے اور امتیاز سوچ کی حد سے باہر نکل گیا ہے۔

امتیاز نے برف کی قاش جیسے سفید براق مخروطی انگلیوں والے ہاتھ کو جنبش دی۔ جیسے اس حویلی ہاتھ کے جھٹکے سے اکھڑ کر قریب ہو گئی۔

''کسی کو بتانا ہرگز نہیں ورنہ یہ سب مجھے پاگل سمجھیں گے۔ انھیں حقیقت کا شعور نہیں ہے لیکن تم سمجھ رکھتی ہو میں تمھیں بتا سکتا ہوں کہ میرے ساتھ واقعہ کیا ہوا ہے۔''

اس نے اپنے ساتھ نواری پلنگ پر دوبارہ وہی برف کی قاش جیسا ہاتھ تھپتھپایا کہ بیٹھ جاؤ۔ صنوبر وحشت بھرے احساس سے بندھی بیٹھ گئی جیسے بیٹھنے پر لاچار تھی۔ اس کے اندر وہی ہمدردی اور دکھ کا احساس ابھرا جو کبھی بچپن میں ملی کو دیکھ کر ابھرتا تھا۔ لیکن امتیاز کے چہرے پر انتہائی سنجیدگی، یقین اور اپنے احساس کی قطعیت تھی۔

''میں اس روز عجائب گھر گیا تھا۔ وہاں الماریوں میں مورتیاں رکھی ہیں۔ مٹی کی مورتیاں۔ میں جب قریب سے دیکھنے لگا تو میرا سر ان کے سامنے جھک گیا۔ میں شرک کا مرتکب ہو گیا۔ میں واجب القتل ہو گیا۔ میں تو صرف ان کی تاریخ پڑھنے لگا تھا۔ لیکن میرا سر ان کے اچانک جھک گیا۔''

اس کی شربتی آنکھیں آنسوؤں کی لڑیاں پرونے لگیں اور باچھوں کے کناروں پہ سے
لعاب کو بھگونے لگیں۔ گاڑھا زرد لعاب ٹھوڑی پر لکیریں بنانے لگا۔ باچھیں بھیگی
تھیں۔ شربتی آنکھوں میں وحشت جنگل ناچنے لگی۔ اس نے تھرتھراتے ہونٹ صنوبر کے
کان سے لگائے ان دھوئے چہرے اور دونوں صاف نہ کیے دانتوں کی پیلی بو سے مماثل
تھی۔ صنوبر نے تیورا کر باہر نکلنا چاہا۔ اس نے بازو پکڑ مضبوطی سے جکڑ لیا۔

"کسی کو بتانا نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اختر کو پتا لگ گیا تو وہ مولویوں کو بتادے گا اور مولوی میرے قتل کا فتویٰ دیں گے۔ قسم اٹھاؤ کسی کو نہیں بتاؤ گی۔ تم بتا دو گی۔ میں ہی پاگل تھا جو تمھیں سب بتا دیا۔" اس کی ہیجانی کیفیت انتہائی اضطراب کی تھی۔ اگر ٹلی کے چہرے پر بھی یہ کیفیت ہوتی تو کسی کو اسے پتھر چھٹریاں مارنے کی جرأت نہ ہوتی بلکہ ڈر کر دور بھاگ جاتے۔ شاید ذہنی پراگندگی میں بھی طبقاتی تفاوت موجود ہوتا ہے۔ وہ اٹھا دروازے سے باہر دائیں بائیں جھانکا اور دروازے کے دونوں پٹ سختی سے بھیڑ دیے۔ صنوبر کا دل دھک دھک بجنے لگا۔ جیسے راز کے افشا ہونے کے خوف سے اب وہ اس کا گلا دبا دینے والا ہو۔

اس کے پتھر حلق سے لفظوں کے باٹ تتلا کر نکلے اور حلقوم میں خراشیں پڑ گئیں۔

"نہ نہیں بتاؤں گی۔ کسی کو نہیں۔ میں کبھی کسی سے کچھ نہیں بولی تو بتانا کیسا۔"

پرچھتی سے قرآن پاک اٹھا کر اس کے سر پر رکھ دیا۔

"اس قرآن کی قسم کھاؤ کہ کسی کو نہیں بتاؤ گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"بالکل نہیں بتاؤں گی۔"

قرآن پاک ہٹا تو اسے لگا سر پر رکھی موت ٹل گئی ہے۔ کانپتی ٹانگوں پر کبڑی سی کھڑی ہوئی اکڑے ہوئے حلق سے ٹوٹے پھوٹے باٹ نکلے۔ "یوں سجدہ نہیں ہوتا جب تک سجدے کی نیت نہ ہو۔" "ہو جاتا ہے جس شے کے سامنے سر جھک گیا سجدہ ہو گیا۔"

اس کے لہجے کی قطعیت سے وہ پھر کانپ گئی۔ ''میرا سر تمہارے سامنے تو نہیں جھکا نا تمھیں سجدہ تو نہیں ہوا نا۔''

وہ خوف سے کپکپانے لگی۔

واقعی اسے سجدہ تو نہیں ہو گیا۔ وہ بھی کہیں شرک کی مرتکب تو نہیں ہو گئی۔

سارا قصور ان مورتیوں کا ہے جو عجائب گھر میں بند ہیں اور شاید اُن کی پرستش کبھی کی بھی جاتی ہو۔ شاید اُن کی فطرت دیوتائی ہو جو امتیاز کی بندیائی فطرت سے ٹکرا گئی ہو جنھیں دیکھنے کو روز اک خلقت جمع ہوتی ہے۔

جنھیں وہ کبھی نہ دیکھ سکی۔ لیکن دیکھنے سے سجدہ تھوڑی ہو سکتا ہے۔

تو کیا امتیاز پاگل ہو گیا ہے۔

باہر چار کنال کے صحن میں وہ سب ہنگامے برپا تھے۔ جو روز کا معمول تھے۔ عورتوں کی نت پنچائتیں لگی رہتیں۔ فریقین کی عورتیں حال دہائی مچاتیں۔ ادھالے واپس لائے جاتے۔ زیادتی شدہ لڑکیاں اپنے برے بھلے کی روداد سناتیں۔ ان سے زیادہ ان کی مائیں چیخ پکار کرتیں۔

رشتے طے ہوتے، طلاقوں کے تصفیے ہوتے۔ سسرال سے روٹھ کر میکے بوہے جا بیٹھنے والیوں کی صلح صفائی کروائی جاتی۔ تشدد کا نشانہ بنی بہوئیں حویلی میں پناہ لیتیں۔ جنھیں واپس ٹورا جاتا۔ دو جوڑا کپڑوں اور پنج سیری گڑ کی جھولی میں ڈالی جاتی۔ مسروقہ مال برآمد ہوتے۔ مویشیوں کا چارہ بھٹے، گہنوں کی بھریاں۔ بھوسے کی پنڈیں۔ سبزی ساگ یا کسی پھل کا توڑنا چوری کے زمرے میں نہ آتا تھا۔ لیکن شکایتیں ضرور موجود رہتیں۔

رعیت کے ان مقدمات کا کوئی وقت معین نہ تھا۔ باہر چار کنال کے صحن میں مچا ہنگامہ صحن کی وسعت سے کہیں زیادہ ہوتا۔

چوڑیاں چڑھانے والیاں، ڈیڑوں بہنیوں میں رہنے والے پکے ووٹروں کی

عورتیں، سلام کرنے کو آنے والیاں۔ یہ دو چار ایکڑ کی زمیندارنیاں کبھی خالی ہاتھ نہ آتیں۔ انڈے، مرغیاں، سبزی، موسم کے پھل، کچے آم، ڈوکے، لسوڑیاں، جامن کی پوٹلی یا پھر گڑ۔ گھی یا کوئی پنجیری وغیرہ بنا کر ضرور ساتھ لاتیں۔

مقامی سکول کی استانیاں پٹوارنیں، سید زادیاں، مولوئنیں یعنی رعیت سے ذرا اوپر درجے والیاں جنھیں بیٹھنے کو چارپائی یا پیڑھی پیش کی جاتی اور موسم کے لحاظ سے لسی یا چائے سے تواضع بھی ہوتی۔ کیونکہ ان کے مرد الیکشن کے زمانے میں اک اشارے پر کٹ مرنے کو تیار رہتے تھے۔

چار دیواری کے باہر سے پل بہ پل آوازیں گونجتیں، کاکی جی! دس بندوں کا کھانا، آٹھ بندوں کی چائے، لسی، میٹھا پانی، لال شربت، پیلا شربت، سردائی، سکنجبین۔

کھانے چائے ڈھوتی نوکرانیاں، کھلی بنولے دلیے کے بٹھل، دودھ کی دھاریں چوانے کو کمنڈل بلٹوہیوں کا کھڑکا پیروں کے درمٹ ہر پل پختہ اینٹوں کے صحن میں بجتے ہوئے، اچانک سانپ بچھو کے نکل آنے پر چیخ پکار کرتی یہ خادمائیں۔ تو تکار ایک دو جی کے یارانے گنواتیں۔ اس پر بڑی بی بی جی کی ڈانٹ ڈپٹ گالیاں کو سنے۔ تھپڑ مکے لاتیں۔

صنوبر کو کسی ہنگامے میں شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ وہ تنہائی کی جھلی میں ملی کے طرح لپٹی رہتی۔

اگر کبھی باہر نکل بھی آتی تو بی بی جی کے چہرے پر وہ غضب آتا جیسے ان کی راجدھانی میں کوئی گھس بیٹھیا چلا آیا ہو۔ آنکھ سے تنبیہ کرتیں۔ ''خبردار۔ واپس کمرے میں گم ہو جاؤ۔''

وہ فی الفور کمرے کے قلبوت میں خود کو ڈھانپ لیتی۔ کھڑکی کی جھیت سے نظارہ کرتی۔ آنکھ کے تل میں سماتا ہوا جہان اس خاموش مطالعہ نے خام دانش نے اس چودہ پندرہ برس کی بڑھیا کو عجب تفکر بخش دیا تھا۔

ہر مقدمے ہر مسئلے کی تہہ تک پہنچ جاتی۔ ہر جھگڑے ہر فیصلے کی نوعیت کو بھانپ جاتی۔ اگر کبھی آنکھ کی پتلی کھڑکی کی جھیت سے نظر آجاتی تو بڑی بی بی جی فی الفور نوکرانی کو حکم دیتیں کھڑکی کے سامنے چارپائی کھڑی کر دو۔ اب بان کے سوراخوں میں سے منظر کترن کترن ہو جاتا۔ کبھی بازو کبھی چہرے کا دایاں حصہ کبھی بایاں کبھی پشت کبھی کھڑکی کبھی دروازہ۔ آنکھ اتنی کترنوں کو جوڑنے سے بے بس ہو جاتی۔ اس نے گھر کے ہنگامہ پرور صحن میں جھانکنا ہی چھوڑ دیا۔ اگر کبھی نہانے کے لیے تولیہ لپیٹے باہر صحن میں نکل آتی تو وہ رات اس کے لیے عذاب کی رات ہوتی جب بڑی بی بی جی بڑے ملک صاحب کو بتاتے ہوئے اسے سناتیں۔

''گدھی کو جتنا میں نظروں سے چھپانا چاہتی ہوں اتنا ہی مموں کی نمائش کرتی ہے۔ آج احاطہ عورتوں سے بھرا ہوا اور گدود باہر نکل آئی۔ توبہ نہ شرم نہ حیا۔ گند گھول ہی بیٹھی ہو تو چھپا کر تو رکھو۔''

باپ کے سامنے یہ الفاظ شرم کی کوئی دلدلی کیچڑ جو اس کے غلیظ وجود کو گھونٹ ڈالتا۔ کسی سیال مادے کی طرح ڈبو دیتا اور وہ شرم سے مر جاتی۔ کاش وہ ایک لوتھڑا ہوتی جو نہ بڑھتا نہ پھلتا نہ پھولتا۔ ایک ہی شکل ایک ہی سائز میں نگاہوں سے اوجھل کہیں دبا پڑا رہتا جیسے گندی ٹاکیاں دبی رہتی ہیں۔

اس نے باہر نکلنا چھوڑ دیا نہانا چھوڑ دیا۔ کنگھا کرنا چھوڑ دیا۔ غلیظ وجود کی گھٹڑی گرم شال میں کس کے باندھ لیتی۔ پسینے گرمی دانوں میں کچر مچر جون جولائی میں کمرے کا دروازہ بند کر کے بدنما وجود کو چھپائے بیٹھی رہتی۔ لیکن اس سب کے باوجود اس کا دماغ پوری طرح اس کے قابو میں تھا۔ نہ ملی کی طرح فہم کی انتہائی ابتدائی شکل میں اور نہ ہی امتیاز کی طرح دانش کی بگڑی ہوئی کسی انتہائی شکل میں۔ لیکن امتیاز جو ماں باپ کا لاڈلا، پیارا، عقل مند، تابع فرماں بیٹا ہے۔ وہ یتیم و یسیر بے گھر بے در ملی کی طرح پاگل کیسے ہو گیا۔ اس میں

بھی افتخار کی ہی کوئی سازش ہو سکتی ہے۔

اسے وہ تشدد بھری راتیں یاد آئیں۔ جب سر شام بڑے ملک صاحب شاماں والی ڈانگ اپنی چارپائی پر بچھی تلائی کے نیچے چھپا رکھتے۔ جسے رات کو افتخار کے بدن پر ٹوٹنا ہوتا تھا۔

صنوبر کے تو روم روم میں دن بھر بھی یہ خوف ناک ڈانگ برستی رہتی۔ اس کا چڑی سا دل اس رفتار سے دھڑکتا کہ آواز اپنے کانوں سنتی۔

ملک صاحب اس ڈانگ کو بستر میں چھپائے کس اطمینان سے دیسی مرغ پلاؤ بھنے تیتر بٹیر تناول کرتے ساتھ میں بی بی سی کی خبریں سنتے رہتے۔ صنوبر کے حلق میں نوالہ پتھر کا بن جاتا۔ تالو چھد جاتا۔ خوراک کا چبایا ہوا گھول منہ میں گھماتی رہتی لیکن نگلا نہ جاتا۔ اس کے شعور کی آنکھ اسی تشدد زدہ ماحول میں بیدار ہوئی تھی۔ پھر بھی عادی نہ ہو سکی تھی۔ افتخار دبے پاؤں گھر میں داخل ہوتا تو جیسے ایک سویا ہوا آسیب بیدار ہو جاتا۔

لاتیں، ٹھڈے، تھپڑ، مکے جب تک شاماں والی ڈانگ اس کے وجود پر ٹوٹ نہ جاتی یا پھر خود ملک صاحب ہف نہ جاتے۔ وہ چپ چاپ مار کھاتا رہتا۔ نہ روتا۔ نہ چیختا نہ چلاتا۔ نہ ڈانگ مکوں لاتوں کو روکنے کی کوشش کرتا۔ نہ جان چھڑا کر بھاگتا۔

بڑی بی بی جی اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے ہلاشیری دیتیں۔

''ماریں کڑکائیں اس کی ہڈیاں۔ میرے معصوم بچے کا جینا حرام کر دیا ہے۔ اس غنڈے نے۔ اس حرامی نے کسی کی آئی آئے اسے، جس روز یہ کتے کی موت مرے گا میں مکھانے بانٹوں گی۔ اللہ جی سن میری میں اس کی پھوڑی پر بیٹھوں۔ جوانیو ترٹے، میں اس کی لاش پر بین الاپوں، حرامی پلید سؤر..... تیری ماں تیرے ماتم میں بیٹھے۔ گولی لگے تجھے۔ لہو اگل اگل کے مرے۔''

صنوبر اپنی چارپائی پر سفید چادر میں بندھی گچھا مچھا خوف کی بکل میں تھر تھر کانپتی۔

آنکھیں میچے جیسے ہر ڈانگ گھونسا لات اس کے اپنے وجود پر پڑتا۔ لاسیں چھوڑتا۔ ہڈیاں کڑکتیں۔ سوجن اور نیل پڑتے۔ جوڑ اترتے۔ ہر رات اسے کوٹتی پٹتی نازل ہوتی اور زخموں چوٹوں بے توقیری تذلیل کی گھٹڑی بنا کر چھوڑ جاتی۔ افتخار بھی زندگی سے جیسے شرط لگائے ہوئے تھا۔ آخر یہ افتخار مر کیوں نہیں جاتا۔ اگر وہ یہ نیکی کا کام کر دے تو شاید باقی سب کو سکون مل جائے۔ یہ تشدد بھری راتیں گزر جائیں۔ شدت پسند فطرت کو چین آجائے۔

جس قدر بد دعائیں، گالیاں اور ماریں وہ سہہ چکا تھا۔ اتنی تو کسی جانور کو پڑتیں تو وہ بھی ہار جاتا۔ شرم سے مر جاتا کیسا ڈھیٹ انسان تھا۔ اس تک کسی کی آئی کیوں نہ پہنچتی تھی۔ کوئی آوارہ گولی اسے آکر کیوں نہ لگتی تھی۔ وہ جوانیو کیوں نہ تڑٹتا تھا۔ اس کی میت گھر کیوں نہیں پہنچتی تھی۔ جس پر بڑی بی بی جی دل کھول کر روئیں۔ اور اُنھیں سکون آجائے۔ وہ اُنھیں ماتم کرنے کا موقع فراہم کیوں نہیں کرتا تھا۔

اگر افتخار یہ ہمت کرے تو شاید راتوں کی یہ عفریت کم ہو جائے۔

اس گھر کی ہر رات ایک ٹارچر سیل میں مقید تھی۔ جس کا ہدف افتخار تھا۔ اگلے روز وہ ننگے فرش پر زخموں سے چور کوٹے پیٹے کچرے کی طرح سیڑھی کے نیچے بے سدھ پڑا ہوتا، بھوکا پیاسا۔ صنوبر کا جی چاہتا وہ اس کے زخموں پر پھاہے رکھے۔ ہلدی تیل لگائے۔ چوری سے اپنا کھانا اسے کھلا دے۔ کیونکہ کھانا بھی کئی کئی روز بند کر دیا جاتا تھا۔

لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایسی سوچ بھی گناہ کبیرا ہے۔ وہ اس حاکمیت کو کبھی چیلنج نہیں کر سکتی تھی۔ اس گھر میں بھی ایک تیسری آنکھ ہر وقت نگرانی کرتی جس سے نہ مفر تھا، نہ پوشیدگی، نہ بغاوت۔ خدا بھی اپنی صفات کس فراوانی سے ادھر ادھر بکھیر دیتا ہے۔ انسانوں کو اپنی صفات والے انسانوں کے شکنجے میں رکھنے کے لیے کتنی فراخدلی سے اپنی حاکمیت سے اُنھیں نوازتا ہے۔

اگر کسی رات یہ تشدد اور جنون نہ بھی نازل ہوتا تو اس کے نازل ہونے کا خوف بدن

پر زہریلے کیکڑوں کی طرح سرسراتا، پسینہ رونگٹوں سے پھوٹتا۔ کہ کب تلائی کے نیچے رکھی ڈانگ اژدھا سی نکلے گی اور افتخار پر برسنے لگے گی اور وہ یوں پٹتا رہے گا جیسے مٹی کوٹی جا رہی ہو۔ چپ چپیتے۔

امتیاز ادوائن میں ٹانگیں گھسیٹرتا۔ جسم کا اوپرلا حصہ ساکن رہتا لیکن ٹانگیں تڑپتی مچھلیاں۔ پتا نہیں تسکین کہ احساس کامیابی، دکھ کہ تشدد سے لطف اندوزی کا جنون۔

وہ بہت پیارا لاڈلا معصوم بچہ۔

روز کوئی ایسی کہانی سناتا جس میں افتخار اس کا حق چھیننے کے درپے تھا۔ اسے نیست و نابود کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خلاف سازش کر رہا تھا اور اسے کسی بھی وقت قتل کروا سکتا تھا۔

نتیجے میں پھر وہی بھیانک پر تشدد راتیں۔ وہ شاماں والی ڈانگ جو تلائی کے نیچے چھپی ہوتی، وہی ڈانگ جو صنوبر کے دل و دماغ میں دن بھر برستی رہتی۔ جسے قہر آلود راتوں کو افتخار کے جسم پر ٹوٹنا ہوتا تھا۔

وہ ناپسندیدہ ترین انسان اس ٹارچل سیل میں رات گزارنے والا تحقیر اور حقارت کی اس دلدل سے دن کی پہلی کرن کے ساتھ ہی جیسے خود کو چھڑا لیتا۔

''وہ باپ ہیں۔ ان کا حق ہے مجھ پر۔''

''وہ ماں ہیں ان کی بددعائیں بھی دعائیں۔ انہاں دیاں گالاں گھیو دیاں نالاں۔''

عجب خود فریب اور لاپروا شخص تھا۔ اس غیض و غضب کے باوجود نجانے کس دلیری اور کس راز داری کے ساتھ رات بھر کے تشدد کے بعد سیڑھی کی چھت کے نیچے ننگے فرش پر بے سدھ پڑی لوتھ کو نوکرانیاں پانی پلاتیں۔ بلکہ شربت کبھی کوئی پھل بھی رکھ آتیں۔ زخموں پر ہلدی تیل لگاتے ہوئے آنسوؤں کے پھاہے بھی لگاتیں۔

باہر مرد ملازم راز داری سے نوکرانیوں کو آوازیں دے دے کر پیغام دیتے۔ چھوٹے ملک کو کسی طرح باہر نکالو۔

صنوبر شدید دکھ اور تکلیف کے باوجود اس کے لیے کچھ بھی نہ کر سکتی۔ شاید یہ نوکرانیاں جس آزادانہ ماحول میں بچپن گزار کر آئی تھیں۔ وہ خود سے کوئی فیصلہ کرنے اس پر عمل کرنے اور اس عمل کو پوشیدہ رکھنے کا دماغ اور خود اپنی سوچ رکھتی تھیں۔ اس دہشت اور حاکمیت نے اپنا پہلا وار دماغ کی آزادی اور کچھ کر گزرنے کی صلاحیت پر کیا تھا۔ حلق کوئی بھی آواز، کوئی ضرورت، کوئی مطالبہ، کسی احتجاج کی صورت میں سنٹھ ہو جاتا۔ ٹانگیں کپکپانے لگتیں۔ حرف حلقوم میں لڑکھڑا جاتے۔

وہ بھلا اس کی مدد کیسے کر سکتی تھی۔

جب کبھی کوشش بھی کی کہ اپنی روٹی میں سے روٹی بچا کر یا شربت میں سے شربت بچا کر سیڑھی کے نیچے زخموں سے چور پڑے اس کمزور ہدف کی خبر گیری کرے تو ہی پکڑی گئی۔

پھر کڑکتی ہوئی وہ آواز اس کے روم روم میں خوف کی نوکیلی سولیں پرو دیتی۔

''نہ خصم لگتا ہے تمہارا جو اسے کھانا کھلاتی ہو۔ میں نے جنا ہے تم نے نہیں جنا۔ خبردار جو اس کے لاگے بھی لگی۔ ٹانگیں توڑ دوں گی۔ میرے پیٹ سے نکلا ہے۔ جی چاہے تو زندہ رکھوں جی چاہے تو ماردوں۔'' یعنی جو پیدا کرتا ہے اُسے مار ڈالنے کا بھی پورا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ سب خوف کی ایک بدہیت شکل بن کر اُس پر قابض ہو گیا تھا۔ بال بال میں روم روم میں صرف خوف پنپتا۔ پتا نہیں صنوبر کو ماں سے اس قدر ڈر کیوں لگتا تھا۔

وہی ٹھڈے لاتیں مکے چپیڑیں جو ہر روز ان نوکرنیوں کو پڑتی رہتی تھیں۔ ناک منہ سے ابلتا لہو۔ سوجنیں اور تیل، ہلدی کے پھاہے۔ اور بس یہی کچھ.... پھر بی بی جی کے ہاتھوں میں تو اتنا زور بھی نہ تھا اور کپاس کی چھڑیوں میں اتنی مضبوطی بھی نہ تھی۔ وہ تو جلد ٹوٹ جاتیں۔ جتنی مضبوطی شاماں والی ڈانگ اور بڑے ملک صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔

اس تشدد بھرے ماحول میں صنوبر نے کبھی ایک تھپڑ یا ٹھڈا لات نہ کھائی تھی۔ تو اسی

لیے کہ وہ اپنے وجود کو چھپائے رکھتی۔ اگر بڑی بی بی جی پچھلے صحن میں ہوتیں تو وہ اگلے صحن میں وہ اگلے صحن میں تو وہ پچھلے صحن میں دفن رہتی۔ جون جولائی کی دوزخ راتوں میں کمرے کا دروازہ بند کر کے اندر کانپتی لرزتی پوری رات موت کی آمد کا انتظار کرتی لیکن موت آ کر ہی نہ دیتی۔

وہ ہر پل خود کو چھپانے کی کوشش میں لگی رہتی۔ گالیاں کوسنے اور بددعائیں کانوں میں گونجتے رہتے لیکن جسمانی تشدد تک نوبت کبھی نہ آئی تھی۔ شاید وہ اس تشدد سے گزر جاتی تو خوف بھی گوارا ہو جاتا۔

بڑی بی بی جی کے سنگار میز پر کریموں اور پاؤڈر کی کئی شیشیاں اور ڈبے پڑے رہتے۔ جنھیں چھونے کا تصور ایسے ہی تھا جیسے قرآن مجید کو ناپاک ہاتھ لگانا۔ پتا نہیں ایک بار اس کے دماغ نے اتنا بڑا فیصلہ کرنے کی آزادی کیسے حاصل کر لی۔ اس کے جسم میں اتنے بڑے عمل کی ہمت کیسے بھر گئی۔ بدن میں بھرے وجود کی نسبت کہیں بڑا فعل۔

کہ اس نے پوڈر کا ڈھکنا گھما کر اس کی ذرہ ذرہ موریوں سے ناک لگا کر سونگھ لیا کہ پوڈر کی خوشبو کیسی ہوتی ہے۔ اس نے کبھی پوڈر یا کریم کی خوشبو سونگھی ہی نہ تھی۔

بڑی بی بی جی کی کسی شے کو چھونا اور پھر خوشبو سونگھنا ایسا جرم اگر افتخار سے سرزد ہو جاتا پھر وہ تو جان سے جاتا۔ صنوبر کے تو سر پر پڑنے والے چمچے سے ذرا سا سر ہی پھٹا تھا۔

بس وہ آٹھ برس کی عمر میں پڑنے والی پہلی اور آخری مار تھی۔ اس کے بعد بر سرِ زمین ہوتے ہوئے بھی اس نے خود کو زیرِ زمین دھنسا لیا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ پچھلے کچے صحن کے پاخانے والے کھولے میں ایک قبر کھودتی اور خود کو اس میں دبا کر اوپر مٹی ہموار کر دیتی۔ اور ایسے چھپی رہتی جیسے لکڑیوں کے کھکھل میں دھنسی ٹاکیوں میں لاروے چھونے چھپے رہتے ہیں۔

وہ بھلا افتخار کے لیے بولنے یا کوئی مدد کرنے کی جرأت بھی کیسے کر سکتی تھی۔

صنوبر گہرے تفکر میں اترتی چلی جارہی تھی۔ انسانی فطرتوں اور حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتی چلی جاتی۔

یہ انسانی رشتے ذاتی اغراض اور نفسیاتی مسائل کا عجب گورکھ دھندہ ہیں۔

دوسرے کو زیر کرنے، غلبہ پانے اور اپنا محتاج رکھنے کی عجب خُودی ہے خدا نے اس فطرتِ انساں کو۔ تسلط کو شدید اور دراز کرنے کو جس حد تک ممکن ہوسکتا ہے اس حد کو پار لینے کی فطرت، اس مقصد کے لیے اگر انسان ہر قدر، ہر اخلاق، ہر قانون، ہر آئین، ہر مذہب کو تہس نہس کر سکتا ہے۔ تو اس میں اس مجبور کا قصور کیا کہ اسی حاکمانہ فطرت کے زیرِ تسلط اُس کا خمیر گوندھ کر بنایا گیا ہے۔

مدمقابل کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا آغاز چاہے ہابیل قابیل کے قصے سے ہوا ہو لیکن انتہا کوئی نہیں۔ حیاتیات کا یہ فلسفہ فطرت کی یہ کارستانی تاریخ کی بڑی جنگوں، مخالفین بنانے اور ایک دوسرے کی زمینیں، مال و متاع چھیننے اور زیر کر کے فاتحین کہلانے تک ہی محدود نہیں ہے۔ یہ ہر اس شخص کے خون میں رچا ہے جسے اقتدار یا کسی دوسرے پر حاوی ہونے کی کوئی صلاحیت یا طاقت میسر آجائے تو پھر وہ اس کے بے دریغ استعمال میں ٹوٹ پڑتا ہے۔

چاہے غوث پیغمبر رشی مُنی اپنے مذہب کی اطاعت کروانے کو ٹوٹ پڑیں۔ کہ دسترس میں ایک نوکر ملازم ہی ہو کہ شوہر کے لیے بیوی کہ ساس کے لیے بہو کہ والدین کے لیے اولاد۔ مدمقابل بنالینا اور اُسے مات دینے کو جتے رہنا حیاتیاتی سرشت میں سرفہرست شامل کر کے انسان پیدا کیا گیا ہے۔ اس میں بے چارے انسان کا کیا قصور کہ اس کے عناصرِ ترکیبی ہی یہی ہیں۔

▪▪▪▪

افتخار

وہ دن بھی حویلی میں معمول کے دنوں کی طرح شروع ہوا تھا۔ صنوبر کے علم میں کیسے ہو سکتا تھا کہ اس معمول کے دن کا اختتام ایک ایسے غیر معمول پر ہونے والا ہے جو اُس کے تمام معمولات کو بدل ڈالنے والا ہے۔

کون جانے کہ کب معمول کے کسی دن کا کوئی حصہ، چند گھنٹے، منٹ یا سیکنڈ کسی ایسے عمل کی شکل میں ڈھل جائیں کہ وہ لمحہ، وہ پل عمروں اور زمانوں، نسلوں اور زندگیوں پر محیط ہو کر ٹھہر جائے کبھی نہ گزرنے کے لیے، لیکن ان چند لمحوں والے حادثے کی تیاری میں تو عمریں نسلیں صرف ہو چکی ہوتی ہیں۔ معمولات میں سے غیر معمولیت کو جمع کیا جا رہا ہوتا ہے۔ کسی حادثے کا خام مسالہ اکٹھا ہو رہا ہوتا ہے۔ نقشہ تیار کیا جا رہا ہوتا ہے۔ بے خبر وہی رہتے ہیں جنھیں اس نقشے میں رنگ بھرنے ہوتے ہیں۔ شاید اسی انجانے اَن دیکھے نقشے کو تقدیر کی ریکھائیں بھی کہا جاتا ہے۔ جس کا تانا بانا بننے کو سازگار حالات کردار اور رویے غیر محسوس طریقے سے معمار کا کام سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ کہیں لوحِ سماوی پر لکھی

ہوئی تقدیر پر عمل درآمد کے لیے چارے کا کام دے رہے ہوتے ہیں کہ اپنے افعال کے تناظر میں خود اپنی تقدیر ترتیب دے رہے ہوتے ہیں۔

معمول کے اس روز میں ایک ہی تبدیلی تھی کہ وہ بلونگڑا جسے صنوبر تین دن دودھ پلاتی رہی تھی اور جو دودھ بھری پیالیاں چھوڑ کر یکدم غائب ہو گیا تھا۔ عاقبت نااندیش ناشکرا کہیں کا۔ وہ آج کہیں سے لوٹ آیا تھا۔ تین روز جو، رج کے دودھ سڑکا تھا تو اس کی ساری طاقت کسی بھوک کے بھٹ میں جھونک آیا تھا اور اب لاغر و نحیف انبار خانے کی منوں ٹنوں بوریوں تلے دبکا بیٹھا تھا۔

صنوبر انبار خانے کے دروازے میں بیٹھی دودھ کی پیالی سامنے رکھے بلونگڑے کے باہر نکلنے کا انتظار کرتی تھی۔

ناتراشیدہ لکڑی کے چوکھٹوں پر رکھی گندم، گڑ، شکر، مکئی، باجرے، کھلی بنولے کی سیکڑوں بوریوں کے نیچے بھرے چوہے، چوہے مار گولیاں کھا کھا کر مزید توانا ہو رہے تھے۔

دس گاڈروں پر کھڑی چھت والا سرنگ نما انبار خانہ آج یکم جولائی کی حبس اور امس سے بھرا تھا جس کا کوئی کھڑکی روشن دان نہ تھا۔ گھپ تاریکی، پچھلے حصے میں قطار و قطار جڑی ہزار بوری کھاد کو لپیٹے ہوئے تھی۔ ان کے سامنے کپاس پر چھڑکنے والے زہر کی ڈرمیاں اسپرے کی مشینیں۔ دبی سی گلابی سنڈی، امریکن سنڈی، سفید مکھی، مورکھ، موتھلا، جوئی، بھکرہ اور مختلف اقسام کی آوارہ مضر گھاس تلف کرنے والے زہر کی بے شمار اقسام۔ انبار خانے کی گپھا میں بھری ہلاکت خیز بو صحن میں کھلنے والے دروازے میں جمع تھی۔ دو سو فٹ طویل سرنگ نما انبار خانے کو چوری چکاری سے بچانے کو صرف دو دروازے رکھے گئے تھے۔ ایک باہر کی سمت جو اناج، کھاد یا اسپرے رکھتے یا نکالتے وقت استعمال ہوتا تھا۔ دوسرا اندر حویلی کے صحن میں ہواداری کے لیے کھلتا تھا۔ صنوبر اسی دروازے کی چوکھٹ پر

بیٹھی تھی۔ اُسے اپنا وجود اور یہ انبار خانہ بہت ملتا جلتا لگتا تھا۔ وہ اکثر زہریلی بو سے متلاتی خود کو اس میں ڈھکے رکھتی۔

ابھی بھی زہر کی ہلاکت خیز بو طویل درمیانی فاصلہ طے کرتے ہوئے صنوبر کے نتھنوں کو چڑھ رہی تھی لیکن وہ گدرے سے رنگ والے نحیف بلونگڑے کے انتظار میں زہر کی جان لیوا بو میں متلا رہی تھی کہ کب وہ دودھ کی مہک پا کر باہر نکلے اور کھوئی ہوئی توانائی دوبارہ حاصل کر سکے۔ ایسا نہ ہو کہ زہر چکھ کر مر جائے یا زہریلا چوہا نگل جائے۔ یا پھر جولائی کی آج پہلی تاریخ کے حبس میں بوریوں کی گپھا میں گھٹ کر مر جائے۔ لیکن وہ چالاک بلونگڑا شاید ان تمام ہلاکت خیزیوں کی نسبت انسان کو زیادہ خطرناک تصور کرتا تھا۔

تبھی افتخار بیرونی دروازے سے صحن میں داخل ہوا تھا۔ انبار خانے کا دروازہ بیرونی دروازے کے بائیں سمت تھا جہاں مدت سے چوکھٹ پر بیٹھی صنوبر انبار خانے کی طویل سرنگ میں جھانکتی تھی۔ اور زہریلی بو اور امس سے سر چکراتا تھا۔ افتخار نے اپنی خلقی گرم جوشی سے کہا۔

"صنوبر جی! آپ کا بلونگڑا واپس آ گیا ہے میں نے رات دیکھا اس نے چائی کے منہ پر رکھا دورہ گرایا تو میں نے سوچا صنوبر جی کا بلونگڑا لوٹ آیا ہے۔"

افتخار اُس سے چھے برس بڑا ہونے کے باوجود اُسے آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ شاید یہ اس خلیج کا نتیجہ تھا جو بچپن سے ان بہن بھائیوں کے درمیان بنا دی گئی تھی دو حریف گروہ کہ وہ مل کر نہ کبھی کھیلے تھے۔ نہ کہانیاں کہی سنی تھیں نہ لڑائیاں لڑی تھیں۔ وہ لڑکی ہونے کی وجہ سے اپنے بھائیوں کے قریب بھی نہ پھٹک سکتی تھی جیسے اُسے اُن سے بھی خطرہ ہو۔ اُنھوں نے اپنے اپنے کونے کھدروں میں گھس کر بچپن گزارا تھا۔ اُنھیں ایک دوسرے سے جتنی اجنبیت تھی اتنی تو نوکرانیوں سے بھی نہ تھی۔ یہ والدین بھی عجب گورکھ دھندہ، پسندیدہ، ناپسندیدہ اولاد اور کوئی ایسا بھی جس پر سارا نفسیاتی کچرا مار کرے۔ خدا نے انسان کو اپنی

صورت اور سیرت پر پیدا کیا خصوصاً والدین کو۔ محبت پر آئیں تو انتہا کر دیں، نفرت اور سزا پر بھی انتہا کر دیں پھر انہی بچوں میں سے ابلیس کا کردار بھی اور فرشتہ بھی، عجب خدائی مزاج رکھتے ہیں یہ والدین بھی۔

لیکن جب سے وہ بڑے ہوئے تھے اک ہمدردی کا ربط جڑ گیا تھا۔ افتخار جب رات کے ٹارچر سیل سے نکلتا تو صنوبر کا شدت سے جی چاہتا وہ بھاگ کر ہلدی تیل لگائے اور افتخار بھی چپکے سے اُس کے کان میں کہہ دیتا۔

''صنوبر جی چائے کا کپ مل جائے گا۔''

وہ فی الفور اُٹھ کھڑی ہوتی۔

صنوبر جی! زیادہ تکلیف نہیں کرنی۔ کاڑھنی سے دودھ کا مگ بھر کر اُس میں ایک چمچ پتی ڈال دیں اور پانچ منٹ کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ چائے خود بخود تیار ہو جائے گی۔ چولہے کے پاس مت جایئے گا گرمی بہت ہے۔''

نوکرانیوں سے مخاطب ہونے یا کسی کام کو کہنے کی اجازت ہی نہ تھی۔ اسے تو بچپن میں بھی نہ تھی اب تو وہ جوان ہو گیا تھا۔ اُس کے برعکس امتیاز تو جوتے پاؤں میں پہن کر اُن سے صاف کرواتا۔ وہ بھی بدبخت پھسکڑا مار کر بیٹھتیں اور ران پر جوتا رکھ کر صاف کرتیں اور غسل خانے میں کپڑے بھی وہی پکڑاتیں۔ یہ ساری سہولتیں صرف امتیاز کے لیے تھیں۔ صنوبر بھی کسی نوکرانی کو آواز نہ دے سکتی تھی کہ بڑی بی بی جی کی راجدھانی میں مداخلت کا جرم سرزد ہو جاتا تھا۔

نوکرانیاں بس اُسے ترچھی نگاہوں سے دیکھ دیکھ دانتوں سے ہونٹ کاٹتیں اور منہ میں زبان گھماتیں۔ اور اس مگ کو دھونے کے لیے ایک دوسری سے جھگڑتیں۔ جس میں افتخار چائے پینے کا شوقین تھا۔ اور جب وہ شب کے عقوبت خانے سے باہر آتا تو ہر ایک کی کوشش ہوتی کہ بڑی بی بی جی کا قہر مول لے کر بھی سب سے پہلے وہی ہلدی تیل لگانے سیڑھی کے

نیچے پہنچے۔

اُس زمانے میں ٹی بیگز ایجاد نہ ہوئے تھے لیکن افتخار کے دماغ نے ایجاد کر دیے تھے جب کاڑھنی میں سے ابلتا ہوا مگ وہ بھرتی تو بڑی بی بی جی حال دہائی مچا دیتیں۔

''ہائے ہائے کاڑھنی کی ملائی کی تہہ توڑ دی۔ نری بے برکتی کل مکھن کھمبہ چڑھے گا۔ ہائے چائے نہیں مہرہ پیئے گولی جوگا، سؤر کھائے، گولی لگے تیرے کلیجے میں تو میرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑے۔ وہ کون سا دیہاڑا ہو گا جب میں تیری پھوڑی ڈال تجھے پیٹوں گی۔''

لیکن یہ واحد کام تھا کہ جسے وہ چوری چھپے کر گزرنے کا حوصلہ پیدا کر لیتی تھی۔ جب سے وہ جوان ہوئی تھی۔ گالیوں کے ردھم پر افتخار کے لیے ایسا کچھ کرنا چاہتی تھی جس سے اُس کی اذیتوں میں افاقہ ہو سکے۔ پس منظر میں بی بی جی کی بددعاؤں اور گالیوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جاتا۔ جنھیں وہ قہقہوں میں اُڑا دیتا۔

''مانگیں میری موت مر گیا تو یاد آؤں گا۔ بی بی جی! آپ بالکل فکر نہ کریں میں آپ کی خواہش ضرور پوری کروں گا۔ آپ کو اپنی پھوڑی پر بیٹھ کر رونے کا موقع ضرور فراہم کروں گا۔ آپ ماں ہیں آپ کی دعائیں تو مجھے لگنی ہی ہیں آپ میری موت مانگتی ہیں ضرور ملے گی۔ وعدہ ہے آپ سے۔ اسی لیے تو میں ہر سال ایک تصویر فریم کروا کر رکھ دیتا ہوں کہ کم از کم امتیاز کے بچوں کو یاد تو رہے کہ کوئی ہمارا تایا ہوتا تھا۔ ایسی ڈیشنگ پرسنیلٹی والا۔''

بی بی جی کی گالیاں بارود پکڑ لیتیں۔ وہ گالیوں اور بددعاؤں کے ردھم میں ہنستا رہتا۔

''بی بی جی! آپ کی دعائیں کبھی رائیگاں نہ جائیں گی میں ضرور مروں گا۔ آپ کے سامنے مروں گا۔ آپ مجھے روئیں گی۔ آپ کی خواہش بہت جلد پوری ہو گی۔ آپ میری جوان میت پر فخر و ر پیٹیں گی۔'' وہ ہر بددعا کے ساتھ ساتھ اس کی تصدیق کرتا چلا جاتا۔

یہ واحد موقع ہوتا جب صنوبر کو بھی ہنسی آ جاتی اور وہ گھٹ گھٹ ہنسنے کی جرأت کر
اُٹھایا رہتا تھا ... تے میں چھپا لیتی خود کو۔

اُس روز بھی جب افتخار بیرونی دروازے سے داخل ہوا تو بی بی جی اندر پنکھے والے کمرے میں دوپہر کی نیند لے رہی تھیں اور چھت والے پنکھے کی ڈور کھینچنے والی لڑکی اونگھ اونگھ جاتی تھی لیکن پنکھے کی رفتار کبھی کم نہ پڑتی تھی۔ گٹے پڑی ہتھیلیاں مسلسل کام کرتی رہتیں۔ صحن میں ہو کا سناٹا تھا اور کسی بھی حرکت کی کسی کو اجازت نہ تھی کیونکہ بڑی بی بی جی سو رہی تھیں۔ افتخار بھی دبے پاؤں داخل ہوا تھا۔ وہ گھر میں ہمیشہ دبے پاؤں ہی داخل ہوتا تھا اس لیے کہ سوئے ہوئے بھگیاڑ چیتے جاگ نہ جائیں۔ شہتیر سے ٹنگا ہوا پنکھا چلتا تو آوازیں پیدا کرتا ایک ردھم میں ایک صوت میں صنوبر کا ہمیشہ یہ مشغلہ رہا تھا کہ وہ ڈور کھینچنے سے پیدا ہونے والی اس صوت کو لفظ دیتی اُسے لگتا پنکھا بول رہا ہے ہر روز کسی نئے لفظ کا ورد کرتا کبھی کہتا ہے ''بھاگ جا بھاگ جا'' کبھی ''مرجا مرجا'' آج جیسے کہتا تھا ''ہو جا ہو جا''۔

صنوبر نے مڑ کر دیکھا۔

وہ پیپی نائی سے تازہ تازہ خط بنوا کر باہر سے آیا تھا۔ چہرے پر ابھی شیونگ کریم کی آڑھی ترچھی باریک لکیریں سی کھنچی تھیں۔ صنوبر کی نگاہیں چہرے پر ٹکی رہ گئیں۔ اتنی زردی لپی تھی اس حسین چہرے پر جیسے ہلدی کا اُبٹن چڑھا دیا ہو نائی نے۔ گیندے کے پھول سا چہرہ جس پر تازہ تازہ خط کی ہریاول پھوٹے پڑ رہی تھی۔ جیسے سن کے زرد پھولوں میں سے پتوں کی ہریالی جھلک مارتی ہو۔

عصر کے بعد دیوار کے ڈھلے سائے تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی صنوبر کے بالوں میں ایک خادمہ تیل لگا رہی تھی اس نے تو کبھی کسی سے تیل نہ لگوایا تھا۔ پتا نہیں آج یہ غیر معمولی واقعہ کیسے ہو گیا۔

امتیاز بہت دیر سے سامنے کمرے میں اکیلا تھا۔ وہ تو اُسے چند ثانیوں کے لیے بھی اکیلا نہ چھوڑتی تھی۔ لیکن آج وہ بہت دیر سے خود اپنے ساتھ تنہا تھا۔ صنوبر بھاگ کر اُس کے پاس جانا چاہتی تھی لیکن پہلے اچانک وارد ہونے والے بلونگڑے نے اور اب دفعتاً تیل

لگانے والی نے اُسے ناگہانی جکڑ رکھا تھا۔ اُس کا دل ہولا رہا تھا۔ یہ نوکرانی اُس کے بالوں کو کیوں نہیں چھوڑ رہی۔ وہ اُٹھ کیوں نہیں پا رہی۔ وہ فی الفور امتیاز کی خبر گیری کرنا چاہتی تھی۔ وہ جو ہر وقت مرنے کی باتیں کرتا ہے، وہ جو خودکشی کی کوشش کر چکا ہے جس کا دماغ کسی منہ زور گھوڑے کی مانند بھاگتا ہے اور وہ اس اسپ تخیل کی رکاب میں ایک پیر پھنسائے سرپٹ بھاگتے دماغی گھوڑے کے ساتھ گھسٹتا چلا جاتا ہے۔ نہ ہاتھ میں باگ نہ پیر میں رکاب۔ کانٹوں، جھاڑیوں، ویرانوں، پہاڑیوں، جنگلوں، ویرانوں، بیابانوں کے بیچ گھسٹے چلا جاتا ہے۔

پتا نہیں اب اس کا دماغ کیا بنتی بن رہا ہوگا۔ اس نکمی چارپائی نے اُسے کیوں جکڑ رکھا ہے۔

تبھی افتخار سر کے بالوں کو تولیے سے رگڑتے ہوئے غسل خانے سے نکلا۔ اور رہائشی کمروں کی طرف سرعت سے بڑھنے لگا۔ اُس کا آدھا چہرہ صنوبر کی نگاہوں میں تھا۔ نہانے کے بعد چہرے پر پھینٹی ہوئی زردی ختم ہو چکی تھی۔ چمپئی رنگت میں شاید پانی کی رگڑ نے سرخی گھول دی تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل والے گول کمرے کی سمت مڑ گیا۔

اسے تیار ہو کر کہیں جانا تھا جو اتنا اہتمام تھا۔ صنوبر کو اطمینان ہوا کہ افتخار امتیاز کی سمت ہی جا رہا ہے۔ اب وہ کوئی حماقت نہ کر سکے گا۔

تب ٹرائیگر کے دبنے کی آواز آئی تھی۔

''چھوڑ دو۔''

چار کنال کے صحن میں بھرا سناٹا چیخ پڑا۔ صنوبر کے حلق میں پھنسی آواز اک ہیجان کے ساتھ باہر نکلی تھی۔ خادمہ دھکا کھا کر چارپائی سے دور گری۔ سراسیمگی میں جوتا پیر میں الٹا پڑا۔ وہ جوتا سیدھا کرنے کو گھوم گئی۔ تبھی امتیاز کمرے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور وہ بغلی کمرے کی سمت مڑا تھا۔ صنوبر برآمدے کے پہلے زینے پر تھی جب فائر ہوا۔

اور کسی کے سینے سے کھک کی آواز نکلی۔ حویلی کے بنیروں پر بیٹھے کبوتر اُڑانیں بھر گئے۔ کوے کاں کاں کرتے آسمانوں کو سیاہ کر گئے۔ وہ برآمدے کے آخری زینے پر تھی۔ جب امتیاز ایک ہی بلا ہنگ میں چاروں زینے ٹاپتا ہوا اُترا۔ وہ حیران ہوئی۔ یہ تو صحیح سلامت ہے تو پھر گولی کسے لگی۔ وہ جو غسل خانے جاتے ہوئے بھی دس بار گرتا پڑتا تھا آج یہ چھلانگیں کیسے لگا رہا ہے۔ وہ ایک زینہ امتیاز کے پیچھے اُتری پھر واپس کمرے کی سمت مڑ گئی۔ یقیناً افتخار نے ہاتھ مار کر بندوق کی نالی کا منہ پھیر دیا ہوگا۔ کمرے کی سامنی دیوار چھروں سے چھدی تھی۔ اس نے سوچا افتخار نے رخ الٹا دیا ہوگا۔ اسی لیے گولی امتیاز کو لگنے کی بجائے دیوار میں لگی اور اب بڑی بی بی جی دیوار خراب ہونے پر بہت ناراض ہوں گی۔ اور اس جرم میں افتخار کو پھر گالیوں بددعاؤں اور بھیانک پٹائی سے گزرنا ہوگا۔

لیکن گولی تو خود افتخار کو چھید گئی تھی اور بندوق کی خونی نال اب سامنی کھڑکی سے پھر اندر تھی۔ جس کے ٹرائیگر پر امتیاز کے نازک ملوک لڑکیوں سے ہاتھ کی انگلی دبی تھی۔ جو نہ کپکپا رہی تھی نہ لرز رہی تھی۔ وہ جو ہر وقت کانپتا لرزتا رہتا ٹانگیں پیٹ میں گھسیڑتے تڑپتا، سیاہ گڑھوں میں دھنسی شربتی آنکھیں آنسوؤں اور گڈوں میں ڈوبی رہتیں۔ ہاتھ رعشہ کے مریض کی طرح کپکپاتے، کھڑا ہوتا تو لڑکھڑا کر گرتا اور کئی کئی روز چارپائی سے نہ اُٹھتا۔ پیشاب بھی رو کے رکھتا۔ مسانہ پھٹنے کو ہوتا لیکن جسم میں تو روح ہی نہ تھی کہ حاجات کا ادراک کر سکے۔ وہی امتیاز اب کس مضبوطی اور دلیری سے ایک انسان کا نشانہ لے رہا تھا اور اس کا نشانہ تو کبھی چوکا نہ تھا۔ ہر مرغابی تیتر تلور قلابازیاں کھاتا اس کے قدموں میں آن گرتا تھا۔

بچپن میں جب وہ ملک صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتا تھا تب اُسے ابھی یہ وہم نہیں پڑا تھا کہ ہڑپا کی مورتیوں کو سجدہ سرزد ہو گیا ہے اُس سے۔ تب وہ کتنا پکا نشانچی تھا اور پھر آج درمیانی معطل عہد کو پھلانگتا ہوا نشانہ ویسا ہی پکا، برہدف۔

افتخار کھڑکی کے سامنے بچھی چار پائی کی چوکھاٹ کی اوٹ میں خود کو بچانے کی کوشش کرتا تھا بالکل اسی طرح جیسے زخمی کونج یا مرغابی کسی جھاڑی کی اوٹ میں خود کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی ہو۔ لیکن جانتی ہو کہ اب زخمی پر اُسے کبھی اُڑانہ پائیں گے۔ چار پائی کی ڈھائی فٹ کی اوٹ لیتے ہوئے افتخار جانتا تو ہوگا کہ ایک فٹ دوری والی بارودی نال سے وہ بچ نہ سکے گا۔ پھر بھی وہ خود کو بچانے کی کوشش کرر ہا تھا کہ شاید دعاؤں کا نشانہ خطا ہو جائے اور گولی بندوق میں پھنسی رہ جائے۔ صنوبر کے ذہن میں بھی ایک پل کے لیے یہ خیال آیا تھا کہ چار پائی گھسیٹ کر اوپر کر دے اگر وہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کو آگے بڑھتی تو گولی شاید اُس کا سینہ چیرتی ہوئی گزر جاتی۔ دفعتاً اُس کے اردگرد اتنے چھرے برسے جیسے گرم بارود کی بارش۔ اُسے لگا اُس کا چہرہ چھروں نے چھید دیا ہے۔ اُس کے حلق میں مدت سے دبی چیخ اب نکلی تھی۔

وہ چیختی ہوئی باہر بھاگی ساری نوکرانیاں شاید ڈر کر کہیں کو چلی گئی تھیں اور بڑی بی بی جی صحن میں اکیلی کھڑی تھیں۔

صنوبر برآمدے کے زینے اُتری امتیاز بندوق چار پائی پر پھینک کر بیرونی دروازے سے باہر بھاگ رہا تھا۔ وہ خونی بندوق اب اس چار پائی پر اکیلی پڑی تھی۔ جس پر ابھی چند ثانیے پہلے وہ بیٹھی تیل بالوں میں لگوا رہی تھی اور چاہتے ہوئے بھی اُٹھ نہ سکی تھی۔ چند ثانیوں کے لیے چار پائی نے اُسے جکڑ لیا تھا۔ بس اس لحظے کے لیے جس میں حادثے نے خود کو وقوع پذیر کرنا تھا۔ تو اس چار پائی نے مزاحمت کے شائبے کو بھی جکڑ لیا تھا۔

پنکھے کی لال جھالر ابھی ہل رہی تھی اور شہتیر کے کنڈے سے گزرتی رسی کی رگڑ اب آخری دموں پر تھی۔ ''ہو ہو''

یہ سب کچھ محض ایک منٹ یا چند سیکنڈ کے دورانیے میں ہو گیا تھا۔ اگر تفصیل بتائی جائے تو کتنا وقت لگ جائے لیکن ان سب پر عمل درآمد اس قدر سرعت سے کیسے ہو گیا۔ یہ

کیسی برق رفتار ترتیب تھی ۔اتنے مختلف النوع واقعات کا تسلسل اس قدر درست اور کم دورانیے میں انجام پذیر بھی ہو گیا۔ اور درمیان میں کوئی انسانی کوتاہی نہ آئی۔ کہیں فطرت رکاوٹ نہ بنی، کہیں مقدر آڑے نہ آیا۔ جب وہ شست لگانے والی آنکھ کے روبرو کھڑی تھی تو بیس سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں کتنے منصوبے اُس کے دماغ نے بنائے تھے۔

وہ چاہتی تھی وہ چیخ کر امتیاز کو اس فعل سے باز رکھے۔ اُس کی زبان کے توپے ہی نہ ادھڑے اس کے دماغ میں آیا تھا کہ چارپائی گھسیٹ کر افتخار کو اس کے اندر چھپا دے۔ لیکن اس کے تو ہاتھ پہلوؤں میں سلے رہ گئے تھے۔ اکھڑے ہی نہ.... اُس نے یہ بھی سوچا تھا کہ آگے بڑھ کر کھڑکی کا پٹ بند کر دے تو گولی کا نشانہ خطا جائے گا لیکن پیروں کی بیڑی کے تالے ہی نہ کھلے۔

اب وہی بندوق اُسی چارپائی پر یوں خاموش پڑی تھی۔ جیسے احساس ہی نہ ہو کہ عمر بھر مرغابیاں، کونجیں، تیتر تلور فاختہ مارنے والی نے آج کس کا شکار کیا ہے۔ اس خون پینے والی کے منہ سے آج کس کا لہو لگا ہے۔ شاید وہ خود بھی حیران ہو گی کہ اُس کے اندر ایسے شینہہ نوجوان کو پھڑکا دینے کی بھی صلاحیت موجود تھی۔

باربرنگ صحن میں بی بی جی اکیلی کھڑی تھیں۔ پورے صحن میں ایک گونگا شور گونج رہا تھا۔ اندر پڑے زخمی کے منہ سے تو اف تک نہ نکلی۔ کوئی آواز نہیں کوئی ہائے نہیں۔ شاماں والی ڈانگ سے پٹ کر سیڑھی کے نیچے بے سدھ پڑا ہو وہ جیسے۔ بڑی بی بی جی نے اپنے فطری اعتماد اور سکون سے اُسے ڈپٹ کر کہا۔

”جاؤ اُسے جا کر پانی پلاؤ۔“

اور خود اناجوں اور زہروں سے بھرے سرنگ نما انبار خانے میں سے باہر کھلنے والے دروازے کی جھیت سے جھانکنے لگیں اُسے جو سامنے چوک میں بھاگا چلا جا رہا تھا اور اُس کے پیچھے ملازم پکڑنے کو لگ چکے تھے۔

صنوبر حکم کی تعمیل میں قاتل کمرے کی دہلیز تک آئی بھی پھر وہیں جم گئی اس قاتل گھر کا پانی مقتول کو پلانا کیا جائز ہے وہ شرمندگی کی دلدل میں گڑتی چلی گئی۔

''ہم نے ماردیا خود ماردیا۔''

پتا نہیں اُس کے اندر یہ کون گھس بیٹھیا جسارت کر رہا تھا۔ چار کنال کا طویل وعریض صحن اب عورتوں سے بھر چکا تھا۔ جیسے ایل جی کے کارتوس کے صدمے سے کوئی کان بھی محفوظ نہ رہا ہو۔ عورتوں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ لیکن اس کے اندر اُترا بارود چھلک رہا تھا۔

''ہم نے ماردیا۔ خود ماردیا۔ جان سے ماردیا۔''

عورتیں کبھی بی بی جی کی طرف دیکھتیں اور کبھی اُس کے منہ پر ہاتھ دھرتیں اور خود آنسوؤں کے سیلاب میں بہہ جاتیں۔ کسی ایک نے یا شاید سب نے مل کر کہا تھا۔

''چھوٹی بی بی تجھے ملک افتخار بلاتا ہے۔''

وہ عورتوں کے کلاوے میں زخمی تیتری سی تیرتی، قاتل کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

سامنے چارپائی پر افتخار سیدھا لیٹا تھا۔ جوتوں کے دونوں پیر بالکل برابر جڑے ہوئے، چارپائی کے ساتھ پڑے تھے۔ وہی چارپائی جس کی ناکافی اوٹ اُسے دوسری گولی سے نہ بچا سکی تھی۔ یعنی وہ ایل جی کے دو کارتوس کھا کر اُٹھا ہوگا۔ پھر چارپائی پر بیٹھ کر دونوں پیر جوڑ کر جوتے اُتارے ہوں گے۔ فطری سلیقہ مندی سے کہ کہیں دونوں پیروں کے بیچ ایک انچ کی بھی بے ترتیبی نہ تھی۔ پھر وہ چارپائی پر سیدھا لیٹا ہوگا۔ اتنے سکون سے جیسے استراحت کرتا ہو۔ یہ سب اُس نے خود کیا ہوگا۔ وہ تو فائر کی آواز سے ڈر کر چیختی ہوئی باہر بھاگ گئی تھی۔ نوکرانیاں گھر چھوڑ کر کہیں کو نکل گئی تھیں پنکھے کی جھالر سامنے کمرے میں ابھی بھی ہلتی دکھائی دیتی تھی اور ''ہو جا ہو جا'' کی آواز دم توڑتی تھی۔ بڑی بی بی جی انباروں کے دروازے کی چھیت میں سے امتیاز کو دیکھتی ہاتھ ملتی تھیں۔

''ہائے ہائے معصوم بچے پر ہونی آ گئی۔''

افتخار کو کس نے دیکھا کہ کس دلیری سے چھلنی سینے کے ساتھ خود اُٹھا ہوگا خود جوتے اُتارے ہوں گے خود چارپائی پر لیٹا ہوگا۔ فرش پر کسی سراسیمگی کے کوئی آثار نہیں۔ نہ چیخا نہ چلایا۔ نہ کسی کو آواز دی اس قاتل گھر میں کسے آواز دیتا۔ چہرے پر وہی وقار اور بردباری جو ہر تشدد میں برقرار رہتی تھی۔ وہی سنجیدگی اور لاپروائی جو اس حسین چہرے کو عجیب پُراعتماد بنا دیتی تھی کہ ساہیوال کالج میں داخل ہوتے ہی وہ لیڈر بن گیا طلبا یونین کا الیکشن جیت گیا۔

کیا پورے چرے ہوئے سینے سے ابلتی بوٹیاں اور گاڑھا چھلکتا ہوا لہو اُسے تکلیف نہ دے رہے تھے۔ وہ اس قدر پُرسکون اور خاموش کیسے تھا۔ اُس کے لب اس قدر زرد تھے کہ جان نچڑ چکی تھی لیکن چہرے پر ایک گمبھیر چپ تھی۔ نجانے کتنے تلخ جملے ہوں گے جن پر یہ لب نیم مردہ لب سی لیے ہوں گے۔ چارپائی کے نیچے تازہ صحت مند خون کا گڑھا بن رہا تھا۔ وہ تکلیف سے کیوں نہیں چلاتا وہ کیوں نہیں چیختا کہ مجھے مار کے سکون مل گیا سب کو۔ لو سنبھالو اپنی زمینیں میں تمہارے منہ پر مار کر جا رہا ہوں۔ آخر اتنا حوصلہ اور صبر کیوں۔ کون سا نشانِ حیدر ملنا تھا اُسے، کون سی کتابوں میں اُس کی دلیری پر مضمون لکھے جانے تھے کہ اُس کی بہادری نے تاریخ کا حصہ بننا تھا۔

پھر ایسا تاریخی کردار اور رویہ کیوں۔ نگاہوں میں کوئی حیرت یا حقارت کیوں نہیں ہے۔ جیسے وہ اس سب کے لیے تیار تھا۔ وہ جو کہتا تھا۔

"ماں کی دعا ہے بھئی لگنی تو ہے وہ مجھے موت کی دعا دیتی ہیں۔ موت کی کیا جرأت کہ کسی ماں کی دعا کے سامنے سرتابی کا تصور بھی کرے۔ جلد یا بدیر اس دعا کو قبولیت ملنی ہی ہے۔"

شاید وہ تیار رہتا تھا ہر وقت ماں کی دعا کی قبولیت کے لیے موت کے استقبال کے لیے سفر بند اُس نے خط بنوایا تھا، غسل کیا تھا اور نئے کپڑے زیبِ تن کیے تھے۔ شاید اس کے چہرے کی زردی موت کا پیغام اُس تک پہنچا چکی تھی۔ صنوبر اس دلیری اور حوصلے سے

تیورا کر دروازے میں ہی رک گئی۔ اُس نے ذرا سی گردن موڑ کر صنوبر کو دیکھا۔ غلافی چیروں آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو ابھرے۔ وہی پُرسکون آنکھیں جو اب تک حالات کی بے رحمی کا خاموش مشاہدہ کر رہی تھیں۔ زرد لہو نچڑا ہاتھ فضا میں اُٹھا۔

''صبر صنوبر جی صبر۔''

شرمندگی، شرمندگی گہری شرمندگی۔ وہ پسپا ہو کر واپس پلٹی۔ جیسے آج حالات کے ظلم کا شکار وہ نہیں صنوبر ہو۔ وہ جو عمر بھر کبھی کسی کے سامنے کمزور نہ ٹھہرا تھا۔ وہ مرنا بھی اُسی وقار اور دلیری سے چاہتا ہو گا جس دلیری سے جیا۔ وہ اپنی موت کو ایک یادگار تماشا بنانا چاہتا ہو گا۔

صنوبر چارپائی کے نیچے ابلتے خون کے گڑھے میں جیسے ڈوب گئی۔ جس میں سے بارہ بور کی بندوق کے ایل جی کے کارتوسوں کا دھواں اُٹھتا تھا۔

نوکر مزارعے بے مقصد بھاگ دوڑ کر رہے تھے جیسے حادثے کی شدت نے ہیجان والی کوک بھر دی ہو۔ اور وہ سب ایک دائرے میں گھومے چلے جا رہے ہوں۔

اب تک کسی گاڑی کا انتظام بھی نہ ہو سکا تھا۔

بڑے ملک صاحب آج صبح معاملہ (بیانہ) جمع کروانے گاڑی ڈرائیور لے کر ساہیوال نکل گئے تھے۔ اس کے سوا گاؤں میں یا آس پاس کے کسی بھی گاؤں میں کوئی ٹیکسی یا گاڑی موجود نہ تھی۔ نہ ہی کسی کے پاس اکٹھی رقم۔ گھر کی صدمہ زدہ خواتین سے مانگتے ہوئے شاید اُنھیں شرم آتی ہو گی۔

جب تک تھوڑے تھوڑے پیسے اکٹھے ہوئے اور چارپائی کندھوں پر اُٹھا کر ٹریکٹر ٹرالی کی سست رفتار سواری پر سوار کروائی گئی تب تک لہو نچڑتے ہوئے اڑھائی تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ رنگلے پایوں والی چارپائی پر جو جوان لیٹا تھا۔ اس کے بدن سے نچڑتا لہو پورے صحن میں خونی لکیر کھینچ گیا تھا۔ چارپائی پر پڑے ہلدی رنگے پیر مزید زرد ہو چکے تھے۔

جیسے ان کا سارا لہو کھینچ کر وہ خونی لکیر چار کنال کے صحن کے بیچوں بیچ بنا دی گئی ہو۔

پورے گاؤں کے مرد و زن روتے پیٹتے ہمراہ تھے۔

''ہائے چھوٹا ملک ہائے ملک افتخار۔ ہر بیں توں کو پوچھنے والا۔'' روتی پیٹتی عورتیں رانیں اور سینے دھڑ دھڑ کوٹتی ہوئیں۔ جیسے کوئی جنازہ جاتا ہو جس کا نظارہ میت خود کرتا ہو۔ چہرے پر وہی وقار اور سنجیدگی کہ جب وہ شب کے عقوبت خانوں میں سے تشدد زدہ حالت میں نکلتا تو اس کے چہرے پر یہی کیفیت ہوتی۔ جیسے اس پاگل ماحول پر کوئی فرزانہ ٹھٹھہ کرتا ہو۔ اس ساری چیخم دھاڑ میں اس کے لب بس ایک بار ہی کھلے تھے اور ایک ایسی بات ادا ہوئی تھی جس پر اس خاندان کی آئندہ پکڑ ہونے والی تھی۔ کیونکہ ایسا ظرف کسی انسان میں تو ہوسکتا ہے قانونِ قدرت میں ہرگز نہیں۔ فطرت صابر نہیں ہوتی وہ اپنے حساب برابر چکاتی چلی جاتی ہے۔

اس نے اپنے خاندانی منشی کو مخاطب کر کے کہا تھا۔ ''منشی رمضان! میری فکر نہ کرو امتیاز کا پتا کریں وہ کوئی مزید حماقت نہ کر بیٹھے۔''

اس جواب پر گاؤں کے مردسروں سے پگڑیاں کھینچ کر منہ چھپا کر دھاڑ دھاڑ روئے تھے اور عورتوں نے جھوم جھوم کر سینے کوٹے تھے۔ اب سست رفتار ٹریکٹر ٹرالی کھڈوں بھری کچی سڑک پر دھچکے کھا کھا کر ٹویوں ٹبوں پر اچھل اچھل کر چل رہی تھی۔

پورے گاؤں کے مرد ٹریکٹر ٹرالیوں، موٹر سائیکلوں، بائیسائیکلوں پر ہمراہ تھے۔

یہ کیسا شخص تھا کہ جب بھی کہیں کو جاتا ہمراہ جلوس ہو لیتا۔ اب جو سوئے مرگ چلا تو بھی ہمراہ اک جلوس تھا وہی نوکر مزارعے موچی نائی کمی کمین رعیت رعایا، جو نوکرانیوں سے رازداری سے کہتے۔

''چھوٹے ملک کو کسی طرح باہر نکالو۔''

وہ جو گھر سے اس کے لیے چوچا بھنوا کر لاتے۔ اُس کے نیلوں پر گرم وٹے کی

ٹکوریں کرتے۔ زخموں پر ہلدی تیل کے پھاہے رکھتے۔ اور اُترے ہوئے جوڑ چڑھاتے اور اس کے ساتھ مل کر اس دہشت زدگی پر قہقہے لگاتے۔ آج بھی وہی سارے اُسے بچانے کو دوڑ دوڑ کر ہف رہے تھے۔

ٹریکٹر ٹرالی کے ہر جھٹکے کے ساتھ لہو کی پیالیاں الٹ رہی تھیں۔ ٹریکٹر جھٹکے مار مار کر جتنا تیز ٹرالی کو کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شہر اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔

نجانے کتنا خون ابلا، کتنے زخم کھلے کتنی ہڈیاں کڑکیں اُس کے حوصلے کے حضور، اُس کے صبر کے روبرو اُس برداشت کے سامنے سب ششدر چپ تھے۔ ٹرالی میں اک سناٹا تھا۔ اردگرد دیوار بنائے کھڑے لوگ اک دوجے کو سنٹھ نگاہوں سے دیکھتے۔ جیسے روبرو کوئی صوفی سنت ہو۔ جیسے کوئی مسجد مندر، کوئی پیر فقیر کوئی درگاہ خانقاہ کہ بولے تو بے حرمتی کی سزا ملے گی۔

نجانے اُس روز ٹریکٹر ٹرالی نے کتنی صدیاں لگا دیں۔ ساہیوال شہر اتنا دور ہو گیا جتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ ٹرالی کا فرش خون سے لتھڑ گیا تھا۔ چار پائی کے گرد کھڑے افراد کے جوتے لہو سے چپچپانے لگے تھے۔

ڈاکٹر نے پوچھا تھا:

”آپ کے ساتھ یہ سب کس نے کیا۔“

اُس قاتل چار پائی پر لہو نچڑتے وجود میں پوری کھلی آنکھوں اور پورے جاگتے دماغ کے ساتھ ماحول کی ساری دہشت نا کی کو محسوس کرتے ہوئے اُس نے جو جواب دیا۔ اُس پر یہ نوکر مزارعے دھاڑیں مار مار روئے اور آنے والے دنوں میں اس جواب پر کئی لوک گیت بنے۔ جنھیں پھٹی کے موسموں میں دیہاتی عورتوں نے بینوں کی صورت میں الاپا۔ اُس نے کہا تھا۔

”بندوق صاف کر رہا تھا۔ اچانک ٹرائیگر دب گیا خود سے ہی خود کو گولی لگ گئی۔“

ڈاکٹر نے ایمبولینس میں ڈال کر ڈرپ چڑھائی اور کہا:

ملتان لے جائیں یہاں آپریشن کی سہولت نہیں ہے....خون بہت نکل گیا ہے....پر شاید....

اب ایمبولینس چل پڑی تھی۔

ملتان بہت دور تھا اور ایمبولینس بہت سست۔ ملتان مزید دور ہوتا چلا جا رہا تھا اور ایمبولینس مزید سست رفتار۔

ایمبولینس میں بس دو لوگ ہمراہ تھے۔ پورا گاؤں اندھیرا پڑے بارہ بور کے کارتوسوں کا خون نچڑتی خالی چارپائی کے ہمراہ لوٹ آیا تھا۔

جب اس نے کہا تھا ''میری ٹانگوں میں کچھ نہیں بچا۔'' شاید ٹانگوں کی جان کھنچ چکی تھی۔ لیکن آنکھیں اور دماغ پورے جاگتے تھے۔ یہ موت بھی عجب تماشا ہے۔ پورے وجود کی زندگی کھنچ کر دماغ میں آ رہتی ہے۔ مردہ وجود کے سرے پر مکمل جاگتا ہوا دماغ۔ موت کے پل پل کو مشاہدہ کرتا اور جھیلتا ہوا، تا دیر دماغ کے قطرے قطرے کو اگلتی نگلتی ہوئی موت، جیسے بیلن میں گنا۔

موت کی اذیت ناکی کو پچھاڑتے ہوئے وہ کئی گھنٹے گزار چکا تھا۔ جب اُس نے پوچھا تھا۔

''منشی رمضان یہ کس شہر کی بتیاں ہیں۔'' چھوٹے ملک حوصلہ کر پہنچ آئے ہیں۔ یہ ملتان شہر کی بتیاں ہیں۔''

اُس وقت تیل کا آخری تو مبا بھڑک کر لو تیز ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے ایمبولینس میں آ کر چیک کیا تھا۔

''یہ سب کیسے ہوا۔''

اُس نے کھلی آنکھوں اور پورے جاگتے دماغ کے ساتھ مضبوط آواز میں جواب دیا تھا۔

''بندوق صاف کر رہا تھا گولی چل گئی خود سے ہی خود کو گولی لگ گئی۔''
اور پھر بتی بجھ گئی۔
ملتان شہر کی بتیاں جلتی رہیں۔
ڈاکٹر کی اس اطلاع کے بعد بھی جلتی رہیں۔ ''بہت دیر کر دی افسوس خون زیادہ بہہ جانے سے ڈیتھ ہو گئی۔''
عجیب بات تھی ان بے شمار گھنٹوں میں کسی رکاوٹ والے لمحے کو اذنِ باریابی نہ ملا۔ ایک صدی کے برابر اس عرصے میں کیا کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ آخر تو موت کی پوری سازش چند ثانیوں میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہی تھی نا۔

حادثات کے اوقات عام اوقات جیسے تھوڑی ہوتے ہیں ان کے تو لمحے برسوں منٹ صدیوں جیسی طوالت رکھتے ہیں اور حادثے کو روکنے والے لمحے کی فعالیت بجلی کے کوندے سی باسرعت بروقت بر ہدف ہوتی ہے۔

اُسے بچانے کو قدرت نے کوئی سازش کیوں نہ رچائی۔ کوئی کوندا کیوں نہ لپکا۔ اتنے طویل سفر میں کوئی موڑ کیوں نہ مڑا، کوئی تقدیر والی بازی کیوں نہ کھیلی گئی۔ نیلے کچر نیم وا ہونٹوں پر اُس کی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ جمی رہ گئی تھی۔

''آخر تو ماں کی دعا تھی کسی رکاوٹ کسی تقدیر کو جرأت کہ درمیان میں آئے۔''

■■■■

چار کنال کا صحن ماتم سے اٹا تھا۔ اتنا کہ آسمان تھرتھرا رہا تھا۔ زمین لرز رہی تھی۔ ہزاروں قدموں تلے پکی اینٹوں کا فرش اکھڑ گیا تھا۔ اور صنوبر ڈر رہی تھی کہ اس نقصان پر بڑی بی بی جی کسی کو نہ چھوڑیں گی۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے دنیا آن پہنچی تھی۔

دس کلومیٹر کا علاقہ آہ وزاری اور بینوں سے دہل رہا تھا۔

رانیں، سینہ کوٹنے، سر پیٹنے، بال نوچنے اونچے لمبے بین اولار اولار دندن پڑنے والیاں اس موت کو روکنے کو ڈھال کیوں نہ بن گئیں۔

''ہائے پتا ہوتا تو میں کندھ بن جاتی۔ ہائے ظلمی گولیاں میرے آر پار اُتر جاتیں۔ میں مرجاتی پر تجھے بچا لیتی۔''

صنوبر کو لگتا ان گاؤں والیوں کا دکھ اُس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں تو اتنی بھی جنبش نہ ہو سکی کہ وہ ظلمی گولی اور ملک افتخار کے بیچ کھڑی ہو جاتی۔ اُسے تو ایک بے وقعت چارپائی نے جکڑ لیا۔ ایک حقیر نوکرانی کے ہاتھوں کی پکڑ نے اُس لمحہ کو گنوا دیا جس میں وہ اس گھڑی کو ٹال سکتی تھی۔ وہ گھڑی جس میں قدرت کسی بھی حادثے کو ٹالنے کا ایک موہوم سا موقع فراہم کرتی ہے اور ہر حال میں کرتی ہے۔ وہی موقع اس نے قاتل کی جسارت اور مقتول کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے خوف کے سکتے میں گنوا دیا۔ وہ حادثے کے پیچھے پیچھے بھاگتی رہی اور حادثہ اس سے ایک ہاتھ آگے آگے.... اس ہاتھ بھر کے فاصلے کو ہاتھ بڑھا کر پکڑ لینے کا اذن ہی نہ ہوا تو کیا اب اس جواں مرگ پر اس بہیمانہ قتل پر ماتم کرنا جائز ہے۔ کیا وہ اس کے لواحقین میں شامل ہو سکتی ہے۔

اس کے لواحقین تو یہ ہیں۔ یہ نوکر مزارعے یہ کمی کمین جن کے ماتم سے فضائیں گونج رہی ہیں اور آسمان رو رہا ہے۔

صنوبر تو بس ایک جملے کی مٹھی میں منہ بند ہو گئی تھی۔

''صبر صنوبر جی صبر۔''

اور غلافی آنکھوں میں ابھرنے والے دو موٹے موٹے آنسو۔ جو چھوٹی سی عمر کی بڑی سی کہانی کہہ کر سوکھ گئے تھے۔

بڑے ملک صاحب جو اُسے مار مار ادھ موا کر دیتے تھے۔ وہ کمر نہورائے حیران کھڑے سوچتے تو ہوں گے کہ وہ اس ماتم کا حصہ کیسے بنیں۔ جنھیں ساہیوال کے رستے میں

خبر ملی تھی اور وہ پیچھے پیچھے ملتان گئے تھے لیکن اس وقت تک وہ اپنے حصے کا آخری جملہ بول کر چپ ہو گیا تھا۔

''بندوق صاف کرتے ہوئے خود کو خود سے ہی گولی لگ گئی۔''

اپنے کانوں سن کر تو اس جملے کی سنگینی میں وہ عمر بھر تڑپتے رہتے۔ اچھا ہوا ان کی سماعتوں سے ٹکرانے سے پہلے ہی یہ جملہ دم توڑ گیا۔

کتنا بڑا ریلیف، نہ تھانہ کچہری، نہ عدالت، نہ مقدمہ سب اس اقبالی بیان میں بھسم۔

''خود سے ہی خود کو گولی لگ گئی۔''

صنوبر نے سوچا تھا اب بڑے ملک صاحب کی راتوں کی مصروفیت کیا ہوگی اور بڑی بی بی جی۔ جن کی دعا کی قبولیت کا لمحہ آن پہنچا تھا۔

''موت جوگا.... گولی جوگا۔''

اب ان کی ان دعاؤں کا ہدف کون ہوگا۔ اب ان کی زبان کی مصروفیت کا جواز کیا رہ گیا ہے۔

وہ سامنے پڑا نیلے کچر ہونٹوں سے مسکراتا تھا۔ جن کا سارا خون نچڑ چکا تھا۔ لیکن لب ذرا ذرا کھلے تھے جیسے ابھی بول پڑیں گے۔

''میں نہ کہتا تھا بی بی جی! میں آپ کو اپنی پھوڑی پر رونے کا موقع ضرور فراہم کروں گا۔ اب آپ اپنی دعا کی قبولیت پر جی بھر کر روئیں۔''

■■■■

عورتیں بڑی بی بی جی کے گلے سے لگ لگ کر چیخیں کوکیں مار رہی تھیں۔

''ہائے بڑی بی بی جی ای ی تو آج لٹ گئی۔ ہائے اجڑ گئی۔ بی بی ای ی! تو جاگیردارنی ہو کر فقیرنی ہو گئی۔ تیرے سے تو آج پنے والیاں بخت والی ہیں تو بختوں والی ہو

کر بھی بخت پٹی ہو گئی۔"

صنوبر خوفزدہ تھی کہ ابھی وہ منہ سے دوپٹہ اُتار پھینکیں گی اور ڈپٹ کر کہیں گے۔

"تمہاری جرأت کہ میرے بخت پیٹو مجھے فقیرنی اور پیرنی کہو۔ چوہریو مسلنو، مراثنو، نوکرانیو، کمنیانیو، مزارعیو!"

صنوبر کو روتی پیٹتی بھیڑ نے دھکیل کر ایک کونے میں لگا دیا تھا۔ وہ احساس گناہ کے آنسوؤں میں بھیگتی عورتوں کی بدبو مارتی بغلوں اور دھوتیوں شلواروں کے پنجرے میں قید بجھتی موم بتی سی اپنی ہی موم میں جکڑی سوچتی تھی۔ جس گھر کے ٹارچر سیل میں وہ عمر بھر تشدد سے نبرد آزما رہا تھا۔ اُسی گھر میں اُس کی میت پڑی ہے۔ وہی تشدد رساں ہاتھ اُسے قبر میں اُتاریں گے۔ اُس کی موت کی دعائیں مانگنے والے اُس کے لواحقین کہلائیں گے یہ رونے پیٹنے والے انہی سے تعزیت کریں گے۔

ارے ان ہزاروں میں سے کوئی تو کہے کہ یہ جنازہ اس گھر سے نہیں اُٹھے گا۔ کوئی تو کہے کہ قاتل کے گھر سے مقتول کا جنازہ نہیں اُٹھتا۔ ان کمی کمینوں کی جھونپڑیوں سے اُٹھے گا۔

مشرق کی سمت سے سرخ خونی آندھیاں اُٹھیں جو اس کی تدفین کے احترام میں چپ تھیں۔ اس چاند کے چھپتے ہی پورے زمین و آسمان کو تہہ و بالا کر دیا۔

اس علاقے میں جب بھی ایسی آندھیاں اُٹھتی تھیں تو ہر ایک رب کی پناہ مانگتے ہوئے رائے زنی کرتا۔

"کہیں تو بے گناہ خون ہوا ہے۔"

اور جلد ہی کسی بے گناہ کے قتل کی خبر مل جاتی۔ اگر خبر پہلے مل چکی ہوتی تو عورتیں الگنیوں سے کپڑے اُتارنے لگتیں۔ اڑنے ٹوٹنے والی اشیا کوٹھوں میں سنبھالنے لگتیں۔ کیونکہ یہ طے تھا کہ ابھی فضائیں بھر جائیں گی۔ ہوائیں احتجاجاً اپنی زد میں آنے والی ہر

شے کو الٹا پلٹا دیں گی۔ اور جنات غصے سے لال پیلا ہو کر پوری زمین کی گرد لکھ کا نے ٹوٹیاں پوریاں، چھپریاں، دیواریں جھگیاں، کلیاں، گیندوں کی مانند اچھال اچھال پھینکیں گے۔ جیسے والی بال کا کھیل کھیلتے ہوں۔ ایک ناحق خون کا بدلہ پوری خلق خدا اور کل کائنات سے چکائیں گے۔

اب بھی اس خونی زمین پر قہر خداوندی نازل ہو چکا تھا جو ہر حال میں نازل ہونا ہوتا ہے۔ پتا نہیں ناحق ہو جانے کے بعد ہی کیوں پہلے کیوں نہیں۔

یہ سب عناصر فطرت آخر اس ایسے کو روکنے کے لیے بروقت غضب ناک کیوں نہیں ہوتے۔ خاموش رہ کر نیم رضامندی کیوں ظاہر کر دیتے ہیں۔ اس ساری سازش کا خاموش حصہ کیوں بن جاتے ہیں۔

جیسے صنوبر کو رکاوٹ بننے سے روکنے کو نوکرانی کے ہاتھ اور پیر میں پڑنے والا الٹا جوتا ذریعہ بن گئے۔ اگر یہ دونوں کام نہ ہوتے تو یہ حادثہ بھی نہ ہوتا۔

▪▪▪▪

اگلی صبح مرگ والے گھر میں کہیں سے ناشتہ آیا تھا۔ لال پھولوں والے پیلے دستر خوان میں پراٹھے لپٹے تھے۔

بڑی بی بی جی نے دستر خوان کی سمت خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔ اُن کی دھاڑ میں کل دن بھر کے ماتم نے کوئی ضعف پیدا نہ کیا تھا۔

"نہ یہ دستر خوان کس کی اجازت سے اندر صندوق میں پڑا ہوا اُٹھایا ہے اور کس نے پھاڑنے کی جرأت کی ہے۔"

ناشتہ کرواتی خادماؤں کے چہرے فق ہو گئے۔ اور ہونٹ سفید جیسے سارا خون کھینچ کر کسی زخم کے سوراخ سے بہہ گیا ہو۔ وہ بی بی جی کے جھانپے کے ڈر سے پیچھے ہٹ گئیں۔

"جی وہ چھمی ماچھن کہہ رہی تھی کہ یہ آٹھ پونے ہیں جو جڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے پھاڑ کر پراٹھے لپیٹ کر کچھ باہر مردانے میں بجھوا دیے اور کچھ اندر مہمانوں کے لیے۔" یہ وہ جملے تھے۔ جس نے بی بی جی کے مزاج میں رات سے تھمی ہوئی لال پیلی آندھیاں دوبارہ جھلا دی تھیں۔ جڑ سے اکھاڑ کر درختوں، کوٹھوں کی چھتوں اور چھپریوں سے والی بال کھیلنے والے جنات لال بھبھوکا چہرہ لیے نوکرانیوں پر چڑھ دوڑے۔

"نہ یہ چھمی کمنیانی زیادہ دانا بینا ہے۔ ہائے ہائے ظلم خدا کا، نہ پوچھا نہ بھالا۔ میرا بیس سال سے سنبھلا ہوا دسترخوان پل میں چیر چھاڑ کر کھلے خاں کر دیا بلا اس کھوتی کو میں پوچھوں ذرا گدھی کو۔"

چھمی ماچھن لرزتی کانپتی عدالت میں حاضر ہوئی۔ کل سے رو رو کر سوجی ہوئی آنکھیں سر پٹختے ہوئے انگلی بائیں آنکھ میں چبھی تھی ناخون اُتر آیا تھا اور بال جٹائیں بن چکے تھے۔

صنوبر کو لگا اُس کے ارادے کے برعکس اُس کا دماغ چیخ پڑے گا۔ اُس کے حلق میں منہ بند چیخ چیخ جائے گی۔

"ہاں جو کل ہوا یہ نقصان اُس سے یقیناً بڑا ہے۔"

اُس کے لب جدا ضرور ہوئے لیکن ارادے کا عکس لفظوں میں ڈھل نہ سکا۔

بڑی بی بی جی کو رشتہ دار عورتوں کے چہروں کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ ان میں سے کوئی بھی ان کے مقام و مرتبے کی ہمسر نہ تھی۔

"جو خدا کی طرف سے ہونی آئی وہ تو بندہ سہ جانے پر مجبور ہے اُس پر کسی کا زور نہیں۔ پر بندوں کے ہاتھوں نہیں سہ سکتا۔ اتنا زیاں، پل بھر میں اتنا نقصان، بیس سال کی سنبھلی چیز گھڑی میں چیر پھاڑ دی۔"

یہ جملے شاید شریکنیوں کی معنی خیز مسکراہٹوں کا جواب تھا۔

"نی پھاتاں! لہو والی منجی نلکے تلے رکھ کر دو جنیاں لگ کے دھووا سے ایک اوپر نلکا

گیڑے دوسری برش مارے گھسٹر کے، سوتر کی بنی ہوئی چنگی منجی تھی۔ اللہ کرے اب خون چھٹ جائے۔ کاسٹک سوڈا ملا کر صابن رگڑو۔"

تعزیت کے لیے آئی رشتہ دار عورتوں نے ایک دوسری سے آنکھیں ملائیں اور ہونٹ دانتوں تلے دبائے۔ بڑی بی بی جی نے کشادہ پیشانی تیوریوں سے بھر کر ہدایات کی تفصیلات جاری رکھیں۔

سامنے قاتل کمرہ دھویا جا رہا تھا۔ بانسی جھاڑو کی ضرب سے کل کا جما ہوا خون منوں پانی کو رنگ رہا تھا۔ کمرے سے نکلتا پانی برآمدے میں سے خونی نہر کی مانند بہہ کر باہر نالی میں گر رہا تھا۔ چارپائی پر گرتی ہینڈ پمپ کی کھلی دھار مسلسل خون میں تبدیل ہو رہی تھی۔ باہر نکلتی خون سے بھری نالی پر ملازم بیٹھے روتے بی بی جی کی ہدایات سنتے تھے۔

نلکا گیڑنے والیاں تھک گئیں لیکن لہو چھٹ ہی نہ رہا تھا۔ اتنا پکا اتنا گوڑا جوان خون.... جیسے کبھی دھویا نہ جا سکے گا۔

آخر ایک سیانی بیانی نے آ کر بی بی جی کے کان میں صلاح دی۔

"بڑی بی بی جی آڈر ہو تو منجی تالاب میں لے جا ڈالیں۔ کھلے پانیوں میں لہو چھٹے تو چھٹے نلکا گیر گیر بس ہو گئی۔ منوں منہ خون جما ہے۔ آخر تو جوان خون تھا۔ ٹرالی بھی لے جا کر نہر میں دھوئی ہے۔ دس بندوں نے مل کے پھر بھی سنا لہو نہیں چھٹا۔"

بی بی جی کو صلاح پسند آئی۔

"ہاں لے جاؤ پر خیال رکھنا نویں نکور منجی خراب نہ ہو جائے۔ پروں پرار ہی تو گھر کے سوتر سے پھولوں والی بنتی میں بنوائی تھی۔ دو دن تو بننے والوں کے لگے تھے۔ رنگلے پائے تو سرگودھے سے منگوائے کہ خوشاب سے یاد نہیں رمو منشی لایا کہ شان مزارع، باہیاں تو گھر کی ٹاہلی چروا کر آپ ٹھکوائیں۔ دو درجن باہیاں ٹھکوائی تھیں۔"

بی بی جی نے شدید احساسِ برتری کے ساتھ بھاری چوٹیا پر ہاتھ پھیرا۔

رشتہ دار عورتوں نے صحن میں بکھری معمولی چارپائیوں پر تنقیدی نگاہیں دوڑائیں۔

''یہ تو ان نوکر مزارعوں کے گھر سے لا کر بچھا دی ہیں چنگیاں منجیاں وہ تو اندر انبار خانوں میں ڈھک کے رکھی ہوئی ہیں۔ دیکھے بھوک اُترتی ہے۔''

کسی رشتہ دار خاتون کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

''اللہ ایسی منجیاں نہ ہی ٹھکواتا۔ کیا پتا تھا تجھے کس نحس گھڑی کے لیے ٹھکوا رہی ہے۔ نج ٹھکواتی ایسی منجی۔ آگ لگا ان منجیوں کو....''

عورتوں نے بین کا سرا پکڑا۔

جنگلی حلق سے کھرج دار لحن میں لمبے پُرسوز بین۔ رُلا رُلا کے مار ڈالیں۔ یہ جنگلانیاں تو پیدائشی روندالیاں۔ ان کے حلق تو بے بات بین اگلنے کو اُتارو۔ اب تو ان کے منہ خون سے بھرے تھے۔ اب تو کلیجے کٹ کٹ کے لفظوں کے ہار پروتے تھے۔

ساری ہواؤں فضاؤں کو کوٹنے پیٹنے لگیں۔ عورتوں کا ہر نیا آنے والا گروہ اس نوحہ خوانی میں شامل ہو جاتا۔ اور صنوبر خون کے دریا میں ڈوب جاتی۔ جس طرح لہو آلود چارپائی تالاب کے سیاہ کیچڑ گھلے گاڑھے پانیوں میں ڈوب کر اُنھیں بھی لال رنگ میں تبدیل کر رہی تھی۔ جسے دیکھنے کو اک خلقت اکٹھا ہو گئی تھی۔

''ہائے شینہہ جوان کا لہو پینے والی منجیئے۔ تو کبھی نہ ٹھکتی، کبھی نہ اونی جاتی، کبھی نہ بچھائی جاتی۔''

یہ عورتیں بے تکان رو سکتی ہیں۔ کتنا پیٹ سکتی ہیں۔ کتنے آنسوؤں کا ذخیرہ ہے ان کے پاس جس کا منبع کبھی ختم ہونے کو نہیں آتا۔ یہ جنگلی لحن کتنا حزن ہے کہ عزرائیل بھی سنے تو رو دے۔

لیکن بڑی بی بی جی چند دنوں میں ہی اک تھک گئیں۔

ان خطرناک دہلا دینے والے باریک باریک نکتے نکال کر دہائی دینے والیوں سے

انھیں سازش کی بو آنے لگی۔

''ہائے ہائے ان کنجریوں چوہریوں کو زیادہ غم ہے نا جس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا کشٹوں سے پالا پوسا۔ اُس سے بھی زیادہ غم ہے نا انھیں..... ساری سازش..... یہ ہمیں رُلا رُلا کر مارنا چاہتی ہیں۔ مرنے والے کے ساتھ کبھی کوئی مرا ہے۔ دشمنوں کی سازش پہلے چلی۔ پر اب کامیاب نہ ہونے دوں گی۔''

کون سے دشمن۔ کون ہیں سازش کرنے والے۔

کیا یہ عوام الناس؟ جو بھکوں ہٹیوں کھیتوں چوراہوں بھنیوں جھگیوں میں سوگ منا رہے تھے۔

وہ نوجوان جو خشک سالیوں میں بارش مانگتے ہوئے گوبر ملے پانی کی بالٹیاں اک دوجے پر انڈیلتے اور جسے ملک افتخار پر بالٹی انڈیلنے کی اجازت مل جاتی وہ اپنے کارناموں میں اسے سرفہرست گردانتا۔

جن نوعمر لڑکوں کو نلکا گیر کر ملک افتخار کو نہلانے کا اعزاز حاصل ہو جاتا۔ وہ شام پڑے وانجو کھیلتے ہوئے اس اعزاز کا فخریہ اظہار کرتے۔ وہی ملک افتخار کہ مربعوں کی سیر کو جاتا تو پیچھے جلوس چلتا۔ اور گاؤں کی مٹیاریں اوک بنا ماتھے پر ہاتھ رکھ شست باندھتیں۔

''ہائے نی پنڈ دا سنگار۔ سونیاں گلیاں سج گئیاں۔'' وہی ملک افتخار اسی کا ماتم بھنیوں، بھکوں اڈوں کھوکھوں کھیتوں کھلیانوں میں دنوں منایا جاتا رہا۔

اُس سال طے شدہ شادیاں روک دی گئیں۔ سارے میلے ٹھیلے کبڈیاں بازیاں ملتوی کر دی گئیں۔ بازی گر، شعبدہ باز، بھانڈ ہیجڑے، رنگ باز۔ سارے اس گاؤں میں آئے اور روتے ہوئے لوٹ گئے۔

''ہائے ملک افتخار ہائے شینہہ جوان۔ ہائے کیسی موت۔''

گمنام شاعروں نے کتنے دوہے اور ڈھولے گھڑے، افتخار کی حسین جوانی سے گولی

لگنے تک، خون سے اٹی ٹریکٹر ٹرالی کی عکاسی سے موت گاڑی کی آمد تک۔عصر کے خونین لمحوں سے فجر کے پُرملال دھند لکے تک جب موت گاڑی اس گاؤں میں داخل ہوئی تھی۔ صنوبر کی آہ زاری سے وڈے ملک کی بے بسی تک۔گمنام شاعروں کی فطری شاعری عروج پر تھی۔ان دوبیتی سہ بیتیوں کا پہلا مصرع فطرت کے کسی حسین منظر کی عکاسی پر مشتمل ہوتا اور دوسرا مصرع کسی گہری دانش، دکھ، المیے حادثے کو بیان کرتا۔

جن کے شاعروں کا کوئی اتاپتا کبھی نہ ملتا کیونکہ اس سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی شاعری میں ہر کوئی اپنے حسابوں آمیزش کرتا رہتا۔اسی لیے ایک شعر مختلف اوقات اور مختلف علاقوں میں اپنے الفاظ تبدیل کرتا رہتا۔مطالب چاہے وہی رہتے۔جن میں علاقے کی تاریخ، فطرت، افراد، معاشرت کے حوادث وواقعات کو پرویا جاتا۔

اب کی بار تو اتنے گیت نکلے۔اتنے تو اجاڑوں میں بھی نہ بنے تھے۔جتنے گیت اس ساؤنی میں کپاس کی چنائی کرتی عورتوں لڑکیوں نے ہر ہر گھوکھڑی سے پھٹی چنتے ہر خوشۂ کپاس کو آنسوؤں میں بھگو بھگو کر پشت پر بندھی جھولیوں میں رگ بھر بھر بیتوں میں پرویا۔ لوک دانش کے کئی اقوال زریں بنے جس نے زندگی کے فلسفے اور بے اعتباری کی فعالیت کو مہمیز کردیا۔

حد تو یہ کہ معمولی سوجھ بوجھ والی یہ دیہاتی لڑکیاں بھی شاعر بن گئیں اور ہر سوحزنیہ شاعری کے یہ بین الاپے جانے لگے۔صنوبر سوچتی تھی۔کیا یہی سب دشمن ہیں۔

▪▪▪▪

امتیاز

جب امتیاز کو بے شمار ہاتھوں نے گرفت کیا اور اڑونگا لگا کر چت کیا گیا۔ تو وہ بے پناہ فالتو توانائی میں ہونکتا تھا اور بدن کا سارا خون آنکھوں سے نچڑتا تھا۔ زخمی کونج سی لال بوٹی آنکھیں گھما گھما کر چہار اطراف خوف کے انجانے سایوں کو دیکھتا تھا۔ جرم کی مجبوری میں حیران و پریشان کس قدر بے چین بے سکون روح خون کے آنسوؤں میں ڈوبا ہوا۔ وہ جو اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ وہ کس قدر پر سکون اور بے فکر سوئے مرگ رواں ہوا تھا۔ اور یہ جو اپنی زندگی کی حفاظت کے لیے خطرے سے نجات پا گیا۔ یہ اس قدر مجنون سا کیوں۔ مجرم کے لیے کتنا ضروری ہے۔ سزا و جزا کا عمل، مقدمہ، حوالات، کچہری، عدالت۔

ضمیر کی قید کی بجائے جیل کی قید گوارا بنا دیتی ہے کسی بھی قبیح فعل کو۔ اطمینان بخش احساسِ معصومیت کہ کیے کی سزا بھگت کر گناہ کا ازالہ کر لیا ہے۔ ضمیر کے اطمینان کے لیے کتنے کفارے دیت، معافی سزائیں جزائیں خود خدا نے مقرر کر دی ہیں۔ یعنی خود مجرم کی رستگاری کی کئی راہیں وا کر دی ہیں۔ جب معاف کر دینے والا عظیم، انتقام غیر مستحسن بدلہ

اگلے جہاں میں۔تسلیاں تشفیاں کتنی، یہاں تو پھر جرم کی نوعیت ہی بدل گئی تھی۔مقتول نے تو خود اپنے سر لے لیا تھا اپنا قتل۔جب اُس نے کہا تھا:

''بندوق صاف کرتے ہوئے خود سے ہی خود کو گولی لگ گئی۔''

اس اقبالی بیان کے علاوہ نہ کوئی مدعی نہ گواہ نہ کوئی کارروائی نہ کوٹ، کچہری، کیونکہ خود مقتول کہہ گیا تھا کہ اُس نے خود اپنے آپ کو مارا۔

کتنی اداس چھوڑ گیا تھا وہ شاماں والی ڈانگ کتنی سونی تھیں گالیوں اور بددعاؤں بھری وہ حویلی کی فضائیں۔جو گولی کا بارود بن کر ٹھیک نشانے پر لگی تھیں۔بارہ بور کی بندوق کی مانند اپنے حصے کا کام تمام کر کے کتنی بے کار ہو گئی تھیں ایک دم فارغ۔سارا عمل درست سمت تمام ہوا۔

پھر یہ رعیت کیوں کلپ رہی ہے۔بدبودار عورتیں کیوں اپنے چیکٹ لباسوں کو کوٹ کوٹ کر بینوں کی گرد اُڑا رہی ہیں۔لیکن یہ فطرت بڑی ظالم ہے۔کبھی معاف نہیں کرتی۔انسانوں کو اپنی پسند کے اعمال میں جینے نہیں دیتی۔کسی بھی دانستہ یا نادانستہ فعل کا پورا پورا حساب رکھتی ہے۔ناپ تول کر جواب دیتی ہے۔

کہیں مقدمہ چل رہا ہوتا ہے۔پیشیاں ہو رہی ہوتی ہیں۔یہ فطرت کسی فطری منصف کے سامنے خود ہی وکیل ہوتی ہے۔خود ہی فیصلے پر عمل درآمد کراتی ہے۔خود ہی قصاص، دیت کا تعین کرتی ہے لیکن معافی کا لفظ نہیں ہے اس کی عدالت میں۔قانونِ فطرت میں ایک ہی لفظ لکھا ہے ''بدلہ''۔اندھا بہرہ ''بدلہ'' قصاص، نسلوں سے، قوموں سے، بادشاہتوں اور امارتوں سے۔

امتیاز تو پھر قدرت کا ایک معمولی مہرہ تھا۔وہ چارہ جو تقدیر کی سنگینی کو اپنا کھیل کھیلنے کے لیے موقعِ واردات بنا کر دیتا ہے۔

موقع بن چکا تھا۔اب فطرت اس خاندان کے سارے جرم، سارے گناہ، سارے

بدلے، سارے مکافاتِ عمل اسی چوکھٹے میں فٹ کر دے گی۔ وہ بھی جوان سے مرز نہیں ہوئے لیکن اُن کا حساب نسلوں کی مسافت کے بعد اُن تک پہنچا اور وہ بھی جو اُن کے اپنے کرن تھے چاہے نادانستہ۔

صنوبر کی تو دنیا ہی تبدیل کر دی تھی اس ایک موت نے۔ سلٹھ زبان کے تو پے ادھیڑ دیے تھے وہ جو کبھی کچھ بولنے کے تصور سے ہی کانپتی تھی اور زبان لڑکھڑا کر خشک پتھر سے تالو سے جڑ جاتی تھی۔

اب وہ یکبارگی ناصح بن گئی، وکیل صفائی بن گئی۔ مُبلغ بن گئی، منصف بن گئی۔ وہ امتیاز کو جینے کی ترغیب دینے کو بڑی بڑی دلیلیں گھڑنے لگی۔ وہ کسی بھی اصطلاح سے انجان، ناواقف، Motivational Speaker بن گئی، وہ ماہر نفسیات بن گئی، وہ تقدیر اور قدرت کی موشگافیوں کو اظہار دینے لگی۔ اُس کی زبان گھنٹوں بولنے کی صلاحیت حاصل کر گئی۔ اگر ملک افتخار جیتا ہوتا تو اپنی غلافی آنکھوں کی گھنی پلکیں جھکا کر کہتا۔

"مجھے پہلے بتا دیتیں میرے مرنے سے آپ کو اتنا کانفیڈینس حاصل ہو جائے گا تو میں پہلے مر جاتا صنوبر جی۔"

وہ تقدیر، قدرت، اٹل مقدر کے ایسے ایسے نکتے نکالتی کہ کوئی بھی شخص متاثر ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ امتیاز کسی دلیل کسی منطق کو تسلیم ہی نہ کرتا تھا۔ اُس کی ہر دلیل میں سے ایسا اختلافی نکتہ نکالتا کہ وہ لاجواب ہو جاتی۔ اُس کا دماغ اطمینان والی حالت سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ ہر پل نئی بے سکونیت کے لیے نیا اطمینان کہاں سے ڈھونڈا جائے۔

بے چینی پراگندگی کا کچرا دماغ جس میں زہریلی گیسیں چھٹتیں، ٹوٹتی نسیں، رندھتی رگیں۔ "بعض اوقات ہم دوسروں کی خواہشات کا آلۂ کار بن جاتے ہیں۔ ہمارے دماغ میں جو بارود بھرا جاتا رہا ہو وہ ہمارے ارادے کے برعکس بھی پھٹ سکتا ہے۔"

وہ زرد بے جان نیلی رگوں بھرے پیر ادوائن میں گھسیڑتا ادوائنیں ٹوٹتیں چارپائی

جھلنگا ہو جاتی۔

"لیکن وہ بچ سکتا تھا اگر وہ بڑا نہ ہوتا مجھ سے چھوٹا ہوتا تو جیتا رہتا۔"

اس کی باچھوں سے چپکا خشک لعاب آنسوؤں سے پگھلتا۔ دنوں نہ نہائے بدن اور بالوں سے اک بوجھل مہک چھٹتی۔

"جب میں منشی مستان کے ساتھ مربعوں کی سیر کو جاتا۔ تو میں اُسے بتاتا کہ منشی مستے۔ میرے والدین مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ میں بہت لائق ہوں۔"

صنوبر بہانے سے دوپٹہ ناک پر کھینچتی۔

"پرانی باتیں اُسی پرانے وقت میں دفن کر دینے کے لیے ہوتی ہیں۔ اُن کا بوجھ نئے وقت کے بدن پر نہیں سوار کرواتے ورنہ نئے وقت کا تیز رفتار گھوڑا تم سمیت تمہارے بوجھ کو پٹخ کر لتاڑ دے گا۔"

لیکن وہ تو کہیں اور سے سنتا تھا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اُلجھا کر انگلیوں کے کڑاکے نکالتا۔

آنے والے خوفناک حالات کالی ڈائنوں کی طرح اُسے ڈراتے۔ وہ نقشہ چٹختا بکھرتا جو بچپن سے اُس کے دماغ کے چوکھٹے میں فٹ کیا گیا تھا۔ اگر حاصل نہ ہو سکا تو سب تباہی۔ منشی مستا خوشامد اور لجاجت سے نچڑنے لگتا۔

"نہ بادشاہزادہ جی! یہ تیری جاگیریں یہ تیری زمینیں ڈھیر.... بھوکے مریں تیرے دشمن۔ تیری تو نسلیں بھی عیش کریں گی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہ بھلے ساری حیاتی۔ رزق کی تھوڑ کبھی نہ لگے۔ اللہ سائیں کے فضل بہوں ڈاڈھے ہیں۔"

امتیاز کے کانوں میں مکڑی کے جالوں سی سرسراہٹ تھی۔ جیسے بازگشت ان جالوں سے ٹکرا کر کانوں تک پہنچتی ہو۔ لفظ اپنی ہیئت اور معنی تبدیل کرتے ہوں۔

"دس مربعوں کی آمدنی میں کیا عیش، مستے۔"

منشی مستے نے چھڑی سے منڈیر پر پھیلی پیلے پھولوں سے لدی کنڈیاری کو اکھیڑ کر پاسے رکھا۔

نہ نکا ملک نہ ڈاکٹر صاحب!

''دس نہیں آٹھ مربعے۔ گھوڑی پال کا پورا، سانڈ پال کا آدھا اور نمبرداری کا آدھا مربع تو جائے گا ملک افتخار کو۔ ونڈ پڑے گی باقی سولہ مربعوں میں....''

امتیاز نے تڑپ کر کنڈیاری پر پیر رکھ دیا۔ جیسے منشی مستے نے پھولوں بھری کنڈیاری دوبارہ اس کے سامنے رکھ دی ہو۔ خشک کنڈیاری پتا نہیں کس سیرابی کی بنا پر پھولوں سے لدی رہتی اس بار برنگ کے اکثر پھول زرد تھے جیسے مرن مٹی چڑھی ہو۔

''نہ مستے! وڈے ملک صاحب کبھی یہ نہ ہونے دیں گے۔ وہ یہ دونوں سرکاری مربعے میرے نام کروائیں گے۔ وہ تو اُن کا نافرمان بیٹا ہے۔ میں فرماں بردار ہوں۔ مجھ سے وہ شدید محبت کرتے ہیں۔ افتخار سے اتنی ہی شدید نفرت۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ان پکے مربعوں میں سے بھی زیادہ میرے نام کریں گے۔ وہ اس غنڈے بدمعاش کو کیوں دیں گے۔ میری ماں کا بس چلے تو اسے گولی مار دے وہ ہر وقت اسے موت کی دعائیں دیتی ہیں۔ لگیں گی منشی مستے! لگیں گی۔ آخر ماں کی آرزو ہے۔ ماں کی دعا ہے لگے گی۔ مر جائے تو سب کتنے سکون میں آجائیں۔ ایک فرد کی خاطر کتنے افراد پریشان ہیں، دکھی ہیں، کیوں نہیں مرتا یہ افتخار۔ یہ غنڈا بدمعاش۔''

خشک بھکرے کے بے شمار کانٹے تلوؤں میں چبھ گئے۔ یہ بھکرا بھی کس قدر ڈھیٹ جان بنا پانی بنا بیج کہیں بھی اگ آتا ہے۔ اور پھر پھیلتا چلا جاتا ہے اپنے وجود سے پوری زرخیز زمین کو ڈھانپ لیتا ہے۔ ہرا کچور پھر سوکھ جاتا ہے تو بیج کی ذرا سی گٹھلی پر نوکیں ہی نوکیں کانٹوں بھری گولی جو جوتے کے تلوؤں میں بھر کر کسی دوسری جگہ اگنے کو روانہ ہو جاتی ہیں اور بنا سیرابی بنا حفاظت ہر کہیں پھیل جاتی ہیں بے شمار گولیاں۔

"پیر سائیں! میری مجال کچھ بتانے کی نہیں۔ یہ تو انگریز سرکار کا قانون ہے جو صدیوں سے یونہی چلا آرہا ہے۔شاید وڈے ملک صاحب اپنے وزیر صاحب سے کہہ کر بدلوادیں۔ بدلنے میں ایک زبان ہی تو سرکار کی ہلنی ہے اور قلم نے لکھ دینا ہے۔ پکی سیاہی ہے۔ پر آج کے دن تک ونڈا ایسے ہی پڑنی ہے۔"

"دس مربعے ملک افتخار کے آٹھ آپ کے، چھوٹی بی بی جی کو تو وراثت سے حصہ ملنا نہیں۔"

دبڑے کے کانٹے بوٹوں کے موٹے سول کو پھاڑ کر ایڑھیوں میں چبھ گئے۔ وہ کیسا ہی پریشان ہو،ٹینشن میں ہو ڈیپریشن میں ہو۔ بھلے شیزوفرینیا کی دوائیں پھانکتا ہو،لیکن حصے کے معاملے میں تو پاگل بھی سیانا ہوجاتا ہے۔ وہ تو پھر ایک انتہائی ذہین بہترین دماغی استطاعت اور تانے بانے بننے جگاڑ لگانے میں ماہر ذہنی وراثت کا مالک تھا جو قدم قدم اُس تک پہنچی تھی۔ اب اس بے پناہ ذہنی زرخیزی کی وجہ سے کچھ اضافی فکریں اور سوچیں بھی پنپ آئی تھیں۔ جیسے زیادہ زرخیز زمین ان جڑی بوٹیوں کو بھی اگانے لگتی ہے۔ جن کا بیج کبھی اس میں ڈالا ہی نہ گیا ہو۔ اصل فصل جس کو اگانے کے لیے ساری محنت کی گئی ہوتی ہے۔ اس کو نقصان پہنچانے لگتی ہے۔ بعض اوقات تو اصل فصل کی بجائے مضر بوٹیاں زیادہ تعداد میں بھر جاتی ہیں اور فائدہ مند فصل مرجھانے لگتی اور نقصان دہ بوٹیاں اُسے نگلنے لگتی ہیں۔ کھیت ویران ہوجاتا ہے لیکن اصل فصل پھر بھی اگتی ضرور ہے۔

تو پوری نسلوں نے جس وراثت کی حفاظت کی ہو۔ اس قبائلی نسلی فریضے میں کوتاہی یہ بکھرا اگا دماغ بھی نہ کرسکتا تھا۔ جس دماغ میں میتھ، فزکس، کیمسٹری کے اوق اور کم یاب اصولوں کی فصل میں کثرت کے ساتھ واہموں، خوف، خیالوں ان دیکھے سایوں ان سُنی آوازوں جیسی دھمی سٹی، جُٹ مدھانہ، جوئی اور نوکیلے سرکنڈے اگنے لگے تھے۔

یہ واہمے کسی بھی معاملے میں غلط اندازے اور تخمینے لگا سکتے تھے لیکن وراثت کی تقسیم

پر حیرت انگیز طور پر شدہ فصل اگاتے تھے۔اس حساب میں کوئی غلطی نسلوں سے بھی کبھی سرزد نہ ہوئی تھی۔

''مستے! کیا بکواس کر رہا ہے تو۔لڑکیوں کا کون سا حصہ؟ انھیں جہیز نہیں مل جاتا۔اتنی بڑی برات کو کھانا نہیں کھلایا جاتا۔زیور نہیں چڑھایا جاتا۔بس تو یہ بتا کہ یہ مربعے میرے نام کیسے ہو سکتے ہیں۔''

مستا ہنس پڑا۔

''یہ تو پھر اُسی وقت ہو سکتا ہے چھوٹے ملک! کہ تو بڑا بیٹا ہو جائے۔پر یہ اعزاز اللہ سائیں نے ملک افتخار کو بخشا ہے۔جسے کوئی چھین نہیں سکتا اُس سے۔''

یہ پہلا موقع تھا جب اس کے دماغ کی زرخیز زمین میں پہلی بار منتر بوٹی کا بیج اُگ آیا۔

وہ کہتا:

''میں نے سوچا، افتخار سے سب نفرت کرتے ہیں۔امی جی تو ہر وقت اُس کی موت کی دعائیں کرتی ہیں۔ابا جی ہر رات اُسے پیٹنے کی اذیت سے گزرتے ہیں۔میرا خیال تھا سب خوش ہو جائیں گے کہ میں نے اُن کی مصیبت سے جان چھڑا دی۔میں ماں باپ کو خوشی دینے کا باعث بنوں گا کہ اس ناپسندیدہ انسان سے اُنھیں نجات دلا دی۔

پر ہوا الٹ، میں قاتل بن گیا۔وہ مقتول کے مظلوم والدین، بے مانہ قتل ہو جانے والے کے لواحقین....'' امتیاز زرد پیر چارپائی کی ادوائن میں گھسیڑتا۔ادوائن ٹوٹ ٹوٹ جاتی جیسے اُس کا گچھا مچھا بدن ٹوٹتا۔باچھوں پر جما گاڑھا زرد لعاب ملگجے آنسوؤں میں پگھلتا۔

''تمھیں پتا نہیں کہ امی جی اس کی موت کی ہر وقت دعائیں مانگتی تھیں۔ابا جی کتنی بار اُس کے پیچھے پستول لے کر بھاگے تھے۔لیکن مجرم.... صرف میں....'' اُس کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔لفظ ٹوٹتے۔

"لیکن مجرم صرف میں۔

کیا یہ سب نہیں چاہتے تھے کہ افتخار سے جان چھٹ جائے۔"

ایسے تمام لمحات میں صنوبر فلاسفر بن جاتی۔ کچی پکی فلاسفر نہ کتاب نہ استاد نہ دانش نہ علم بس بے ربط سوچ، جس پر بڑی بی بی جی طنزاً کہتیں۔ "پڑھی نہ پاتے بن بیٹھی علماء" یہ پاؤ بھر پڑھی سیر برابر عالم بن جاتی۔ خام اور کچی علمیت۔ وہ یکبارگی پینترا بدلتی۔

"قدرت کو انتقام لینا تھا میرے بھائی اس خاندان سے انتقام۔ یہ باعزت محترم خاندان تماشا بنا دیا نا۔ یاد ہے نا پھوپھی نیک بخت کی موت اُسے چڑیلوں نے مارا کہ دیوزادوں نے قدرت انتقام لیتی ہے۔ نسلوں کا انتقام۔ افتخار کے ساتھ تو تم نے نیکی کی جان چھٹ گئی مظالم سے۔ شاماں والی ڈانگوں اور گالیوں سے۔ تم نے گالیاں کبھی نہیں سہیں میرے بھائی! "اپنا وجود یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے غلاظت میں لتھڑ پتھڑ کوئی وٹوانی۔ انسان خود کو پاخانے کا چھونا سمجھنے لگتا ہے۔ یہ گالیاں وجود سے غلاظت کی طرح چمٹ جاتی ہیں۔ کبھی نہ جھڑنے کے لیے۔ تمھیں ان کا تجربہ نہیں ہے تم اس کراہت اور اذیت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اچھا ہوا بے چارے کی جان چھٹ گئی۔"

"پھر وہ تو قہر تھا خلقِ خدا کے لیے۔ اگر اُسے اقتدار مل جاتا۔ وہ بہت ظلم کرتا غریب عوام پر۔ کوئی بھی اُسے اندر سے پسند نہیں کرتا تھا۔ بس باہر باہر سے۔ میں نے دنیا پر نیکی کی، وہی نیکی میرا جرم بن گئی۔ ظالم کو مارنا ثواب کا کام ہے خلق خدا کو کسی جابر کے شکنجے سے آزاد کروانا نیکی کا کام ہے۔ خود اللہ سبحانہ تعالیٰ کا حکم ہے۔ میں نے اس حکم کی پیروی کی۔"

وہ اُس کے ہر خیال پر بھرپور اثباتی سر ہلاتی۔ جب حالات کو واپس موڑا نہیں جا سکتا تو جس نہج پر ہوں وہیں سے مزید نقصان سے بچانے کی کوشش تو کی جا سکتی ہے۔

"اگر وہ جیتا رہتا تو یہ ملک برباد ہو جاتا۔ کیونکہ اُس نے ایک روز صدرِ پاکستان بن جانا تھا پھر اُس نے پوری دنیا کو فنا کر دینا تھا۔ ہلاکو کی طرح چنگیز خان کی طرح میں نے دنیا

کوتاہی سے بچایا۔ میں نے ایک شیطان کے شر سے دنیا کو محفوظ بنایا۔ اپنی قربانی دے کر دوسروں کو بچایا۔ ایک روز اُس نے آرمی چیف بن جانا تھا۔ میرا یقین کرو اُس نے ضرور بن جانا تھا پھر اُس نے ایٹم چلا دینے تھے دنیا ختم کر دینی تھی۔ میں نے تو دنیا کو محفوظ بنایا ہے۔''

صنوبر اُس کی بگڑتی ہوئی ذہنی حالت سے پھر کوئی مثبت نکتہ نکال لیتی۔

کتنا ضروری تھا اس کا زندہ رہنا۔ قابیل بھی تو زندہ رہا ہوگا نسلِ انسانی کو جاری رکھنے کے لیے، اُس کا زندہ رہنا ضروری تھا۔ اس خاندان کی نسل جاری رکھنے کو قابیل کا مددگار سیانا کوا تھا۔ اس کی مددگار یہ سیانی۔

''دیکھو میں ہر وقت ہر پل آپ کے پیچھے لگی رہتی تھی۔ اُس دن پورا اکیلا چھوڑ دیا اسی وقت میں تم نے نہیں قدرت نے پلاننگ کر لی۔ میں چھری، درانتی، تھاپا، مونگلی، ڈنڈا تک چھپا کر رکھتی کہ آپ خود کو کوئی ضرب نہ لگا لو۔ پر بندوق سامنے پڑی رہنے دی۔ میں کئی منٹ اُٹھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن نوکرانی کے ہاتھوں نے میرے بال جکڑ لیے۔ زندگی میں پہلی بار کسی نوکرانی کو میرے بالوں میں تیل لگانے کی جرأت ہوئی تھی۔ میرے قریب بھی لگنے کی اجازت کسی خادمہ کو نہ تھی۔ اُس روز یہ اجازت اُسے کس نے مرحمت کر دی۔ میں نے کبھی بالوں میں تیل نہ لگایا تھا اُس روز کس طرح سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ ٹرائیگر کی آواز پر میں اُٹھ کھڑی ہوئی تو میرے پیر میں جوتا اُلٹا پڑا۔ جب تک جوتا سیدھا ہوا تم بندوق کے ساتھ نظر آئے۔ میں چیخی تھی لیکن آواز گلے سے باہر نکلی ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا نوکرانی چیخے گی اور افتخار تمہارے ہاتھ سے بندوق چھین لے گا۔ لیکن وہ تو کہیں ڈر کر بھاگ ہی گئی۔ میرا خیال تھا کہ افتخار ضرور کوئی تدبیر کر لے گا لیکن اسے تو بس گولی سینے پر کھانے کا حکم تھا۔ تدبیر کرنے کا ہرگز نہیں تھا۔ حالات کے تال میل میں تمہارا قصور صرف آخری گرہ لگانے والے کا بنتا ہے۔ سارا سوت تو پہلے ہی تانے بانے میں بنتی ہو چکا تھا میرے بھائی۔''

امتیاز نے اپنے میلے چیکٹ بالوں کی مٹھیاں بھر بھر نوچیں جیسے دنیا کو محفوظ بنانے

والی آسودگی میں چنگاری بھڑک گئی ہو۔

''کیونکہ وہ نظریں جھکائے اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔اسے میرا جھانولا بھی نہ پڑا۔ ناگہانی گولی لگنے سے اُس کے حلق سے گھک کی آواز نکلی۔لیکن گرا نہیں وہیں پیروں کے بل بیٹھ گیا۔گولی اُس کے سینے سے گزرتی پچھلی دیوار میں سوراخ کر گئی تھی۔ سفید کرتے پر ذرا سا لہو کا قطرہ ابھرا۔جب میں واپس پلٹا تو بندوق پھینک کر بھاگنا چاہتا تھا۔لیکن کمرے کی کھڑکی کھلی تھی جو کبھی بھی نہ کھلی ہوتی تھی۔بس اس کھلی کھڑکی سے مجھے خیال آیا۔ذرا سے سوراخ سے جو بوند بھر لہو نکلا ہے تو اس سے مر تھوڑی جائے گا۔مجھے ایک اور فائر کرنا چاہیے تاکہ جگہ پر ہی ختم ہو جائے۔ہسپتال لے جانے کی نوبت ہی نہ آئے لیکن وہ بہت دلیر تھا۔بہت بہادر وہ کئی گھنٹے خون اگلتا رہا۔اگر بروقت ہسپتال پہنچ جاتا تو بچ جاتا۔ بچ جاتا تو پھر مجھے مار ڈالتا۔''

''نہیں وہ تو تمھیں مرتے ہوئے بھی بچا کر گیا ہے، بچ کر تو وہ تمہاری حفاظت کرتا۔''

لیکن یہ خطرناک خیال لفظوں کے روپ میں وہ کبھی نہ ڈھال سکتی تھی کہ کہیں اُس کے اندر احساسِ جرم نہ اُبھر آئے۔

''ہم سب قابیل کی اولاد میں سے ہیں جرم کو گھول کر نسل کی آبیاری کرنا ہماری فطرت ہے۔'' بھکرا اُگا دماغ بھکرے کی سرسبز فصل میں مہکنے لگتا۔

''ہاں وہ بہت دلیر تھا اسی ڈر سے تو لوگ اُس سے اس قدر محبت کرتے تھے۔تمھیں پتا ہے نا کہ اس کا ماتم کتنے مہینوں جاری رہا۔میرے کانوں میں بینوں کی آوازیں اب بھی آتی ہیں۔وہ جو اک حزنیہ شور تھا وہ مجھے سونے نہیں دیتا۔یہ لوگ اس کا بدلہ لیں گے مجھ سے، مجھے کبھی بھی جینے نہیں دیں گے۔اس دن جب میں شہر گیا تو لوگوں نے وہ ٹریکٹر ٹرالی روک لی جس پر میں سوار تھا۔''

اُس کی بادامی آنکھوں کی وحشت! جیسے گولی کھائی زخمی کونجیں تڑپتی ہوں، لہو اگلتی

ہوئیں تاریک گڑھوں میں تڑپتی ہوئیں۔

"چاروں طرف بھیڑ جمع تھی لگتا تھا ابھی مجھ پر پتھروں کی بارش کر دیں گے مجھے ٹریکٹر کے مڈگارڈ سے گھسیٹ لیں گے۔ اُس روز میں اُن کے غیض وغضب سے کبھی بچ نہ سکتا اگر اباجی کی گاڑی اچانک وہاں نہ آجاتی اور وہ خلقت کو ڈپٹ کر مجھے گاڑی کے اندر بٹھا نہ لیتے۔"

"یہی بات تو میرے بھائی میں تمھیں سمجھاتی ہوں کہ تمھیں قدرت نے بچانا تھا تو عین وقت پر مدد بھیج دی تم نے سوچا بھی نہ تھا کہ اباجی اچانک کہیں سے آنکلیں گے اور ان کے ایک دبکے سے ہزاروں کی بھیڑ تتر بتر ہو جائے گی۔ تم کہہ رہے تھے نا کہ اُس روز وہ کھڑکی کیسے کھلی تھی تو اُسے کھولنے کی جسارت میں نے کی تھی۔ کیا بڑی بی بی جی کی حکم عدولی کوئی کر سکتا تھا پر اُس روز فطرت کے کسی جبر نے مجھ سے کروائی۔"

اس موٹیویشنل سپیکر کو اپنے نکتے کی وضاحت کے لیے بھر پور جواز میسر آ گیا۔

"اگر قدرت کو منظور ہوتا تو افتخار کے لیے بھی مدد کے کئی بہانے تھے۔ جو بن سکتے تھے لیکن نہیں بنے میں نے تو اُس کی موت اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی سر شام ہی دیکھ لی تھی۔ تمھیں میں نے کئی بار بتایا نا کہ اُس کی موت میں نے دیکھ لی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ موت لکھی ہوئی ہے چہرے پر لیکن میں حیران ضرور ہوئی تھی کہ یہ سرخ وسفید چہرہ یکبارگی اتنا زرد کیوں ہو گیا ہے۔"

وہ ادوائن میں الجھے پیر نکال کر اُٹھ بیٹھا۔

"تم نے میرے چہرے پر موت دیکھی کیا۔"

صنوبر نے چہرے کا بغور جائزہ لیا۔

"نہیں ابھی نہیں ہے۔" چہرہ پیلا زرد ضرور تھا جیسے لہو کا آخری قطرہ بھی نچڑ چکا ہو، خراب زردی پھینٹا انڈا۔ لیکن اُس زردی میں موت نہ گھلی تھی۔ موت والی زردی تو جیسے

ہلدی اور بیسن کا گھول ملا کر جلد کے نیچے لیپ دیا گیا ہو۔ چمکتا ہوا، سنی کے پھولوں جیسا۔ اُسے اماں صاحباں یاد آئی۔

اُس شام بھی جب وہ سرسوں کا ساگ توڑنے کو جانے والی ملازماؤں کے ہمراہ سرسوں کے کھیت میں چلی گئی تھی۔ تو سامنے مینڈھ پر چلتی ہوئی اماں صاحباں کے چہرے پر جیسے پورا سرسوں کا کھیت رس نچوڑ کر پوت دیا گیا ہو۔ اُس نے حیرت سے ملازماؤں کے چہروں کو دیکھا وہ بھی سرسوں کے کھیت کے کنارے ہی کھڑی تھیں لیکن یہ کھیت اُن کے چہروں پر منعکس نہ ہو رہا تھا۔

خود اس نے اپنے ہاتھوں کی جلد کو بھی گھورا، وہ بھی ویسی ہی گندمی تھی سرسوں کا کھیت صرف اماں صاحباں پر ہی اُمڈ کر آیا تھا۔ اگلی صبح جب وہ جاگی تو اسے پہلی خبر یہی ملی تھی کہ اماں صاحباں رات سوئی اور صبح اُٹھی ہی نہ۔

اور وہ بی بی جُتی جو شام ڈھلے حویلی میں کچے بھٹے دینے کو آئی تھی۔ تو اُس نے سوچا تھا کہ کھجور کے پتوں سے بنی چنگیر میں بھری چھلیوں کا رنگ اُس کے چہرے پر زرد لاٹیں چھوڑ رہا ہے لیکن یہ زردی بھٹوں سے اُٹھ کر دیگر عورتوں کے چہروں پر ابٹن کیوں نہیں مل رہی تھی۔ اگلی صبح یہ خبر ہر کہیں آگ لگا رہی تھی کہ رانڈ بی بی جُتی پیٹ سے تھی اپنی بیوگی کی بدنامی اور جوان بیٹوں کے خوف سے نیلا تھوتھا کھا مری۔ کیونکہ ملکوں کی حویلی میں جب بھٹے دے کر پلٹی تو پندرہ سولہ برس کے بڑے بیٹے نے کوئی سوال سامنے رکھ دیا تھا، جس کا جواب بس یہ نیلا تھوتھا ہی تھا۔ صنوبر نے سوچا تھا اماں صاحباں تو بوڑھی تھی شاید اندر کی بیماری موت بن چکی ہو جس سے وہ خود بھی ناواقف ہو لیکن بی بی جُتی تو بھر جوان تھی اور نیلے تھوتھے کا فیصلہ بھی واپسی پر ہوا تو یہ موت پہلے ہی کیوں چہرے پر کھل رہی تھی۔ شاید مرنے سے پہلے بھی ابٹن چڑھایا جاتا ہے۔ جیسے دلہن کو رخصتی سے پہلے اور دولہے کو دلہن کے ملاپ سے پہلے چڑھایا جاتا ہے۔ موت کے وصل کے لیے دولہے دلہن کو نکھارا جاتا ہے۔ کوئی

الوہی سا اُبٹن۔

امتیاز کے چہرے ہاتھ پیروں پر بھی زردی پُتی تھی لیکن اُن میں نیلی نسیں اور کالے حلقے نمایاں تھے۔ موت والی زردی تو جیسے کوئی سنگار ہو، سرسوں کے پھولوں سے کشید کیا ہوا۔ چہرے کے تمام کیل مہاسے تمام عیب چھپانے والا غازہ۔ امتیاز کے چہرے کو وہ دن میں کئی بار اس نظر سے پرکھتی تھی لیکن وہ خاص رنگ نہ ہوتا۔ لیکن زردی پچھلے دن کی نسبت بڑھتی ضرور چلی جاتی تھی کمزوری اور ضُعف کی زردی، موت والی زردی تو الوہی سی غیر مرئی میک اپ سا، جس کی مشاطہ شاید کسی حور یا فرشتے کی مرمریں انگلیاں ہوں۔

وہ گھر میں موجود ہر وہ چیز جو کوئی ضرب لگا سکتی اُسے چھپانے لگی۔

ڈنڈا کونڈی، مونگلی تھاپا، چھری کانٹا، حد یہ کہ بلیڈ تک چھپا دیتی بار بار ادوائن کی رسیاں شمار کرتی کوئی کم تو نہیں ہے۔

وہ پوری رات جاگتی کبھی اونگھ بھی آ جاتی تو ہڑ بڑا کر امتیاز کے سینے کا زیر و بم شمار کرتی اُس کے چہرے پر ابٹن رنگ نہ پا کر سکون کا سانس لیتی۔ دن بھر فلاسفر کے روپ میں بولتی رہتی کہ اُسے جینا چاہیے۔ آخر تو قابیل بھی جیا تھا۔ جینے میں مدد بھی دی گئی تھی۔ فطرت کی مدد۔

تو یہ محافظت کا سارا بار صرف اُسی کے لیے کیوں۔

بڑی بی بی جی خود کو بری طرح مصروف کر چکی تھیں۔

وہ اپنی مخروطی پیازی رنگی کیوٹیکس والی انگلیاں گھنے سیاہ بالوں پر پھیرتیں۔

”افتخار بہشتی مویا تو گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ وطنوں سے آئی شریکنیاں حیران رہ گئیں۔ پورا سو بسترا گھر سے نکلا ون ون کی کڑھائی والی چادریں اور رنگ رنگ کے مجنوں کھیس، ہزار بندے کے برتن اپنے گھر سے پورے ہوئے۔ کسی کے گھر سے ایک چمچ نہ آیا۔ شریکنیوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں یہی تو سڑاپا یہی تو حسد جو نظر بن کے لگا۔ کوئی بات نہیں ہم کمزور نہیں اللہ کے حکم سے سرتابی نہیں ہے۔ ہونی ہو گئی اب کچھ نہ ہونے دوں گی۔“

سننے والیاں خوشامد کی انتہا کر دیتیں۔ ایسے واقعات اور فرضی قصے، تعویز کالے جادو، دم درود کی چشم دید گواہ بن جاتیں جو اس خاندان پر جلن کی وجہ سے کیے گئے تھے۔

بڑی بی بی جی کا دل اور ضمیر دونوں ہلکے ہو جاتے۔

''مجھے تو پہلے ہی پتا تھا۔ سب جانتی تھی یہ جواب سارا دیکھ بھال گئی ہیں کلیجوں میں تو بھانبھر بل رہے ہیں۔ بس ''نظر'' حدیث شریف ہے کہ نظر تو پتھر پھاڑ دیتی ہے۔''

سلو میراثن دونوں ہاتھ جوڑتی۔

''نہ وڈھی ملکانی تیرے جیسا تو نہ سنا نہ دیکھا جوان بیٹے کا دکھ ایسے سہا جیسے گھر کا کتا مرا ہو۔ تیرا حوصلہ ملکانی۔ دنیا حیران پریشان روتی کرلاتی ہے پر ہماری ملکانی صاحب جی۔ ایسی تو پاکستان چھوڑ پورے ہندوستان میں کوئی نہ خورے کوئی امریکہ شریکہ میں اوّل وہ بھی کوئی نہیں۔ شینہہ بچے کا دکھ ایسے سہارا جیسے چیونٹی بھی نہ رینگی ہو۔ بی بی! تیرے جیسا جگ میں نہ کوئی ہور.....''

بی بی جی خوشامد میں چھپی طنز کو نظر انداز کرتیں۔

''ہاں نا سلو! میں بھی حوصلہ ہار دوں تو رعیت کو دلاسہ کون دے۔ وڈے ملک صاحب کو کون سنبھالے۔ بس ذرا غسل خانوں کی کمی محسوس ہوئی۔ اسی لیے یہ مستری لگائے ہیں۔ وہ بھی زناں خانے میں، مردانے میں تو پورے پانچ غسل خانے ہیں۔ فلش والے کموڈوں والے پروں پرار ہی تو نئے بنوائے تھے۔ ہر ایک کی الگ الگ کھوئیاں کھدوائی تھیں۔ دیکھنے والیوں کے ڈیلے چیرے گئے۔ وطنوں سے آئی شریکنیاں ہکا بکا۔''

صنوبر کو خیال آیا کہ چہلم سے پہلے گھر کو پینٹ بھی تو کروایا گیا تھا۔ شریکنیوں نے تو اور ساڑا کرنا تھا ہی۔ افتخار نے مر کر ہر ایک کے معمولاتِ زندگی یکسر تبدیل کر کے رکھ دیے تھے۔

شریکنیوں کی حیرت سے آنکھیں پھاڑنے والی اس موت نے تفاخر کا یہ موقع صرف بی بی جی کو ہی فراہم نہ کیا تھا بلکہ خود صنوبر کو بھی خود سے متعارف کروا گیا تھا۔ اس ایک شخص کی

موت سے زندگیوں میں طاری جمود کی کھال جیسے اُتر گئی ہو۔ پہلے بڑی بی بی جی نے اپنے مضبوط اعصاب اور زبردست قوتِ فیصلہ کے ذریعے زندگی کو رواں کیا۔ موت بھی کیسی بھرپور سرگرمی ایک شخص اپنی جگہ چھوڑ کر دوسروں کے لیے کتنی جگہیں بنا جاتا ہے۔

''نہ خدا کی کرنی سے کوئی مقابلہ ہے کیا۔''

ہر حادثے ہر المیے کو ایڑھ لگانے والا چابک۔

''ہم بے بس اور مجبور بندے کیا اس کی نافرمانی کے مرتکب ہو سکتے ہیں وہ جب صبر کا حکم دیتا ہے تو ہم بے کس و بے بس کیونکر حکم عدولی کر سکتے ہیں۔ سوگ کا حکم تین روز کے لیے ہے۔ تو چوتھا روز تو اس کی نافرمانی ہے۔ نقصان ہمارا ہوا ہے۔ ان ٹسوے بہانے والیوں کا نہیں۔ جو بچ رہا ہے اسے کیوں نہ سنبھالیں۔ نقصان پورا کرنے کی کوشش کیوں نہ کریں۔ کوئی نہ روئے میرے شہید بچے کو اُسے تکلیف ہوتی ہے وہ تو جنتوں میں ہنڈولے جھول رہا ہے اپنی حوروں کے ساتھ۔ وہ شہید تو اپنے ماں باپ کی شفاعت کا ذریعہ ہوگا۔ آخرت میں اور دنیا میں بھی اللہ اُس کا نقصان پورا کرے گا۔''

بی بی جی کے لیے نقصان پورا کرنا جیسے ایک خوشگوار ہدف بن گیا تھا۔

وہ اپنے کمرے میں پھولوں کی چنگیریں رکھوانے اور عطر پھلیل چھڑکنے لگیں۔ وہ سرِ شام غسل کر کے بہترین لباس اور خوشبوؤں میں رچی کمرے میں داخل ہوتیں۔ جہاں ملک صاحب بی بی سی کی آٹھ بجے والی خبریں سن کر اُن کے منتظر ہوتے۔ کیونکہ اُن کی زندگی کا مقصد اب جوڑی ملانا تھا۔ کھویا ہوا بیٹا دوبارہ حاصل کرنا تھا۔ کتنا پُرفعال اور خوشگوار مرحلہ جس نے پھر سے جوانی کی سمت جیسے لوٹا دیا ہو۔

گرمیوں کی راتیں صحن میں جب سفید براق بستر کی چادروں پر چاندنی اُتر آتی اور اوس میں بھیگتی ابرق کے ورق کی طرح ہر شے کو ڈھانپ لیتی ہر کالے گندے منظر کو چاندی کی ڈلی پگھلا کر قلعی پھیر دیتی تو بڑے ملک صاحب آسمان سے اُترتی چاندنی کی بارش میں

بھگتے ہوئے آسمان کو خالی خالی خشک آنکھوں سے گھورتے۔ جیسے چاہتے ہوں شبنم کے دو قطرے اُن کے اکڑے ہوئے خشک ڈیلوں میں کہیں سے ٹپک جائیں۔ تو آنکھیں پتھرانے سے بچ جائیں۔

اُن کی عمر بھر کی فعالیت، ہر ہر رات کی مصروفیت یکبارگی ختم۔ پتا نہیں شاماں والی ڈانگیں کہاں دفن تھیں۔ بندوق پستول امتیاز کے خوف سے بستروں والی پیٹی میں ڈال کر تالا چڑھا دیا گیا تھا۔

جیسے یہ تالا احساسِ شکست ہو۔ جیسے کوئی دعوتِ مبارزت دینے والا ہی نہ رہا ہو۔ وہ اُسی ناچیز سے ہار گئے جسے روز ہرانا اُن کا دلچسپ مشغلہ رہا۔ اب تلائی کے نیچے نہ ڈانگ تھی نہ لوڈ پستول نہ کارتوس بھری بندوق جیسے وہ دشمنوں سے صلح کر کے بے کار ہو گئے ہوں۔ عمر بھر کی مصروفیت جو فعال رکھتی یکبارگی چھن گئی ہو۔

رات کو بی بی سی کی خبریں سننے کے بعد وہ ریڈیو بند کرتے تیسری چارپائی پر گُھپ چُھپا چاندنی میں دانت نکوستے سایوں سے خوفزدہ خود کو چادر کے سفید کفن میں لپیٹے تھر تھر کانپتا۔ امتیاز خوف کی سیاہ غار میں دھنسا ہوتا۔ بڑے ملک صاحب جیسے اپنی شکست کے احساس پر کھسیانی بلی سی ناخن مارنے لگتے۔

''چھوٹے ملک صاحب بڑے ہو گئے ہیں۔ ساری زمینوں کی ملکیت جو مل گئی ہے۔ گھوڑی پال نمبرداری بڑے بیٹے جو ہو گئے ہیں۔ نمبردار صاحب ہو گئے ہیں۔ نمبردار صاحب اب اُٹھیں اور اپنی ذمہ داری نبھائیں۔ اب سنبھالیں زمینیں۔ اکٹھا کریں معاملہ۔ بلائیں پنچائتیں، نبٹائیں جھگڑے جھیڑے۔ اب کیوں روتے ہو کیوں مرتے ہو۔ خوش ہو جاؤ مار دیا تم نے اپنے مدمقابل کو۔''

طنز غصے میں چھید لگا دیتی۔

''تم سمجھتے ہو کہ دنیا تمھیں معاف کر دے گی۔ قدرت بھول جائے گی قدرت کبھی کچھ

نہیں بھولتی۔“
صنوبر کے دل کی دھڑکن کانوں سنائی دیتی۔
اب اس منطق کا جواز وہ کیا بنائے گی۔ وہ اُس کے ہر سوال، ہر شک، ہر واہمے کے جواب بنا بنا کر تھک گئی تھی۔ لیکن بڑے ملک صاحب کی دلیلوں کا جوابی فلسفہ بڑی بی بی جی غنودگی کے عالم میں چلاتیں۔
”کیوں معصوم بچے کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ پتا تو ہے کہ دشمنوں نے اس بے چارے کے ہاتھوں اپنا وار کروایا ہے۔ اس معصوم کو ورغلایا اور ہم سے بدلہ لیا۔ اب چپ کر کے سو جائیں۔ مستے کو کچھ نہ پوچھیں۔ جو اسے پٹیاں پڑھاتا رہا کہ تو بڑا بیٹا بن جا۔“ وہ دونوں نیند کی گولیاں کھا کر لمبے لمبے خراٹے لینے لگتے۔
صنوبر کو لگتا بڑی بی بی جی زبردست اعصاب کی مالک ہیں۔ وہ کسی بھی حادثے یا سانحے میں سے کوئی مثبت فعالیت ضرور نکال لیتی ہیں۔ کسی بھی ایسے کی راکھ میں سے کوئی چنگاری ضرور ڈھونڈ لیتی ہیں۔ اُنھیں امتیاز کے ٹیڑھے سوالوں کا جواب دینا چاہیے لیکن وہ تو اُس کے واہمے پر اوب جاتیں۔
”جا دفع ہو پرے نرا پاگل کر دیئے سمجھا اسے۔“
صنوبر ان کے خراٹوں کا انتظار کرتی اور جب خراٹے لگاتار اور پکے ہو جاتے تو تاریکی میں ڈوبے صحن میں چوروں کی طرح بے پیر امتیاز کی چارپائی کے قریب آتی۔ سولی کے تختے پر ٹھنکے شخص کی سی اذیت اس کی سرخ و سفید رنگت کو نیلاہٹ میں تبدیل کر چکی ہوتی۔ آنکھوں کو چڑھی لال سرخ مرچیں دھونی دھخا چڑھی ہوتیں۔ چھ ماہ گزر گئے تھے لیکن آنکھوں کا نخونا ابھی کم نہ ہوا تھا۔ جیسے افتخار کا سارا خون انہی آنکھوں نے پیا ہو۔ وہ گھٹنوں کو پیٹ میں دھنسائے پیرادوائن میں اڑ ستارسیاں ٹوٹتیں پلکیں آنسوؤں سے بوجھل جھڑتیں۔
وہ چپکے سے جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھتی۔

وہ اس کا ہاتھ جھٹک دیتا۔ اکڑے ہوئے حلق سے رندھی آواز نکلتی۔

''کیا تمھیں یاد نہیں، امی جی ہر وقت کہتی تھیں یہ غنڈہ معصوم بچے کو مار ڈالے گا، گولی لگا اسے جینے نہ دے گا....

یہ دعائیں نہیں مانگتی تھیں کہ کہیں سے کوئی آوارہ گولی آئے اور اس کے دل میں سیدھی لگے....

ابا جی روز شام کو جب مجھے مربعوں کی سیر کو لے کر جاتے تو کہتے نہیں تھے۔ اس بدمعاش سے بچ کر رہنا یہ کبھی بھی کوئی بھی وار تم پر کر سکتا ہے۔

میں نے تو اپنا دفاع کیا۔ سب کی خواہشات کی تکمیل کے لیے قربانی دی۔ اب سارے مقتول کے لواحقین بن گئے اور میں قاتل۔ تم دیکھنا قیامت کے روز تمہارے علاوہ میرے ساتھ یہ کٹہرے میں کھڑے ہوں گے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ انھیں برا لگے گا تو میں یہ کبھی نہ کرتا۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ ابا جی سے مشورہ کرلوں پھر سوچا شاید میں یہ کروں ہی نا۔ تو ویسے ہی اُن کی رائے میرے بارے میں خراب ہو جائے گی۔ اگر مجھے پتا ہوتا۔

''یہ تقدیر کا کھیل ہے میرے بھائی۔ جس میں بال برابر جھول ہوتا ضرور ہے۔ دِکھ بھی جاتا ہے۔ لیکن اس جھول کو رکاوٹ بنانے کی جس فعالیت کی ضرورت ہوتی ہے ہر ایک کے لیے وہ پیدا نہیں ہو سکتی سب ابہام، غیر واضح، دھندلکا۔ اس برق رفتار فعالیت کا حاصل ہو پانا یا نہ ہونا ہی اصل میں مقدر کہلاتا ہے۔

حادثہ اسی لیے رونما ہوتا ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہوتا۔ حادثہ کسی نہ کسی غلط فہمی کی بنیاد پر ہی تو رونما ہوتا ہے۔ اگر صورتحال صاف ہو جائے فضا دکھنے لگے۔ تو کوئی بھی حادثہ کبھی بھی وقوع پذیر نہ ہو۔

دیکھو نا تم کمرے میں داخل ہوئے تو وہ نیچے اپنے پیروں کو دیکھ رہا تھا۔ شاید یہی دیکھ رہا ہو کہ آج یہ اتنے زرد کیوں ہو رہے ہیں اگر وہ سامنے دیکھ رہا ہوتا تو وہ دلیر ہر حال میں

مقابلہ کرتا اور بچ نکلتا۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ اُس نے اے ایس آئی کا جو انٹرویو دیا ہوا تھا، جس کا اپائنٹمنٹ لیٹر مرنے کے تین دن بعد آیا اور جوڑا لگانے میں تین روز پڑا رہا۔ اگر وہ تین روز پہلے آجاتا تو وہ یہاں سے نکل جاتا اور یہ حادثہ نہ ہوتا گھڑی ٹل جاتی۔ لیکن کسی اگر مگر کی کوئی گنجائش نہ چھوڑی گئی تھی۔''

امتیاز کی آنکھوں کے نیلے حلقوں میں گھور رات کی ساری تاریکیاں بھر جاتیں۔ خوبصورت چہرے پر نوکیلی ہڈیاں جیسے جلد پھاڑ کر باہر نکل جائیں گی۔ جیسے قبر میں دفن مردہ کئی روز بعد بجیوؤں نے کھینچ باہر نکالا ہو۔

صنوبر گھبرا کر دیکھتی موت والا رنگ نہیں ابھی نہیں۔

''تم تو پورے انتظام کے آخری مہرے تھے۔ قدرت کو اپنی کرنی پوری کروانے والے مہرے۔ جب تم سامنے بندوق نکال کر کھڑے تھے تو میں بھی تو وہیں تھی روکنے کو جنبش بھی نہ کر سکی۔ حلق سے آواز تک نہ نکال سکی۔ میں نے سوچا بھی تھا کہ چارپائی گھسیٹ کر اُس کے اوپر کر دوں۔ اگر میں یہ کر دیتی تو وہ دوسری گولی سے بچ جاتا۔ اگر اس روز کوئی تیز رفتار گاڑی مل جاتی۔ تو پورا خون نچڑنے سے پہلے وہ ہسپتال پہنچ جاتا۔

ٹریکٹر کے دھچکوں سے سارا خون ٹرالی میں نہ نچڑتا اگر ساہیوال جانے کی بجائے سیدھا ملتان چلے جاتے تو.....اگر.....اگر.....یہ.....یہ.....وہ.....وہ.....''

چار کنال کا صحن چاندنی سے اَٹا اَٹ ہوتا۔ کورے گھڑوں پر جمے ریت کے ذرات شعاعیں چھوڑتے درختوں کے پتوں کے سائے کترن کترن زمین پر بچھے ہوتے۔ بستروں کی سفید براق چادریں اوس سے بھیگتی۔ جیسے عطرِ کافور سے کفن بھیگتے ہوں۔

امتیاز کے پیرا دوائن میں دھنستے۔ حلقوں میں دفن گہری آنکھوں میں اذیت سولی پر لٹکی ہوتی۔ چاندنی سیاہ حلقوں کو مزید نمایاں کر دیتی۔

پتا نہیں اُس کا دماغ کیا بن رہا ہوتا۔ دماغ سب سے بڑا دوست بھی سب سے بڑا

دشمن بھی۔ دوستی پر آئے تو ایجادات، فلسفوں، علوم وفنون کی سبیلیں بہا دے دشمنی پر آئے تو جیلیں اور دماغی ہسپتال بھر دے۔ کرنی پر آئے تو دنیا کو لڑا کر مار ڈالے امن پر رہے تو لاکھوں جانیں بچالے۔ کیا معلوم کس وقت کیا تانا بانا بن دے کیا نقشہ لیک دے۔ کیا ان ہونی کر گزرے۔

وہ دماغ کی اسی دشمنی کے وقت کا سراغ لگانے کو، اٹل گھڑی میں موجود جھول پکڑنے کو پوری پوری رات جاگتی۔

پورے گھر میں سے اوٹے میں سے حبس بھرے طویل وعریض انبار خانے میں سے ہر اس چیز کو ٹھکانے لگاتی جس سے امتیاز پر آنے والی ہونی کا لاسہ بننے کی صلاحیت ہوتی۔ جسے موت اپنی کرنی کے لیے استعمال کر سکتی تھی۔

اسے ٹیوب ویل کے کھاڈے میں بھرے پانی سے بھی خوف آتا کہ کہیں خود کو اس میں ڈبو ہی نہ لے۔ پوری رات پہرے پر کھڑی وہ آنکھ بھی نہ جھپکتی شاید آنکھ کا یہی جھپکنا ہونی کے جھول کو اُس سے اوجھل کر دے اور ہونی کو ہونے کا موقع مل جائے۔ وہ اسی موقع کی تاک میں چوبیسوں گھنٹے ہائی الرٹ سپاہی کی طرح چوکنا رہتی کہ پلک جھپکنا بھی کہیں موقع میں تبدیل نہ ہو جائے۔ وہ رت جگوں اور شدید بیداری کے عجب عذاب میں مبتلا امتیاز کے چہرے پر موت کا رنگ کھوجتی رہتی۔ اب تو وہ پوری جائیداد کا اکلوتا وارث ہے۔ نہ پڑھائی کی فکر نہ نوکری کی پریشانی نہ افتخار کی سازشوں اور منصوبہ بندیوں کا دھڑکا۔ نہ قانون نہ عدالت اس قدر رعایتوں کے باوجود فائدہ ہی نہ اُٹھا سکا۔ جس لکڑی کے گھر میں رہتا ہے اُسی کا دیمک کیڑا بن گیا۔

▪▪▪▪

چنی افسوس کرنے کو آئی تو کس قدر سیانی بیانی جیسے اُسے کھنڈروں میں لیڈی گائیڈ کا

عہدہ محکمے کی طرف سے نہ دیا گیا ہو بلکہ ان کھنڈروں کی ملکیت کا وراثت نامہ بھی اُس کے نام کر دیا گیا ہو۔ اُس کا ٹھگنا قد بڑھ گیا تھا شاید کہ اکڑ کر چلنے کی وجہ سے وہ سرو قد ہو گئی تھی۔ اس کا پچکا ہوا سینہ ابھر آیا تھا۔ شاید پھل فروٹ کھاد خوراک سے کھجور کی گٹھلیاں پنپ آئی تھیں۔ پورا وجود بور پر آیا مہکتا صریح تھا اور خوشبودار پھولوں اور رسیلے پھلوں سے بھر رہا تھا لیموں کا سرسبز پودا۔ چندھی گڈوں بھری آنکھیں کجراری تھیں۔ پھینی ناک سونے کی نتھلی سے سج گئی تھی۔ چپٹے ذرا ذرا نتھنے جیسے کنیر کی پنکھڑیاں۔ کالی بھجنگ جلد تلے تر و تازہ خون کا چشمہ موجزن تھا۔ جس نے سنولاہٹ میں گلابیت بھر دی تھی۔ جس کے نمک کی کشش دل کو کھینچتی تھی کہ بالی بھی پھیکی لگتی۔ ڈھنڈروں میں بھکرے کی کنڈیاری سی ہر ایک کے پیروں تلے ٹوٹنے چبھنے والی چنی اپنا رنگ روپ طور اطوار چال ڈھال سب بدل گئی تھی۔ کتنی شکر گزار ہوتی ہو گی وہ ملنگوں کی اور اس آریا کی جو اُسے شناخت دے کر کہیں چھپ گیا۔ وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر آئی تھی افسوس کرنے اور نیلی وردی میں تھی جیسے وڈا تھانیدار صاحب ہو اور کیسی گہری گہری باتیں سیکھ کر آئی تھی۔

''چھوٹی بی بی کیوں دکھی ہے تو۔ ہر شے میں ہر انسان میں ہر خاندان میں ادل بدل ہوتا رہتا ہے۔ کوئی دوسری شے کوئی دوسرا انسان کوئی دوسرا خاندان قبیلہ پہلے کو ملیامیٹ کر کے اُس کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ تو قدرت کا وتیرہ ہے اس سے مقابلہ تھوڑی ہے۔ پہلے کی ڈھی بنیادوں پر نئی کھڑی ہوتی ہیں۔ پہلے کی راکھ میں سے نئی چنگاری جلتی ہے۔ تیرے لیے بھی چنگاری جلے گی۔ جیسے میرے لیے بھڑکی ہے۔ کون جانتا تھا ڈھنڈاروں کی مسکین چنی آج پوری دنیا میں مشہور ہو جائے گی اور چنی سے چاند بی بی کہلائے گی۔ جس کے لیے ایک ہزار روپیہ ڈنٹ پوری بستی نے مل کر بھرا تھا۔ اُس پر لاکھوں کا مینہ برس جائے گا۔''

''نہ بی بی نہ رو، یہی تقدیر کا فیصلہ ہے۔ یہی دنیا کی تقدیر ہے کوئی آریا بنتا ہے۔ کوئی دراوڑ، کوئی فاتح، کوئی مفتوح، کوئی قاتل، کوئی مقتول۔ اس کے علاوہ تو کوئی حالت ہی نہیں

ہے۔یہی دو حالتیں رہی ہیں تاریخ کی۔"

چنی جیسے کسی غیر ملکی وفد کو ڈھنڈاروں کی کہانی سنا رہی ہو۔معروف کہانی، جھوٹی سچی کہانی لیکن تاریخ کی تقدیر کی کہانی، فطرت کے سچ کی کہانی، دراوڑوں اور آریاؤں کی کہانی۔

بڑی بی بی جی کے کان میں بھنک پڑی۔

"اے یہ گشتی پوری دنیا کی یدھی ہوئی تو ہمیں سبق پڑھا رہی ہے۔نکالو اسے باہر، لے آئے اپنے ٹیلی ویژن والوں کو، اخبار والوں کو کہاں کی دانا بینا آ گئی ہمیں مت دینے والی جس کی تصویریں پوری دنیا میں چھپ گئیں جو عدالت کچہری چڑھتی رہی۔اس کا تو ان پانی بھی حرام ہے۔"

چنی چھپاکا مار کر اُٹھی اور کالی چادر کا جھانولا بڑی بی بی جی کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔کالی چادر پر جڑے بے شمار شیشوں میں کئی صورتیں منعکس ہوئیں۔

"نہ وڈی ملکانی ناراض نہ ہو۔جو دنیا کا سچ ہے میں تو وہی بتا رہی ہوں تجھے نہیں پسند تو چلی جاتی ہوں۔"

"نہ توں عیسیٰ تے موسیٰ ایں تجھے زیادہ عقلیں ہیں۔ہم پڑھے لکھے دنیا جہان کی پنچائتیں نبیڑنے والے اب تجھ سے مت لیں گے۔"

"نکالو اسے باہر دھکے مار کر لے آئے اپنے رسالوں والوں کو ٹیلی ویژن والوں کو۔ریڈیو والوں کو...."

"سچ زہر ہے پر تریاق بھی یہی ہے بی بی۔"

چنی نے جھٹکا مار کر خادماؤں کی گرفت چھڑائی اور اپنے قد سے دو انچ اونچی ہو کر بیرونی دروازے کی سمت بڑھی۔

جیسے اسی حویلی کی راکھ سے کوئی چنگاری سی اُڑی ہو اور سیدھی بڑی بی بی جی کے گھنے بالوں میں آن اٹکی ہو۔

اس سارے عرصے میں صنوبر بار بار منہ کھولتی اور ہونٹوں کو منع کرنے والے سبھی لفظوں کی شکل دیتی رہی لیکن کوئی ایک بھی لبوں سے ادا نہ ہو سکا۔ وہ جو امتیاز کے سامنے فلسفوں باریک نکتے اور علم و دانش کے دریا بہا دیتی وہ آج بھی بڑی بی بی جی اور بڑے ملک صاحب کے روبرو گنگ ہو جاتی۔ روئیں پورے بدن پر کھڑے تھے اور تالو کے اندر کانٹے بھر گئے تھے۔ آواز کہیں دفن ہو گئی تھی اور زبان پر ارتعاش تھا۔ اور یہ چنی جو اسی کے سن و سال کی تھی کس دلیری اور اعتماد سے دروازے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ جیسے حویلی کی سلطنت کو لتاڑ کر سفید گھوڑے پر سوار سنگین لہراتا ہوا کوئی آ رہا۔ صنوبر کو پچھاڑتی چلی گئی۔

"نہ وڈی ملکانی رکھ اپنا ہڑپا اپنے تئیں میرا ہڑپا میرے لیے بہت جیسے کسی زوال کا ڈر نہیں، تیرا ہڑپا تو ابھی نجانے کتنی بار اجڑنا اور بسنا ہے۔

اب تو بڑی بی بی جی کے منہ سے نکلتی گالیاں فشار خون کی شدت سے عجب بڑبڑاہٹ میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ آواز رونی ہو گئی تھی اور چہرے کی حرکات و سکنات اور لفظوں کی ہیئت بدل گئی تھی۔ جیسے موکھی کہ امتیاز۔

صنوبر کو دکھ ہوا۔ اس نے تو بڑی بی بی جی کو ہمیشہ مضبوط پُر اعتماد اور پورے کھرج اور صاف حلق کے ساتھ دوسروں کی واہی تباہی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ حقیر بے حقیقت چنی انھیں مات دے گئی تھی۔ صنوبر کے اندر کہیں کوئی بنیاد سی ڈھ گئی۔ ایک ہی شخص تو زوال سے مبرا تھا کیا وہ بھی۔ اسے تو پھولوں پتوں فصلوں جڑی بوٹیوں اردگرد گھومتی خادماؤں کا زوال بھی رُلا دیتا تھا۔ یہ تو پھر بڑی بی بی جی تھیں کبھی نہ جھکنے کبھی نہ ٹوٹنے والی مضبوط اور گہری بنیاد۔ وہ کیسے لرزا سکتی ہیں۔ وہ بھی حقیر چنی کے مقابل۔

جب بالی کنجری افسوس کرنے آئی تھی۔ تو اُس نے بھی عجب نکتہ نکالا تھا اور دونوں ہاتھوں سے بے تحاشا رانیں کوٹ ڈالی تھیں۔

"ہائے نجانے کس کرنی کی پکڑ آئی۔ سچ ہے حق سے بھی ڈرنا حق سے بھی ڈر۔ ناحق

کی پکڑ آئی۔ اس حویلی سے تو کبھی چڑی کاں کو بھی تکلیف نہ پہنچی۔ ساروں کے جھگڑے جھیڑے نبیڑنے والا ملک۔ وڈا ملک سب کے سر پر ہاتھ دھرنے والا، ہما شما کی سننے والا اور سن کے کبھی نہ پیچھے ہٹنے والا۔ کی جاناں کس بھوری کی نظر کھا گئی۔"

"سارے مربعے زمینیں نوکر چاکر سارے عہدے اختیار دھرے رہ گئے ہائے! کرنی یہ کرنی کسی کرنی کی پکڑ کو ہی تو آئی۔"

بڑی بی بی جی نے گھور کے دیکھا ضرور لیکن بالی کا اپنا ایک احترام تھا۔ جو اس کے پیشے کی دین تھا۔

....

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ لیکن گاؤں کی فضاؤں میں ابھی بھی بین گھلے تھے۔ رعیت نے اتنے بین الاپے تھے کہ ان کی بازگشت ابھی بھی امتیاز کی سماعتوں میں گونجتی تھی۔ قہقہہ لگانا، ہنسنا، بچوں کا کھیلنا، ایک دوسرے سے مذاق کرنا، خوش ہونا، خوشی منانا جیسے گاؤں کی خلقت بھول ہی گئی تھی۔ یا پھر احتراماً بھولی ہوئی تھی کہ خوف کے مارے یہ جبلی کیفیات سنٹھ ہوگئی تھیں۔ یا پھر اس حویلی میں داخل ہوتے وقت کہیں اندر ہی گھونٹ لیتی تھیں۔ ہر عورت بات کرتے کرتے بینوں میں ڈھل جاتی۔ افتخار کی حسین جوانی کا روگ جیسے ہر ایک کے سینے پر چڑھ بیٹھا تھا۔ اس کے قتل کی رات جو غضب ناک آندھیاں پوری فضاؤں کو لپٹ گئی تھیں۔ وہ اب ملال کی گرد میں تبدیل ہو کر ٹھہر گئی تھیں۔

یہ افتخار گولی جوگا، گولی کھا کر بھی نہ مرا تھا.... اس گھر سے اس گاؤں سے خود امتیاز سے کسی آسیب کی طرح چمٹ گیا تھا۔

صنوبر کو لگتا چودھویں کے چاند میں سے اُس کی حسین صورت مسکراتی ہے۔ تنہا ویران راتوں میں انتہائی تیز خوشبو اس کے اردگرد پھیل جاتی ہے جیسے معطر ہواؤں میں وہ اُڑا پھر رہا ہو۔

چاندنی کے حوض میں امتیاز کو ماہی بے آب کی طرح تڑپتے دیکھتا اور کہتا ہو:
''کیا مار کر بھی سکون نہیں ملا۔'' مقتول سب سے زیادہ قاتل کے اندر جیتا ہے۔ اُس کے اپنے تو بھول جاتے ہیں لیکن قاتل کبھی نہیں بھول پاتا۔ اُس کی ساری عمر مقتول کے آسیب میں بسر ہوتی ہے۔ اس کی نسلیں بھی اس آسیب سے چھٹکارہ نہیں پاسکتیں۔
امتیاز کی باچھوں کے کناروں لعاب بہتا جبڑا ٹیڑھا ہوتا اور گدوں بھری آنکھیں ملگجے آنسوؤں سے ابلتیں۔
''میرا قصور نہیں یہ قدرت ہے جس نے زندگی قہر بنا دی ہے مجھ پر۔ دنیا بھر کی نعمتیں مجھ پر یوں نازل کیں جیسے عذاب نازل ہوتا ہے۔''
امتیاز کے حصے کا عذاب کہیں انجانے سرچشموں سے نازل ہو رہا ہوتا۔
جب اُسے وہم پڑا تھا کہ اس کے بدن پر سر نہیں لگا ہوا تو وہ انسانی وجود کی تخلیق اور احسن تکمیل پر سیر حاصل گفتگو کرنے لگی۔ جس کی روشنی میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ انسان کا ارتقا نہیں ہوا وہ خدا کی احسنِ تقویم تخلیق ہے۔ اُس نے یہ نکتہ کہیں سے پڑھا تھا کہ اس کے خیال کی طلسماتی فضاؤں نے اُسے از خود سجھایا تھا۔
''سر ہوتا ہے چھوٹا کہ بڑا سر تو ملی کا بھی تھا۔'' جب اُسے وہم پڑا کہ وہ خود خدا ہے تب وہ خدا کائنات اور بندے کے فلسفے پر روشنی ڈالنے لگی۔ یہ فلسفہ بھی اُس نے فطرت سے ہی اخذ کیا ہوگا۔ ''کائنات موجود ہے۔ خدا غائب، بندہ اس کائنات میں سرائیت خدا کی تلاش میں ہے۔ یعنی اپنی تلاش میں ہے تو میرے بھائی تم اس وقت خود کی تلاش میں ہو۔ یہ واہمہ نہیں ہے یہ سچ ہے۔ تم ہو تو مطلب خدا ہے۔ کائنات ہے تو مطلب خدا ہے۔'' کئی مہینے کئی سال دانش و فلسفے کے باریک نازک نکتوں اور دلیلوں سے ہر واہمے کا شافی جواب دینے کے بعد اس پر کھلا تھا کہ قدرت بعض دماغ دانستہ ایسے تخلیق کرتی ہے جو کسی نکتے یا دلیل سے بہل نہیں سکتے ہیں۔ یہ متجاوز دماغ کسی ڈاکٹر، کسی عامل، کسی پیر فقیر کی دسترس سے نکل جاتا ہے۔

بظاہر نہ اپاہج نہ فاتر العقل، نہ دیوانہ، نہ کم عقل، نہ پاگل۔ انتہائی گہری، ہلکی اور باریک نکتے مگر سبھی تیز ہوئے۔ سکون چھین لینے والے اپنے ہی دماغ کے پیچھے خود کو ہی ڈسنے والے خود اپنا دشمن دماغ۔ یہ کیسا مرض ہے۔ جو مرض نہیں ہے لیکن غم والم، دکھ، بچھڑاوا، آنسو، آہیں، بے سکونی، پراگندگی، بے خوابی کا مرکب کوئی عجب غول بیابانی ہے۔

اس سانپ کی طرح جو خود کو آپ ہی کھا جاتا ہے۔ اپنی ہی دم سے خود کو نگلنا شروع کرتا ہے اور نگلتے نگلتے دم اور سر برابر آجاتے ہیں۔

شاید امتیاز کی دنیا کو سب سمجھ نہیں پا رہے۔ اگر سمجھ لیں تو امتیاز غلط نہ لگے۔ شیزوفرینیا بیماری نہیں اک الگ دنیا ہے، جو ہماری دنیا سے بہت مختلف ہے۔ اسی لیے عجیب لگتی ہے تو کیا اسے اسی خیالی دنیا میں جینے کا حق نہیں ہے۔ جس طرح ہیجڑوں کو اپاہجوں کو جینے کا قانونی حق ہے اسی طرح شیزوفرینیا کے دماغ کو بھی اپنی دنیا میں جینے کا حق ہونا چاہیے۔ جو کبھی اس قدر دانش افروز باتیں کرتا ایسے دقیق نکتے نکالتا کہ سننے والا اُس کی عقل مندی کے سامنے خود کو احمق تصور کرتا۔ پھر یہ ساری عقلمندانہ باتیں گڈمڈ ہو جاتیں۔ سننے والا اس دانش کے سامنے بے بس۔

اتنے مہنگے کپڑے بوٹ جو کبھی پہنے نہ گئے۔ قیمتی خوشبوئیں آفٹر شیو لوشن، جو کبھی استعمال نہ ہوئے۔ اعلیٰ کوالٹی کے ٹوتھ پیسٹ لیکن منہ سے ایسی بو چھٹتی جیسے بلی کے منہ سے چھٹتی تھی۔ شیمپو، کریموں سے بھرا ہوا ڈریسنگ ٹیبل جس میں اپنی شبیہ دیکھنے کو کبھی اختیار سامنے کھڑا ہوتا تھا۔ سیاہ چمکیلے بال میل سے اٹے جھڑنے لگے کبھی کنگھا نہ کرتا۔

تیتر، بٹیر، دیسی مرغ، نوالہ حلق سے نہ اُتارا جاتا۔ یہی دنیا ہے اُس کی۔ جو اُس کے دماغ نے گھڑی ہے۔ تو پھر کسی کو کیوں اعتراض۔ اپنی دنیا کے مطابق بنانے کو اُسے بیمار سمجھنا۔ جبکہ خود اپنی دنیا میں وہ درست ہے۔

کبھی کبھی صنوبر کو ایک سفاکانہ سوچ جکڑ لیتی۔

جو خود سے نہیں جیتا اُسے کیونکر جیتا رکھا جا سکتا ہے۔ جو خود کو خود ہی کھا رہا ہے اُسے کس سے بچایا جا سکتا ہے۔

سوہر کو ملی یاد آیا۔ جو انہی سردیوں کی کسی بارش میں بھیگتا ٹھٹھرتا مر گیا تھا۔ اس کی بوسیدہ جھلی جگہ جگہ سے پھٹ گئی تھی اور اب اُس کے وجود کی مٹھ کو اپنی پنڈ میں باندھنے سے ڈھیر ہو گئی تھی۔ تھا تو وہ بھی اتنا ہی غلیظ، بدبودار، لیکن دکھی ہرگز نہیں غم نے اُس کی نہاد کو نہ کھایا تھا۔ بھوک اور موسموں کے شدائد کھا گئے تھے۔

لیکن ملک امتیاز کی روح کو تو یہ اچھی خوراکیں خدمت گزاریاں، علاج خوشبوئیں مل کر کھا رہی تھیں۔

پتا نہیں روح مر رہی تھی کہ خود سے تجاوز کر رہی تھی۔ کیا وہ مابعد الطبیعات میں ہے جہاں ہر شے کی حقیقت ایک ہو جاتی ہے۔

میں ملحد ہوں کہ مشرک۔

انسان ہوں کہ بندر۔

افتخار ہوں کہ امتیاز رب ہوں کہ بندہ

آخر کس کرنی کی پکڑ ہے یہ

المیہ یہ ہوا تھا کہ موکھی کا دماغ ایک تہائی بھی نہ بنا تھا جبکہ امتیاز کا پورے سے زیادہ بنا دیا گیا۔

نجانے کس کس کی روزی لگی تھی۔

پلیٹیں لکھنے والے تکیے میں سینے اور گھول کر پلانے کے تعویذ دینے والے، پھونک جھاڑ کرنے والوں کا خیال تھا اُس پر غول بیابانی کا سایہ ہے۔ یہ جنات اور چڑیلیں ہی تو تھے جنھوں نے اس معصوم کے رواھاں کی پھلیوں سے نازک ہاتھوں میں بندوق پکڑا دی تھی۔ جس کی لچکیلی انگلیاں تو پانی کا گلاس تھامتے ہوئے بھی لرزتی تھیں۔ پانی بھی نوکرانیاں

منہ کو لگاتیں تو وہ بمشکل دن بھر میں ایک ادھ گھونٹ بھرتا۔

اس روز کسی مزارعی کا بچہ دودھ کے لیے رو رہا تھا تو اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر کر کسی کے پیر تلے چتھا گیا تھا۔ تو وہ اس مسلی ہوئی بے پر کے بوٹ کی لاش سامنے رکھ کر پہروں روتا رہا تھا۔ کہتا تھا تمہارا مقدر کتنا برا لکھا تھا لکھنے والے نے۔ وہ جو اتنے چھوٹے دل کا کہ کوا مرغی کا بچہ اُٹھالے جائے تو دکھ سے اُس کے چہرے پر مردنی چھا جائے۔ جس کے منہ سے الفاظ نکلتے ہوئے بھی تھرتھراتے تھے۔ جو مدتوں سے پورا سویا نہ تھا پورا کھایا نہ تھا۔ اس ہڈیوں کے ڈھانچے میں اتنی طاقت کہاں سے آ گئی کہ وہ ایک انسان کو مار ڈالے وہ بھی سگے بھائی کو۔ یہ سب جنات، غولِ بیابانی کی کارستانی۔ تبھی تو ہر وقت ایسی آوازیں اُسے سنائی دیتیں جو دوسرا کوئی نہ سن سکتا تھا۔ ایسی شکلیں دکھائی دیتیں جو دوسرا کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ جنھیں دیکھ کر اور سن کر وہ لرزتا، ہاتھ کانپتے وہ ایسا پکا نشانہ کیسے لے سکتا تھا۔ تو ظاہر ہے کہ یہ ہیں غول بیابانی۔ لیکن صنوبر کو یقین تھا کہ یہ زرد فام موت کی طاقت تھی۔ جو اُس سے وہ کروا رہی تھی جو شاید وہ کسی کیڑے مکوڑے کے ساتھ بھی نہ کر سکتا۔ یہ موت تھی جو اُس لرزتے کانپتے وجود میں پکا نشانچی بن بیٹھی تھی کہ عزرائیل خود گھس بیٹھا تھا۔

اگر صنوبر سر شام موت والا زہر افتخار کے چہرے پر نہ دیکھتی تو اس جاہلانہ سوچ کو کبھی دماغ میں نہ آنے دیتی۔

چہروں پر لکھی موت ڈھونڈتے ڈھونڈتے اب وہ خود سے بھی ڈرنے لگی تھی موت کی پرچھائیں امتیاز کے چہرے پر بھی کبھی کبھی دکھائی دے جاتی۔ یہ موت بھی بڑی شریر۔ لکن مٹی کا کھیل کھیلتی ہے جیسے آواز دیتی ہو۔

یہاں چھپی ہوں پکڑ لو۔ ''آجاؤ سہیلیو کھیلن داویل۔'' لیکن پکڑی نہیں جاتی چھلاوہ کہیں کی۔

■■■■

مُنشی مستا

وہ جو دن رات جاگتی تھی اسی خلا کو اسی جھول کو پکڑنے کے لیے ۔ یہ جھول جو ہر حادثے کے بیچ حائل ہونے کی صلاحیت ضرور رکھتا ہے۔ اگر بروقت گرفت میں آ سکے تو۔ اُس شام وہ بیٹھے بیٹھے سوگئی۔ پتا نہیں کتنی دیر۔ پچھلے حادثے کے جھول کو پکڑنے کی ناکامی کے احساس نے اس سے نیند چھین لی تھی جو بچی تھی اُسے وہ اچک پھینکتی تھی۔ پتھر آنکھیں بڑبڑ کھولے امتیاز پر سے پلک بھی نہ جھپکتی تھی۔ اُس روز سرِشام وہ کیوں سوگئی کرسی پر بیٹھے بیٹھے یکبارگی سوگئی.... لیکن چند ثانیوں میں ہی وہ ہڑبڑا کر جاگی اور اس نے سوچا یہ ناوقت نیند کسی کی شرارت ہے۔ جیسے اُسے ڈھینگا دکھاتی ہو۔ ''اب پکڑو میرا جھول۔'' وہ ڈرگئی ہار کے احساس نے اُسے گھیر لیا۔ اُسے لگا وہ خلا وہ جھول اُس کی نگاہوں سے اوجھل کرنے کو نیند اس پر غالب آئی۔ اُس نے فاطمی کو پوری طاقت لگا کر پکارا۔

لیکن آواز حلق میں ہی گھگیا گئی۔

عالی اندر آئی تھی۔

دروازہ بند کیوں کیا ہے۔

''نکی بی بی جی منشی مستان نکے ملک جی کے پاس بیٹھا ہے۔ پردہ ہے باہر نہ آئیں آپ۔''

فاطی کدھر ہے۔

''نکی بی بی جی! وہ پانی دینے گئی ہے نکے ملک جی نے مانگا تھا۔''

''بڑے ملک صاحب آ گئے ہیں واپس۔''

''نہیں نکی بی بی وہ تو شاید رات ساہیوال ہی رہیں گے۔ دونوکر ساتھ لے گئے تھے ساہیوال والی کوٹھی کی صفائی کروانے کو۔''

وہ ڈھ گئی تھی۔ شاید وہ پھر خطا کر بیٹھی تھی۔ وہ کیوں نہیں کہہ رہی منشی مستے کو باہر دفع کرو۔ کس نے آنے دیا اُسے۔ وہ تو کبھی کسی کو بھی اس سے ملنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ آج وہ منشی مستے کے باہر نکلنے کا انتظار کیوں کر رہی تھی۔ کیا وہ موت کو کھل کھیلنے کی اجازت دے رہی تھی وہ جانتے ہوئے انجان بن گئی تھی۔ برس بھر کے شدید مقابلے کے بعد وہ پسپا ہو گئی ہے کیا۔

''جانے دو اب اسے سکون سے اپنی دنیا کی سمت سفر کرنے دو۔ وہ جو رختِ سفر باندھ چکا ہے تو اب یہ کھلنے والا نہیں۔''

اگر کھلنے والا ہوتا تو اُس کی سال بھر کی مشقتیں اور ریاضتیں اُسی کے منہ پر نہ دے ماری جاتیں۔

باہر شور مچ چکا تھا۔

بڑی بی بی چیخ چلا رہی تھیں۔

وہ لہو اُگل رہا تھا۔

صنوبر دور کھڑی تماشائی سی چپ تھی۔ جیسے کہتی ہو ''میں تجھ سے ہار گئی۔ اے موت اب تو اپنی کارروائی اچھے طریقے سے تمام کر لے۔''

بڑی بی بی جی اور ڈھیڑوں نوکرانیاں روتے بین ڈالتے انجانے دشمن کو کوس رہی تھیں جو زہر کھلا گیا۔ دھینگا مشتی کر رہی تھیں کہ اس کے منہ میں دہی ڈال کر الٹی کروا دیں۔

صنوبر کی نگاہوں میں وہ منظر گھوم گیا۔ جب امتیاز کو پہلا وہم پڑا تھا کہ اُس نے ہڑپا کی مورتیوں کو سجدہ کر دیا ہے تو وہ مہینوں سجدہ، عبادت خدا، دیوتا کے فلسفے پر مدلل گفتگو کرتی رہی تھی۔ تو ایک شام وہ اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اُٹھا تھا اور کہا تھا۔

''اچھا میری بہن خدا حافظ۔''

اور پھر وہ چلا گیا تھا۔ اُس کی زبان میں تو اتنی ہمت ہی نہ تھی کہ وہ کسی کو اُس کے جانے کا بتاتی وہ محض فلسفیانہ گفتگو کر سکتی تھی۔ روزمرہ بولنا تو اُسے آتا ہی نہ تھا۔ وہ فلسفے بولتی تھی عام گفتگو تو کرنا سیکھی ہی نا تھی۔

تبھی افتخار اُسے کہیں سے پکڑ لایا تھا۔ اور آتے ہی دہی مانگا تھا۔ اور اسے الٹیاں کروا رہا تھا، دہی زہر مہرہ رنگ میں تبدیل ہو کر الٹ رہا تھا۔ ''الٹ دو الٹ دو یہ زہر'' افتخار اُسے الٹی پر مجبور کر رہا تھا۔

''زندگی دوبارہ نہیں ملتی میرے بھائی۔ ایک بار ملتی ہے، اس سے کھلواڑ نہیں اچھا....''

پس منظر میں بڑی بی بی جی کی گالیوں اور بد دعاؤں کا سازینہ چل رہا تھا۔

''اسی حرامی نے اسی موت جوگے نے اسی گولی لگے نے میرے معصوم بچے کو کوئی پٹی پڑھائی ہے کہ وہ اپنی جان لینے پر اتارو ہو گیا۔ یہی غنڈا اس کے پیچھے لگا ہے اتنا ڈرا کے رکھا ہوا ہے۔ ہائے موت جوگا نہیں جینے دے گا اسے۔''

صنوبر کے کانوں میں گئے دنوں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی جیسے بہت سی مکڑیاں مل کر جالا تن رہی ہوں۔ اُس کا جی چاہا کہ چیخ کر کہے۔

''بس کر دو اُسے سکون سے جانے دو اب....''

اس روز بھی بڑے ملک صاحب ساہیوال گئے ہوئے تھے۔ اس روز بھی پورے علاقے میں کوئی گاڑی یا ٹیکسی موجود نہ تھی۔ اُس روز بھی ٹریکٹر ٹرالی کے آنے میں اتنی دیر ہو گئی کہ وہ خون کی الٹیاں کرتے کرتے غشی کی کیفیت میں چلا گیا۔ اس روز بھی ڈاکٹر نے آ کر ٹرالی میں اسے چیک کیا اور نفی میں سر ہلا دیا۔ اس روز بھی بڑے ملک صاحب راستے میں ملے۔ اس روز بھی موت گاڑی صبح کی اذان کے ساتھ گاؤں کی سوگوار فضاؤں میں داخل ہوئی۔ اس روز بھی دور دراز بیاہی لڑکیاں یکبارگی اکٹھا ہو گئیں۔ اس روز بھی حزنیہ بین فضاؤں ہواؤں کو لپیٹتے افلاک کو لرزا گئے تھے۔ زمین کو دھنسا گئے تھے۔ آج بھی صنوبر عورتوں کی دھکم پیل سے کسی کونے میں دھنسی احساسِ جرم میں جکڑی تھی۔ اس بار تو وہ موت والی رنگت بھی نہ پہچان سکی۔ وہ موت والا خلا جھول کیسے پکڑتی کہ اسے تو کسی نے زبردستی سلا دیا تھا۔ وہ جو اس پورے سال میں کبھی رات کو بھی نہ سوئی تھی اسے شام کے سایوں نے سلا دیا تھا۔ بس اتنی دیر کے لیے جتنی دیر میں کارروائی مکمل ہو گئی۔ پھر اُس کارروائی کی سنگینی کو جھیلنے کے لیے جگا دیا کہ مانو اپنی شکست کو مانو اپنی تدبیر کو غلط مانو، موت کی رنگت کو پہچاننے والے اپنے زعم کو غلط تسلیم کرو۔ اس بار تو تمہاری یہ صلاحیت بھی ناکام ہو گئی۔ تمہارے ساتھ ہاتھ ہو گیا صنوبر بی بی! چکمہ کھا گئی تم مانو کہ آئی گھڑی کے بیچ کے جھول کو تم آج بھی نہ پکڑ سکی۔ بڑی بی بی جی پچھاڑیں کھا کھا کر گر رہی تھیں۔ دندن پڑ رہے تھے۔

''ہائے میری عمروں کی کمائی لٹ گئی آج میں فقیرنی ہو گئی۔ مجھ سے تو آج مسلنیں چوہریاں اچھی۔ ہائے کوئی ساری زمینیں جائیدادیں لے کے میری کمائی مجھے لٹا دے بخش دے۔'' تو ہسو دائی نے عجب دلاسہ دیا تھا۔

''وڈی ملکانی سنبھال اپنے آپ کو۔ ہونی کو کوئی روک نہ سکا۔ جو پیٹ میں پل رہا ہے اس کی خیر مانگ جوان بادشاہیوں اور جائیدادوں کا اکلوتا وارث ہے۔

اُٹھ سنبھال اس وارث کو ایسا نہ ہو یہ جاگیریں جائیدادیں یہ محل ماڑیاں لاوارثی ہی

چلی جائیں۔''
تب ہزاروں عورتوں کے مجمعے کو جیسے ساہ پیونا سونگھ گیا تھا۔
بڑے ملک صاحب نے اپنی دوہری کمر کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھا رکھا تھا۔ انھوں نے بھی جیسے اپنا آخری زور لگا کر کہا تھا۔
''ملکانی صاحب کو کمرے میں لے جا کر لٹا دو۔'' یعنی ابھی بھی حوصلہ اور اُمید باقی تھی۔ ابھی بھی اجڑا ہوا ہڑپا بس سکتا تھا۔
مجمع کو قرار آ گیا۔
لیکن صنوبر کے سامنے تو وہ جوان لاشا اُس کی اپنی ہزیمت اور شکست کی صورت میں پڑا تھا۔ جس تک موت کو پہنچنے سے روکنے کے لیے وہ سال بھر نہ سوئی تھی نہ جاگی تھی۔
اُس کی سال بھر کی محنت اکارت گئی اُس کے فلسفے دھرے رہ گئے اُس کی ساری دانش زہر ہوگئی اس کی ساری منطق بنانشانے کے لگی۔
اُس قتل کو حادثہ اور تقدیر کا جبر قرار دیتے دیتے قدرت نے خود کو پھر اُس پر آشکار کر دیا۔ لیکن اُس کے چہرے پر موت کا رنگ نہیں تھا۔ قطعاً نہیں تھا وہ مرا نہیں مارا گیا ہے۔ اُس تک گھڑی نہیں آئی تھی لائی گئی ہے۔ یقیناً ''مستا منشی'' وہ زہرناک سی چلائی تھی۔
مستا کرلاتا تھا۔ میں تو دل بہلانے کو چھوٹے ملک کے پاس گیا تھا۔ میری یہ جرأت ایسی نمک حرامی کی ہمت۔ کوئی گواہ نہیں کوئی ثبوت نہیں سوائے موت کے دندناتے ہوئے چہرے کے کوئی چہرہ نہیں۔ شاید افتخار جو خوشبوؤں کی بگھیا میں اُڑا پھرتا تھا۔ کہ فطرت والا کوئی ہاتھ، عدل جیسا۔
وہ سرخ آندھیوں کا انتظار کر رہی تھی وہی تو ایک گواہی تھیں۔ فطرت کی گواہی اس اندھے قتل پر۔ لیکن وہ نہیں آئیں، انھیں اذن سفر ہی نہ دیا گیا تو پھر لوگ مستے کی بات کا یقین کیسے نہ کریں۔

چاہتی۔'' وہ اُس سے لپٹ کر رونے لگا۔ اس قدر رقت اور شدت سے کہ صنوبر کو لگا کہ ابھی وہ بندوق اٹھائے گا اور بڑے ملک صاحب کو گولی مار دے گا۔ خوفزدہ سا قہقہہ لگایا ''میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

''میں لا کر دوں گا ریڈیو۔ میں لا کر دوں گا کتابیں۔''

وہ اُٹھ کر باڑے میں گیا تھا اُس روز اس پانچ برس کے بچے نے ڈپٹ کر کہا تھا: ''یہ جھوٹی میری ہے اسے بیچ دو۔'' نوکروں کی جرأت کہ بابو جی کے حکم سے سرتابی کا تصور بھی کریں.... رات ملک صاحب ساہیوال سے واپس آئے تو پیار بھرے غصے سے کہا۔

''او موٹو تو نے جھوٹی بیچ دی۔''

وہ قہقہے لگاتے ہوئے اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔

''آپ نے مجھے دی تھی میں نے بیچ دی۔''

''مورکھ! تھوڑا صبر کر لیتے گابھن ہو جاتی تو تین گنا زائد قیمت پر فروخت ہو جاتی۔''

''پر ابو جی! ضرورت تو مجھے کل ہے بیچوں سال بعد جب ضرورت ختم ہو جائے تو فائدہ....''

''کملے تیری کیا ضرورت ہے مجھ سے کہہ۔''

''کل شہر چلیں گے نا ڈرائیور سے کہہ دیا ہے۔ وہیں جا کر معلوم ہو گا آپ کو۔ صبح سات بجے تیار رہیے گا۔ دیر نہیں کرنی کام بہت ہے۔''

یہ پانچ برس کا بچہ اپنے منے سے وجود میں سے یوں بولنے لگتا جیسے کوئی بھر جوان مرد پورے حلق سے بولنے لگے۔ اپنے بچپنے کو جیسے دودھ کی بوتل میں گھول کر کہیں فیڈ کے ساتھ ہی ڈکار گیا ہو یا شاید بے پناہ اہمیت میں کہیں تلچھٹ کی طرح بیٹھ گیا ہو۔ جیسے جانتا ہو کہ اس پورے نظام کی ذمہ داری بہت جلد اُسے اُٹھانا ہے۔ بڑھاپے کی اولاد زیادہ سرعت سے

جوان ہوتی ہے اور معاملہ فہم بھی۔ بڑے ملک صاحب اُس کی بھرپوریت کے سامنے کمزور ضعیف پڑ جاتے تب صنوبر کے احساسات پر وہ شاماں والی ڈانگیں تابڑتوڑ برستیں۔ جوانی میں جوان ہوتا بیٹا مدمقابل لگنے لگتا ہے۔ وہی جو بچپن میں نازوں پلا ہوتا ہے۔ لیکن بڑھاپے میں جوان ہوتے بیٹے میں اپنی جوانی گندھی دِکھتی ہے۔ جتنا بھرپور اتنا ہی قابلِ افتخار۔ جوانی والے جوان بیٹے کی نسبت پوتا جانشین لگتا ہے۔ افتخار کی جرأت تھی کہ باڑے میں سے گزر بھی جائے اور کسی جانور پر نگاہ غلط انداز ڈالے اور امتیاز جسے سب ملکیت میسر بھی آ گئی تھی جو آپ ہی دستبردار ہو گیا۔ اُسے بھی اتنی ہمت کہاں تھی کہ باڑے کا کوئی جانور بغیر اجازت بیچ ڈالے۔ یہ جوانی کی اولاد اور بڑھاپے کی اولاد کا فرق بھی عجب ہے۔ جوانی میں بچہ جمور اور بڑھاپے میں بچہ حضور۔

لیکن بڑی بی بی جی چیختی چلاتی رہیں۔ ''اسی بدذات نے اُکسایا ہے اسے۔ ہر برائی کی جڑ یہی سوتنی ہے۔ جسے کسی نے پوچھا تک نہیں۔ میرے سینے پر مونگ دلنے کو رہ گئی۔ میرے سگے بیٹے اور شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہے میری سوکن۔ دو بھائیوں کی قاتل ڈائین۔'' عطاءاللہ تڑپ کر مقابلے میں آیا۔

''تو گدھی، تو ڈائین، تو مرے، تیرا جنازہ پڑھا جائے۔'' وہ ساری گالیاں اور بددعائیں اُلٹا رہا تھا۔

لگتا یہ وہ نہیں بول رہا اُس کے اندر کوئی گھس بیٹھا ہے۔ جو پھٹ پڑا ہے۔ کیا گالی کی تشفی اُس سے بڑی گالی ہے۔ یہ منتوں مرادوں سے مانگا ہوا بیٹا یوں مقابل کھڑا ہو جاتا جیسے تقدیر حائل ہو جاتی ہے۔ جیسے مکافاتِ عمل۔ وہ بی بی جی کو مات دیتا، پسپا کرتا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتا، صنوبر کے بند کمرے کے دروازے سے لگا پہروں بیٹھا رہتا۔

''چھونو باجی دروازہ کھول دیں۔ میں پانی نہیں پیوں گا پیاس سے مر جاؤں گا۔ آپ دروازہ کھولو گی تو پیئوں گا۔'' چار پہر گزر جاتے وہ گرمیوں کی سحر دوپہر دروازے سے لگا

ہونکتا رہتا۔ لیکن منانے کے لیے آنے والی بڑی بی بی جی بڑے ملک صاحب نوکرانیوں، نوکروں سبھوں کی گرفت سے چھٹ چھٹ جاتا۔ صنوبر کو یقین ہوتا کہ وہ پیاس اور گرمی سے مر تو سکتا ہے۔ لیکن بند دروازے سے کبھی ہٹ نہیں سکتا ہے۔ صنوبر کو عجب سی اہمیت اور بدلے کی تسکین کا احساس ہوتا۔ جیسے اُس نے پال پوس کر ایک مدمقابل میدان میں اُتار دیا ہو۔ جو اُس کے لیے کٹ مرنے کو ہر لمحہ تیار رہتا۔ وہ پانی نہ پیتا جب تک کہ وہ پی نہ لیتی وہ کھانا نہ کھاتا جب تک کہ وہ کھانہ لیتی۔ وہ روتی تو وہ بھی روتا وہ ہنستی تو وہ بھی ہنستا۔

وہ جھوٹی بیچ کر اُس کے لیے ریڈیو لایا۔ ٹیپ ریکارڈر، دسویں کی کتابیں اور ڈھیرے اخبار سالے۔

صنوبر سننے لگی پڑھنے لگی۔ اُسے عمر میں پہلی بار لگا۔ وہ امیر ہو گئی ہے وہ جس نے کبھی کسی نوٹ کی شکل نہ دیکھی تھی اس کے گرد خزانہ ہی خزانہ ہے۔ کتابیں، موسیقی۔ حالاتِ حاضرہ، اس کی زندگی کے اندھے غار میں کئی روزن کھل گئے ہیں جیسے سورج بھر گیا ہو، ستارے اُتر آئے ہیں۔ چاند اس تاریک غار کی چھت پر ٹھہر گیا ہے۔ اپنے ہونے کا عجب احساس، وجود کا اثبات، موجودیت کا اعتبار۔

اُس کی خوشی پر وہ اچھلنے لگا۔ کلکاریاں مارنے لگا۔ وہ اُسے لپٹا کر رقتِ جذبات سے رونے لگی۔ ''اب چھونو آپی کیوں روتی ہو۔ شادی کے لیے نا۔ میں کروں گا آپ سے شادی۔''

وہ روتے روتے ہنس دی۔

''اور یہ کب کرو گے۔''

''جب بڑا ہو جاؤں گا۔''

''پر میں تو اُس وقت بوڑھی ہو جاؤں گی۔''

''آپ کبھی بوڑھی نہیں ہوں گی ایسی ہی جوان رہیں گی۔ ایسی ہی خوبصورت آپ

پریوں جیسی ہو۔ شہزادیوں جیسی میں کروں گا آپ سے شادی۔"

اس نے چپت لگائی۔

"مورکھ بھائیوں سے تھوڑی شادی ہوتی ہے۔"

"اچھا چھونو آپی تو میں بڑا ہو کر ڈھونڈ لوں گا نا کوئی شہزادہ۔ آپ کی شادی تو کسی شہزادے کے ساتھ ہی ہوگی نا۔"

"لیکن میں شادی کے لیے نہیں روتی ہوں یہ تم جو میرے لیے روز چیزیں اٹھالاتے ہو تو گھر میں کتنا فساد برپا ہوتا ہے۔ بڑی بی بی جی اتنا غصہ کرتی ہیں۔ نوکرانیاں بھی سنتی ہیں۔ یہ نہ لایا کرو۔"

وہ تیورا کر اٹھا "اس نے کچھ کہا میں ابھی پوچھتا ہوں۔ اس موٹی بھینس کی ابھی خبر لیتا ہوں۔" اس نے پیچھے سے کرتا کھینچا۔ "شرم نہیں آتی سگی ماں ہیں تمہاری۔"

"نہیں میری ماں آپ ہو۔ مجھے پیار کرتی ہوں، کہانیاں سناتی ہو، کسی سے لڑتی نہیں ہو۔ کسی کو مارتی نہیں، چیختی چلاتی نہیں۔ آپ میری امی ہو۔ وہ تو پاگل.....مجھ ہے۔"

کیا یہ ناخلف بچہ قہر خداوندی ہے کہ مکافاتِ عمل ہے۔ کس قدر مجبور تھے اُس کے سامنے والدین جو کبھی مجبور نہ ہوئے تھے۔ اختیار جب مجبوری بن جائے تو بااختیار کتنا بے بس ہو جاتا ہے۔

"چھونو باجی دسویں کا امتحان دینے ساہیوال جائیں گی۔ ابو! نوکروں کو بھجوا کر مکان کی صفائی کروادیں۔ ایک نوکرانی روٹی پکانے اور ایک کام کے لیے ساتھ جائے گی۔"

کسی کو حکم عدولی کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی۔ اس کے حکم میں عمر کے ساتھ زیادہ قطعیت، زیادہ حاکمیت آتی چلی گئی۔ کچھ کر سکنے کا زعم کتنا اعتماد بخش دیتا ہے۔ حاکمیت ملکیت کا اعتماد۔ یہ عجیب بچپنا تھا۔ عمر کے ہر سال کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جیسے حاکمیت منزلیں طے کر رہی ہو۔ سب اُس کی بات یوں سنتے تھے جیسے کوئی زیرک بزرگ بولتا ہو۔

صنوبر چپ چاپ دیکھتی تھی۔

یہ بے چین روح آج کس قدر پُرسکون ہے۔ جس کی تلاش تھی اُس سے مل گئی ہو جیسے کر۔ جیسے موت نے اپنا حنائی ہاتھ پھیر کر قلعی کر دیا ہو کوئی کالا پیلا برتن۔ آنکھوں کے سیاہ گڑھے آسودگی کے ستاروں نے بھر دیے ہوں جیسے کوئی پہلی رات کا دولہا جسے رج کے روپ چڑھا ہو۔

صنوبر کو عجب ملال ہوا۔

وہ اتنا عرصہ دکھ، کرب، اذیت اور اس سکھ چین کے بیچ ناحق حائل رہی۔ اُسے اس سکون کو روکنے کا کیا حق حاصل تھا بھلا۔

ایک بار پھر گاؤں کی فضائیں ملال سے رندھ گئیں۔ اُس سال رکھی ہوئی شادیاں ملتوی ہو گئیں۔ اُس سال پھر بازی نہ پڑی۔ ہنڈولے والے کو ہنڈولے نہ اُتارنے دیے گئے۔

کئی روز پانی کی باریاں آوارہ بہتی رہیں۔ اُس سال پھر کپاس کے موسموں میں جی بھر کر بین کے لحن میں گیت انڈیلے گئے۔ کئی گمنام شاعروں نے سراپا نگاری سے واقعہ نگاری تک دوہے لکھے۔ کئی پہلے کے لکھے ہوئے بیتوں کو تبدیل کر دیا گیا۔ یوں افتخار اور امتیاز کی کہانی مکمل کر دی گئی۔

▪▪▪▪

عطاء اللہ

اجڑے ہڑپا پر پھر ایک تازہ بستی بس گئی تھی۔ اس بچے کا استقبال یوں کیا گیا جیسے افتخار یا امتیاز کی قبر سے کوئی پوداا گ آیا ہو جس کی شاخ سے یہ نر بچہ پھل کی صورت لگا تھا اور بڑی بی بی جی کی خالی جھولی میں آن ٹپکا۔ جھولی بھر گئی۔

جیسے پورے علاقے نے ڈھوئے ڈھو ڈھو کر گھر بھر دیا تھا۔ یہ گھرانہ ہی نہیں پورا گاؤں ثمر بار سرشار ہو گیا کہ لاوارث جاتی زمینوں کا وارث آ پہنچا ہے۔ اب اُن کی مزارعیت، منشیت اور نوکریت برقرار رہے گی۔ اگر جاگیر کا وارث ہی نہ رہا تو پھر یہ حیثیتیں کیونکر رہیں گی۔ وہ جاگیر جس کی حفاظت نسل در نسل اُن کے خون میں گھلی تھی جس کی بنا پر ہی یہ مزارعیت و چاکریت تھی۔ اگر کبھی یہ بٹ جائے یا بک جائے تو ان کا مستقبل کیا ہو گا جو عمروں نسلوں سے کوئی اور کام کرنا ہی نہ جانتے تھے۔ زمانہ بدل گیا تھا اطوار بھی بدل گئے تھے جیسے فطرت نے انگڑائی لے کر پچھلے صدمات و حادثات جھاڑ دیے ہوں۔ خزاں رسیدہ ٹنڈ منڈ اشجار نے آمدِ بہار کا سبز پیراہن زیب تن کر لیا ہو۔ قدرت نے ایک نئی بساط ترتیب

دے دی ہو۔ کچھ نئی چالیں چلنے کو، کوئی نئی مات اور نئی جیت کی بازی سجادی ہو۔ میدان کے کھلاڑیوں کی پوزیشنیں تبدیل کر دی گئی ہوں۔ عجب فلسفۂ سانحات ہے کہ جن حادثات و المیات کو دوسرے ناقابلِ برداشت سمجھتے ہیں جن پر وہ گزرتے ہیں۔ اک حوصلے اور اک گونہ بے حسی سے وہ انھیں سہار جاتے ہیں۔ کوئی موت کوئی حادثہ ایسا روئے زمین پر نہیں گزرا جسے قبولا نہ گیا ہو۔ نقصان کیسا رہا ہو۔ لیکن وقت کی گرد نے اسی میں سے نئی زندگی کی کونپل نہ اگائی ہو، تلافی نہ کی ہو۔

جیسے یہ بچہ جس کا نام عطاءاللہ رکھا گیا۔ اللہ کی خاص عطا، خصوصی عنائیت، بڑی تلافی، یہ بچہ بڑی بی بی جی کو اُس دور میں لے گیا۔ جب وہ بیاہ کر نئی نئی اس حویلی میں اُتری تھیں اور پہلا پہلا بچہ گود میں بھرا تھا۔ وہ یوں شرما شرما کر اس کی پیدائش کے مراحل کا تذکرہ خادماؤں سے کرتیں۔ جیسے پہلوٹھی کا یہی نر بچہ ہو۔ دودھ پلاتے ہوئے سرشاری کی عجب نشہ آور کیفیت، پھر سے جوان ہو جانے کا دیوانہ سا تجربہ عمرِ رفتہ کے لوٹ آنے کا وحشی سا احساس۔ جیسے قدرت نے دو جوان بیٹوں کی موت پر صبر کا انعام اس بچے کی صورت میں عطا کر کے پچھلا سارا حساب بے باک کر دیا ہو۔ پلوٹھی کے بچے کے ساتھ ماں پر جو کلفت اور ڈپریشن طاری ہوتا ہے اب تو وہ بھی نہ تھا۔ ڈھوئے اور مبارکبادیاں لانے والیاں جھوم جھوم کر سہرے گاتیں۔ مولد پڑھتیں، مردانے میں گھوڑے نچائے گئے۔ بھنگڑے ناچے گئے، جلیبیاں اور لڈو تلوائے گئے۔ دو سال سے خالی ہاتھ لوٹ جانے والے یکبارگی ازدحام کر گئے۔ بازی والے، تماشے والے، شعبدہ باز، رنگ باز، میراثی بھانڈ، ہیجڑے، گڑدی والیاں جنھیں پچھلے دو سال اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کی جرأت ہی نہ ہوئی تھی۔ جنھیں الم رچی فضاؤں میں بین اور ماتم کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔ وہ اگلا پچھلا سارا حساب چکا کر رخصت ہوئے۔ اُس سال بھینسوں، گائیوں، بکریوں نے مادہ بچے دیے۔ فصل کو سنواں لگا، بارشیں بروقت برسیں، رکی ہوئی شادیاں زیادہ دھوم دھام سے ہوئیں۔ ختنہ، عقیقے کے جشن

منائے گئے۔ ہرا بھرا ہڑ پا لہرانے لگا۔ جیسے پچھلا سب خواب تھا جو دیکھا گزر گیا۔ جو سنا وہ افسانہ ہوا۔ ماضی لوک گیتوں میں دفن ہو کر اپنی مقامیت اور اصلیت کھو گیا جو کالی راتوں اور تخر دوپہروں کو کسان مرد وزن الاپتے رہے۔ میراثنیں، پکھی واسنیں، مزارعیاں، نوکرانیاں سب خوشامدی لسوڑے کے گودے کی طرح بہنے، چپکنے لگیں۔

''وڈھی ملکانی تو ابھی جوان جہان ہے۔ کُڑی چڑی ہے۔ تیرے ساتھ کی تو ابھی کنواری بیٹھی ہیں۔ اب نہ اللہ کے کرم سے منہ موڑنا، ہونے دینا۔ جتنے بھی اللہ سائیں دیتا ہے۔ اللہ سائیں جوڑی رلائے۔ اِک کے لاکھ کرے۔''

بڑی بی بی جی کے اندر سوئی جوانی انگڑائی توڑ کر بیدار ہوئی تھی۔ بال زیادہ گھنے اور سیاہ گھٹائیں، جسم زیادہ سڈول اور بھرپور، رنگت شدید سرخوشی والے غازے میں رنگ گئی تھی۔ اُن کی سوچ کئی اُلٹے درجے نیچے اُتر کر جوانی والی منڈیر پر چھہانے لگی۔ نئے زیورات، کپڑے، جوتے، چھن چھن کھن کھن جاتی جوانی عود کر پلٹی تھی اور مصاحبت کے لیے نومولود بچوں کی ماؤں کو باریابی کی اجازت ملی تھی۔ بچے کے دودھ، الٹی، جلاب، سونا جاگنا جیسے مشترکہ موضوعات پسندیدہ تھے۔ پچھلی مصاحبات جو جوان بچوں کی مائیں تھیں اُن کا داخلہ ناپسندیدہ تھا کیونکہ اُن کے موضوعاتِ گفتگو حالاتِ حاضرہ سے لگا ہی نہ کھاتے تھے۔ دکھی اور بے زار، گزر چکے صدمات کی جگالی کرنے اور دکھوں کے بین ڈالنے والیاں۔ بی بی جی اُنھیں بڈھیوں کو نام کی بجائے ماسی اور بوبو کہہ کر بلانے لگی تھیں۔ جنھیں کبھی نام سے پکارتی تھیں وہ اب بزرگ لگنے لگیں اور نوعمر لڑکیاں ہم جولیاں محسوس ہوتیں۔ جوانی شیر خوار کی انگلی پکڑ کر کئی زینے اُتر آئی تھی۔ البتہ بڑے ملک صاحب اپنے شکی مزاج اور خشک طبیعت کی وجہ سے ابھی بھی پریشان رہتے۔ چوالیس برس کی عمر میں پیدا ہونے والا یہ بچہ کب جوان ہوگا۔ کیا وہ اُس کی جوانی دیکھ سکیں گے۔ پچھلی عمر کا بچہ بھی کتنی فکروں اور بے اعتمادیوں کے ساتھ پروان چڑھتا ہے۔ لیکن اس انعام کی عظمت سے تو مفر ممکن ہی نہ تھا۔

وہ جو ابھی تک افتخار کی قبر پر جا کر اُس سے باتیں کرتے تھے جن باتوں کو گاؤں والے بین کہتے تھے اور جو امتیاز کے لیے چھپ چھپ کر مثلِ گریۂ یعقوب روتے تھے۔ وہ اب زمینداری، نمبرداری اور دنیاداری میں دلچسپی لینے لگے تھے اور اُس سال بلا مقابلہ چیئرمین یونین کونسل بھی منتخب ہو گئے تھے۔

اُجڑا شہر بھنبھور بس جانے کی روحانی سرشاری سے تو انکار ممکن ہی نہ تھا۔ یعنی اس ز بچے نے حویلی کے کھنڈرات پر اک نیا بارونق شہر بسا دیا تھا۔ اگرچنی کو حویلی میں آنے کی اجازت ہوتی تو وہ کہتی: ''یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ پچھلی تعمیر کسی اگلی تعمیر کے لیے ہی تو برباد ہوتی ہے۔ ہر تباہ حال اک نئی تعمیر سے خوش حال ہو جاتا ہے۔ ہر عروج کے بطن میں زوال اور ہر زوال کے بطن میں عروج پلتا ہے۔ یہی فلسفہ تو کھنڈروں کی مہروں پر لکھا ہے جسے پڑھنے سے ہم انکاری ہیں۔ بس اتنی سی تو تاریخ کی تاریخ ہے۔ اُجڑنا اور پھر بسنا، ہڑپا ہر بستی کی نہاد میں رہتا ہے۔ نجانے کس کھنڈر پر بنیاد اُٹھی ہو۔''

یہ بچہ جس کی حفاظت کے لیے کئی نوکرانیاں اور کھلائیاں مختص کی گئی تھیں، جن کے قہقہوں سے چار کنال کا صحن گونجتا تھا۔ ٹیوب ویل کے گرد پھیلا باغ مہکتا تھا۔ نورستہ پھل گودے ٹپکاتے تھے، پھدکتے پرندے چہچہے کرتے تھے۔ یہ چھوٹی لڑکیاں کیا جانیں کہ اس صحن نے کیسے المناک جنازے اٹھوائے ہیں۔ یہ تو خود اس صحن کے مکین بھی بھلا دینا چاہتے تھے کیونکہ خود فطرت پرانی فصل کے کٹ جانے کے اہتمام کے بعد نئی فصل اگا دیتی ہے۔ بڑی آندھیاں کئی جھاڑ جھنکار اور رکاوٹیں بھی تو اُڑا لے جاتی ہیں اور پگڈنڈیاں ہموار کر دیتی ہیں۔ سیلاب اور طوفان بارشیں جہاں فصلیں ہڑپ لیتے ہیں۔ وہیں اگلی فصلوں کے لیے زمینیں زیادہ زرخیز بھی تو بنا دیتے ہیں۔ اس کٹاؤ اور بہاؤ میں اک ثمر مندی بھی تو بھر جاتی ہے۔ حد یہ کہ خود صنوبر کی جامد اور اداس زندگی میں ایک تحیر و تحرک در آیا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز میں اس بچے کی آیا بنتی چلی گئی۔ شاید اُس کی نہاد میں لفظ ''خدمت'' گندھا تھا۔ امتیاز

کے بعد اس کی ٹھہری ہوئی زندگی کے پتھر پگھلنے لگے۔ اس بچے کی کلکاریاں، غوں غاں، دو لبی حرف جنھیں وہ معنی پہنانے لگی۔ اسے بیٹھانا، اٹھانا، چلانا، کھیلانا، پاؤں پاؤں بڑھانا، لفظ لفظ بلوانا، لقمہ لقمہ کھلانا، جیسے وہ اُس کی گورنس مقرر ہوگئی ہو۔ پتا نہیں اُسے سکھا رہی ہو کہ خود اُس کے سہارے اک نئی زندگی جینا سیکھ رہی ہو۔ بڑی بی بی جی اس ریزہ ریزہ مشقت کی عادی نہ تھیں وہ جاتی جوانی کے لوٹ آنے کے احساس سے سرشار کپڑوں، جوتوں، زیوروں میں کھب گئی تھیں۔ وہ محبت کی کیسی بھی سرشاری میں ہوں لیکن محبت کی مشقت اُن کے مزاج کا حصہ نہ تھی۔

صنوبر کی بے کار زندگی کارآمد ہوگئی۔ اُس بچے کی خدمت جینے کا بہانہ بن گئی۔ آہستہ آہستہ وہ اُس کے بستر پر آ گیا۔ سولہ سترہ برس کی صنوبر ممتا کے جذبے سے چھلکنے لگی۔ ہر خیال داری، تیمارداری، غم گساری ہر مشقت، مشکل صنوبر پر ہی کیوں واجب ہو جاتی تھی۔ شاید اس لیے کہ اُسے خود اپنے لیے جینے کی اجازت نہ تھی۔ بنا اجازت وہ کھا نہیں سکتی پہن نہیں سکتی صحن میں نکل نہیں سکتی نہا نہیں سکتی، بول نہیں سکتی۔ وہ ریشم کا کیڑا دوسروں کے لیے ریشم کاتتی اور خود پر لپیٹتی رہی۔ نوکرانیاں کبھی کبھار چوری چھپے اُس کے کان میں پھونک جاتیں۔

"چھوٹی بی بی تو تو درویش نرا قلندر۔ تجھے تو بیاہ کی لوڑ ہی نہیں ہے۔"

تو تو جتی ستی بی بی تیرے جیسا جگ میں نہ کوئی ہور

لیکن صنوبر اس گنگناہٹ میں بڑی بی بی جی کے مضبوط اعصاب پر ہمیشہ رشک کرتی۔ کیسی مشکل کیسے بھی سانحات اُنھیں کبھی متاثر نہ کر سکے۔ دن بھر کی چیخ پکار میں بے پناہ کتھارسیس، شب کے اولین پہر میں خواب آور گولیوں کی غنودگی، کسی بھی حادثے یا دکھ کی شدت کا تریاق۔ ہر واقعہ کے ذمہ دار دوسرے، دن بھر کی واہی تباہی، اندر مع سارا

الم، غلم، پچھتاوا، قلقل، مغلظات کی صورت بہہ نکلتا۔ کھلی کھلی نکاسی، کس قدر کارگر حربہ۔

”ہائے شیر جوان چلے گئے۔ یہ گدھی رہ گئی، اُن کی جگہ تو کیوں نہ مرگئی، تو کیوں نہ گولی کے سامنے آ گئی۔ تو کیوں نہ زہر کا پیالہ پی مری، پاس کھلو کے مرتے دیکھتی رہی۔ ہماتڑ کے بھائی آنکھوں کے سامنے یوں مرتے تو آپ ڈھیٹ بن کر بے غیرتی کی زندگی بھی نہ جیتی۔ کیا معلوم خود آپ شامل ہو سازش میں کہ زمینوں کی مالک بن جائے۔ پر تیرے نہ میں تو میں سوّر بھی نہ دوں، زہر مہرہ دوں گی۔ وہ بھی کھولے کے کوزے میں بھر کر.....“

بڑی بی بی جی جس طرح حادثاتی جوانی کے زینے چڑھی تھیں اس نئے تناظر میں اس جوان بیٹی کا وجود سوکن سا لگنے لگا تھا۔ پرانے دور کی تلخ یادگار یہ بھی کیوں نہ مرگئی۔ جنی ہوتی تو کہتی:

”بی بی! یہی تو ڈھنڈاروں کا فلسفہ ہے۔ حاکم کو اپنی طاقت اپنا غرور نافذ کرنے کو کوئی مدمقابل چاہیے ہوتا ہے۔ جیسے خدا کو کل خدائی درکار ہوتی ہے۔ ورنہ یہ طاقت یہ زعم کس نے دیکھا۔ اگر کسی نے نہ دیکھا تو پھر ہوا کہ نہ ہوا۔ سب برابر۔ ہر طاقت ور کو مدمقابل درکار ہے۔ ذلیل کرنے کو، شکست دینے، نیست و نابود کرنے کو۔ احسان مند کرنے کو، اپنی برتری کا اعتراف کروانے کو، سزا اور جزا کی آسودگی حاصل کرنے کو۔ تجھے کیا پتا بی بی مجھے کیا خوشی ملتی ہے۔ درویشوں کو اپنے سامنے گڑگڑاتے اور آریا کو شکست کھاتے دیکھ کر۔ وہی خوشی جو پیروں، گدی نشینوں کو مریدوں کے ہاتھ جوڑنے، پاؤں پڑنے، تھوک چاٹنے سے ملتی ہے وہ خوشی جو خدائی کو بندگی سے ملتی ہے، آقائیت کو رعیت سے ملتی ہے، حاکم کو محکوم سے ملتی ہے، کوئی بھی توڑ نہیں ہے اس سرشاری کا اس سامری کا۔“

لیکن صنوبران کو سنوں، بدعاؤں کا کبھی کوئی جواب نہ دیتی۔ وہ جو فشارِ خون کی نکاسی تھے۔ جس میں تمام المیات اور پچھتاوے بہہ جاتے تھے۔ لیکن اب وہ بچہ جو بڑی بی بی جی کے لیے جوانی اور تازہ دم ازدواجی زندگی کی نوید لے کر آیا تھا۔ وہ جواب دینے لگا تھا۔

پہلے تو وہ احتجاجاً رونے لگتا۔ یوں بے تحاشہ کہ بڑی بی بی جی کی آواز دب جاتی۔ آہستہ آہستہ بولنے لگا۔ چار پانچ برس کی عمر میں تو وہ اُس کے دفاع میں یوں کھڑا ہو جاتا جیسے اُس کے مننے سے وجود میں سے انگڑائی توڑ کر کوئی جوان اور مضبوط مرد اُٹھ کھڑا ہوا ہو۔

''تم مرو میری سوہنو آپی کیوں مرے۔ میری سوہنو کو گالی دی تو میں تمھیں گالی دوں گا۔''

اس معرکے کے دوران وہ صنوبر سے یوں لپٹ جاتا جیسے اُسے اپنی حفاظت کے حصار میں لے رہا ہو۔ بی بی جی جوتا اُتار کر حملہ آور ہوتیں۔ وہ مدمقابل آجاتا۔

''مار آمار کے دکھا آئی بری امی ڈھمی....''

وہ پسپا ہو جاتیں۔ شاید بڑھاپے کی اولاد پسپا کر دیتی ہے اور جوانی کی اولاد مہمیز کرتی ہے۔ وہ جوتا اچھال کر صنوبر پر پھینکتیں۔ عطاءاللہ فضا میں ہی کیچ کر لیتا اور ہنسنے لگتا۔

''یہی نشانہ ہے تیرا لے جھپ لیا۔ اگر میری سوہنو آپی کو لگا تو تیرے میں دو ماروں گا امی ڈھمی....''

بڑی بی بی جی دونوں ہاتھوں کے جھانپڑ تار تاڑ رانوں پر برساتیں۔

''ہائے میں نے جنا، جو کھم سے پالا۔ آج میرے ہی خلاف کھڑا کر دیا۔ اس گدود نے۔ یہ پاگل اسی گدھی کا سکھایا ہوا ہے۔ وہ جسے کسی نے لیا نہیں۔ بیٹھی بڈھی ہو گئی کسی نے پوچھا نہیں۔ پہلے دوشیزہ بچے کھا گئی ڈائین۔ اب اسے چھین رہی ہے۔ دھتکاری ہوئی.... کوئی اور ہوتی تو زہر کھا کر کب کی مر کھپ گئی ہوتی۔''

''تو مر، تو کھپ سوہنو کیوں مرے۔'' وہ ہر گالی اور بددعا کو الٹا کر واپس پھینکتا چلا جاتا۔ لیکن اس طعنے کا جواب اُس کے پاس کوئی نہ تھا کہ اُس کی سوہنو آپی بڈھی ہو گئی کسی نے پوچھا بھی نا۔

''سوکھی سڑی چاچڑک کوئی پوچھے بھی کیوں نری مسلن کھجور کی گٹک۔ شرم سے مرتی

بھی نہیں۔ ہائے ایک ہم پر جوانی آئی تھی۔ یہ سینہ بھرواں، یہ قد۔ چلتے تو ہرنیاں مڑمڑ کر دیکھتیں۔ سر اُٹھاتے تو چاند بھی جھک جھک نظارہ کرتا۔ ہائے یہ گُھ تے مٹھ۔ شیشہ دیکھ کرمر کیوں نہیں جاتی۔ بائیس تیئس کی ہوگئی کسی نے فٹے منہ بھی نہ کہا۔ ایک ہم تھے کہ پہلی نہاونی ابھی دور تھی کہ رشتوں کی قطاریں.... ہائے کلموہی ہائے تیرے ساتھ کی تو چوہڑیاں مسلنیں بھی چار چار چھے چھے بچوں کی مائیں بن گئیں۔ تجھے تو کسی مسلی نے بھی نہ پوچھا بے حیا۔''

صنوبر ہر گالی بددعا کبھی کانوں کے رستے دماغ تک پہنچنے ہی نہ دیتی لیکن یہ طعنہ یوں لگتا جیسے پرانے کھولے میں دھنسی غلیظ بوسیدہ ٹاکیاں اس کے منہ میں ٹھونس دی گئی ہوں۔ پورے بدن پر لپیٹ دی گئی ہوں۔ غلاظت کے احساس سے اُسے الٹی آتی۔ وہ تو ابھی تک اپنے جسم کی تجاوزات کو گھونٹنے سمیٹنے میں ہی لگی شرمندہ شرمندہ رہتی تھی۔ چلتی تو کب نکال کر بدن سکیڑ کر نظریں زمین میں گاڑ کر کہ ابھی للکار آئے گی۔

''ہائے ہائے بے حیا ممے نکال کر یوں چل رہی ہے جیسے کسی خصم کو دکھانے ہوں۔''

ابھی تو وہ اس قبیل کے طعنوں کی عادی ہوئی تھی کہ طعنوں کا رخ ہی بدل گیا۔ وہ کمرے میں خود کو بند کر لیتی۔ دروازے کے باہر عطاء اللہ جیسے اُس کا محافظ بنا کھڑا ہوتا۔

''آ میری صوبو کی طرف ذرا ہاتھ لگا کر دکھا امی ٹھمی۔ میں بتاتا ہوں نا تجھے۔ تو میری سوہنو کے پیر جیسی بھی نہیں۔ میں شادی کروں گا اپنی بہنا سے۔ میں بناؤں گا اُسے اپنی دلہن۔ تو کالی بدشکلی تو موٹی مجھ تو بڈھی رن۔ میری صوبو تو پریوں جیسی خوبصورت، گوری چٹی نازک ملوک، جوان پیاری۔ میری دولہی بنے گی۔ خبردار جو طعنہ دیا۔ بدلے میں تجھے طعنہ دوں گا، گالی کا بدلہ گالی سے دوں گا۔ بددعا کا بدلہ بددعا سے دوں گا۔ آ ذرا میدان میں۔''

وہ صرف اُسی کی سنتا، ''تم اپنی زبان گندی نہ کیا کرو۔ تمہاری امی جو کہتی ہیں کہنے دیا کرو اُن کا مجھ پر بھی حق ہے۔''

''آپ پر کیسا حق وہ آپ کی ماں تھوڑی ہیں۔'' وہ اُسے بازوؤں میں اُٹھا کر جھلاتی۔

''نہیں کملے میری بھی وہی ماں ہیں۔''

''نہیں میں نہیں مانتا۔آپ کو تو ہر وقت وہ گالیاں اور بددعائیں دیتی ہیں۔''

یہ ان کی عادت ہے اگر اُن کی بدعاؤں سے میں مرگئی تو وہ شاید تمھیں گالیاں اور بددعائیں دینے لگیں گی۔''

''اگر آپ مرگئیں تو میں آپ کی قبر میں ہی آپ کے ساتھ سوؤں گا۔'' صنوبر نے سوچا۔ یہ بچہ جو کہہ دیتا ہے وہ کر دکھاتا ہے۔ وہ اپنی درازیٔ عمر کی دعا مانگنے لگی۔

''میری چھونو صوبو تم روتی کیوں ہو۔ تمھیں روتا دیکھ کر میں بھی روؤں گا۔ تمھیں ہنستا دیکھ کر ہنسوں گا۔ تمھیں شادی کرنی ہے نا تو مجھ سے کرلو پر رویا نہ کرو۔'' وہ اس کے ساتھ قہقہہ لگانے کی جراٗت بھی کر لیتی۔ اُسے ہنستا دیکھ کر وہ خوشی سے کلکاریاں مارتا۔ تالیاں بجاتا۔ جھومتا، ناچتا۔ مجسم خوشی کا اچھلتا کودتا گولا سا بن جاتا۔

''اب دیکھو نا بابو! میرا پڑھنے کا دل چاہتا ہے مجھے پڑھنے نہیں دیا گیا۔ میرے پاس ریڈیو تک نہیں ہے۔ بڑے ملک صاحب کے ریڈیو کو تو تم بھی ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ رات وہ جب بی بی سی کی خبریں سنتے ہیں تو آخر میں جو کھیل کی خبریں ہوتی ہیں نا۔ اُنھیں پتا ہے کہ میں وہ سننا چاہتی ہوں تو وہ ریڈیو بند کر دیتے ہیں اور ٹھیک ایک منٹ کے بعد ریڈیو کھول دیتے ہیں۔ جب نیوز کاسٹر کہہ رہی ہوتی ہے۔

یہ تھیں کھیل سے متعلق خبریں۔ تو میں پھر بقیہ پوری رات روتی رہتی ہوں۔ دکھ ہوتا ہے، رونا بنتا ہے نا۔ کیا ہو جائے اگر ایک منٹ کے لیے کھیل کی خبریں بھی چلنے دیں۔ ایک دو منٹ کے لیے بند نہ کریں۔ وہ بند کرتے ہیں کہ میں نہ سن سکوں۔ مجھے تکلیف دینے کو اُن سے برداشت نہیں ہوتا کہ مجھے کسی چیز میں دلچسپی پیدا ہو۔ وہ دنیا والا ہر دروازہ مجھ پر بند کر دیتے ہیں۔ ان سے برداشت نہیں ہوتا کہ میں کسی چیز سے خوش ہو جاؤں۔ وہ چیز ہی ختم کر دیتے ہیں تم بھی میرے لیے خوشی کا باعث مت بنا کرو مجھے خوش تو خود قدرت بھی نہیں دیکھنا

اس کا تجزیہ اور فیصلہ عجب مدبرانہ ہوتا۔ کس وثوق سے وہ فیصلے صادر کرتا جیسے اس پنچائت کا وہی سرپنچ ہو۔ بوڑھے ماں باپ کے بچے جلد جوان ہو جاتے ہیں۔ اور بوڑھے شیر جگہ چھوڑنے پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ نو دس برس کی عمر تک سبھی نوکر، مزارعے اسے ہی مالک سمجھنے لگے تھے۔ جس طرح مالک کو بوڑھا اور کمزور دیکھ کر سبھی نوکر ملازم جوان بیٹے بیٹی یا بہو کو مالک کے منصب پر غیر محسوس انداز میں بٹھا دیتے ہیں۔ بوڑھے مالک کی عمر بھر کی مہربانیوں اور تحکم کا محل بنا کسی دھکے کے ہی زمین بوس ہونے لگتا ہے۔ محض اُس کی عمر کے ضعف سے۔ حضرت سلمان کے عصا کی طرح کھکھل۔

صنوبر نے عطاء اللہ کے انتظام کی وجہ سے پرائیویٹ میٹرک کا امتحان دیا۔ ایف اے اور بی اے بھی پاس کر لیا۔ جب وہ بی اے کا رزلٹ لے کر آیا تو بے تحاشا خوش تھا۔ جیسے یہ ڈگری اس کی تخلیق ہو۔ جیسے اس کی سوہنو آپی کوئی ہمالہ سر کر گئی ہو کہ جیسے رزلٹ کارڈ نہیں چھوٹو باجی کی شادی کا کارڈ چھپوا کر لایا ہو۔ وہ شہزادہ ڈھونڈ لیا ہو جس کے ڈھونڈنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس نے ڈھیر سی موم بتیاں جلائی تھیں، غبارے پھلائے پھولوں کے گلدستے بنوائے۔ لڈو اور جلیبی تلوا کر پورے گاؤں میں بٹوائے۔ وہ تو رات کو چینے اور جھومر کی محفل بھی سجانا چاہتا تھا لیکن صنوبر کی ڈانٹ ڈپٹ سے ارادہ چھوڑ دیا۔ اسے کوئی ڈانٹ سکتا تو بس صنوبر کوئی مار سکتا تھا تو صنوبر کسی ارادے سے کوئی باز رکھ سکتا تھا تو صنوبر۔ یہ بچہ جو قبل از وقت بڑا ہو رہا تھا جسمانی طور پر تو اپنی عمر کے ساتھ ہی تھا لیکن ذہنی طور پر اپنی عمر کو بہت پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

"تم یہ بے کار کی خوشیاں منانے کی بجائے ایک کام کرو۔ ذرا سفارش کر کے مجھے یونیورسٹی میں داخل کروا دو۔" اس کے چہرے پر وہی ہلدی رنگ لہرایا جو اُس گرم پگھلتی سہ پہر میں امتیاز کے چہرے پر لپا ہوا تھا۔ جیسے کہتا ہوں، یہ نہ ہو سکے گا اس کے بدلے زندگی بھلے لے لو....

تھوڑی جا رہی

''کیا ہوا.....'' اس کے حلق میں پھندہ سا لگ گیا۔ ''ہمیشہ کے لیے تھوڑی جا رہی ہوں، ویسے بھی کون بھیجے گا مجھے۔ یونہی مذاق کر رہی تھی تم سے۔'' وہ ڈر گئی، اس کے چہرے پر لہراتا یہ زرد سایہ اسے لرزا گیا۔ ایسا ہی سایہ جو برسوں پہلے ایک شام افتخار کے چہرے پر نظر آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی کسی بات کو مذاق تھوڑی سمجھتا تھا۔ اُس نے اسی رات کہہ دیا۔

''ابو ہم کل یا پرسوں لاہور جا رہے ہیں کیونکہ سوہنو باجی کو یونیورسٹی میں داخل کروانا ہے۔''

بڑی بی بی جی خواب آور گولیوں کی غنودگی میں جیسے پٹ سے جاگ گئیں۔

''دیکھا نا۔ یہ بے حیا، بے غیرت یہ جنا ڈھونڈنی منہ سے مرد مانگنے لگی ہے۔ یونیورسٹی تو بہانہ ہے وہاں یار ڈھونڈنے جا رہی ہے اور یہ بے غیرت بھیجے گا ضرور بھیجے گا۔ یہ گدھی معصوم بچے کو استعمال کر رہی ہے۔'' اس غلیظ گفتگو پر بڑے ملک صاحب بھی چلا اُٹھے۔

''چپ کر جا اے عورت تیرے اسی پاگل پن نے خاندان کو ان حالوں تک پہنچایا ہے۔''

بڑے ملک صاحب جیسے اندھے بہرے عاشق کے منہ سے نکلی کوئی اختلافی بات جس سے بڑی بی بی جی کی کسی بات کی تردید ہوتی ہو یا تنقید کا شائبہ بھی گزرتا ہو۔ وہ لفظ کسی آگ کے گولے کی طرح بڑی بی بی جی کے دماغ کو بھڑکا دیتے تھے۔ کسی اور کو تو کسی تردید یا تنقید کی جرأت ہی نہ ہوتی تھی لیکن بڑے ملک صاحب کبھی کبھار یہ جرأت کر بیٹھتے تھے۔ تو پھر جوابی ردِعمل سنبھالنا اُن کے بس میں بھی نہ رہتا۔ وہ ایسی آواز میں چیخ و پکار کرتیں کہ پورا گاؤں ہڑبڑا جاتا۔ بڑے ملک صاحب بھی مصلحتاً یا محبتاً چپ سادھ جاتے۔ لیکن ایک شخص تو ایسا پروان چڑھ رہا تھا جس نے ڈرنا یا دبکنا سیکھا ہی نہ تھا۔ ڈر خوف جو صنوبر کی نہاد میں گندھے تھے جو افتخار اپنے بہتے خون میں سمو کر لے گیا تھا جو شکلیں اور ہیئتیں بدل بدل کر امتیاز کو ڈراتے تھے۔ وہ سبھی جیسے اس کے سامنے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوتے جیسے اپنی

خوفناک تھوتھنیوں کے سامنے خود بھی شرمندہ ہو رہے ہوں۔ وہ ڈرتا ہی نہ تھا۔ وہ اب بھی بستر چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''امی امی امی۔ بند کر یہ بکواس۔ تو بے حیا، تو بے شرم، تو جنا ڈھونڈنی تو خصم کرنی۔ میں تجھے گولی مار دوں گا۔''

بی بی جی نے دونوں ہاتھوں سے بے تحاشا منہ سر پیٹ ڈالے۔ تار تار رائیں کوٹیں۔

''یہ مجھے اس پاگل کے ہاتھوں مروائے گی۔ میں بتا رہی ہوں۔ یہ سکھا پڑھا رہی ہے اس سنپولیے کو۔ جسے پیٹ سے نکالا ہے۔ یہی میرا قاتل ہو گا۔ یہ کتنی خبیث زنانی ہے جسے کسی چوہڑے مسلی نے بھی نہ پوچھا۔ یہ مروا دے گی مجھے۔ ہائے لوگو یہ مروا دے گی مجھے اس پاگل کے ہاتھوں۔''

شب کی گھور تاریکیوں میں بڑی بی بی جی کی حال دہائی بھکوں میں سوئے ہوؤں کو بھی جگا جاتی اور صنوبر کو لگتا غلاظت کے بھرے ٹوکرے ہیں جو اُس پر انڈیلے جا رہے ہیں۔ وہ سرتا پا گندگی میں لتھڑ پتھڑ گئی ہے۔ اُس کی پیٹھ گالیوں کے کوڑوں کی ضربوں سے زخم زخم ہے۔ اور دم چاہتے ہوئے بھی نہیں نکل پا رہا۔ وہ خوف اور غلاظت کی بکل میں آج بھی کانپتی۔ خوف اُس کی نہاد میں بستا لیکن یہ اس کا محافظ عطاء اللہ کس قدر بے خوف نڈر۔ ایسی ہر رات وہ صنوبر کے دروازے پر بیٹھے گزار دیتا۔

صنوبر چڑنے لگی ''کیوں میری جان کے دشمن ہو گئے ہو۔ کیوں میرے لیے مصیبتیں کھڑی کرتے ہو۔ جاؤ اپنے ماں باپ کے پاس، عیش کرو۔ جاؤ اپنی امی کے پاس جا کر مجھے گالیاں دو۔ وہ خوش ہو جائیں گی۔ مجھے ڈر لگتا ہے اُس وقت سے جب وہ تمہیں بھی بددعائیں دینے لگیں گی۔ ماں کی بددعا آسمان چیر جاتی ہے، کبھی نہ لینا۔ بیٹوں کو ماں کی بددعا لگ جاتی ہے چاہے وہ دل سے نہ بھی دیں پھر بھی لگ جاتی ہے۔ یہ لڑکیاں ہیں ڈھیٹ جنہیں ماں کی بددعا بھی نہیں لگتی۔''

عطاء اللہ

اس کے اندر اپنی اہمیت کا اعتماد اور اپنے وجود کی مجبوری کی بے خوفی عمر سے بڑی دلیلوں میں ڈھل جاتی۔

”وہ کوئی نبی پیغمبر تھوڑی ہے۔ میں خدا کو بتاؤں گا کہ اللہ میاں جی! یہ سب جھوٹی بددعائیں دیتی ہے۔ پہلے افتخار بھائی کو آپ نے اس کی بددعائیں لگائیں پھر امتیاز کو اب میری سوہنو باجی کو نہ لگانا۔ الٹا اسی کو لگانا۔“

گالیوں کی غلاظت اور بددعاؤں کے بوجھ سے بھرے اس ماحول میں پتا نہیں اس کے لبوں پر یہ مسکراہٹ کسی انتقامی جذبے سے کھل جاتی۔ اس بچے کے سامنے اس کے والدین کمزور پڑ جاتے ہیں جس سے نسل چلنا ہوتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا وارث ہوتا تو اس کی یہ بدتمیزیاں کیا قابلِ برداشت ہوتیں۔ یہ محبت بھی کس قدر مطلبی ہے۔ کتنی مصلحتوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ لیکن یہ عطاء اللہ بنا کسی مصلحت کے اُس سے چپک گیا تھا۔ یوں کہ وہ مرتی تو وہ بھی مر جاتا۔

ایک روز اُس نے کہا:
”ابو جی نے بندوق پیٹی میں چھپا دی ہے مجھے بھی تو نشانہ پکا کرنا ہے۔“ آخر بڑے ملک صاحب کو اسے نشانہ سکھانے پر رضامند ہونا پڑا۔ لیکن اس نے عجب شرط رکھ دی۔ میری سوہنو باجی بھی نشانہ لگانا سیکھیں گی اور بڑے ملک صاحب کو اس پر بھی چند گولیاں ضائع کرنی پڑیں۔ اگرچہ اُسے پھر بھی نشانہ تو دور پستول لوڈ کرنا بھی نہ آیا۔ جب کہ عطاء اللہ چند دنوں میں پکا نشانچی بن گیا۔ اس گھر کی فضائیں حیران تو ہوتی ہوں گی کہ اس محبس خانے میں یہ کون آیا ہے جسے بولنے، ہنسنے، جھگڑنے، الٹا کر جواب دینے، بڑی بی بی جی کی ہلکی پھلکی گالیوں اور بددعاؤں کے بدلے بھاری بھرکم بددعائیں اور گالیاں دینے کا حوصلہ ہے۔ بعض اوقات اسے لگتا یہ افتخار کا بچپنا ہے وہ بچپنا جو خوف سے آزاد ہوتا تو ایسا ہی ہوتا۔ وہ افتخار کی جوانی دیکھنے کی منتظر تھی کہ خوف سے آزاد جوانی کیسی ہوگی۔ جو عطاء اللہ کی

صورت میں پروان چڑھ رہی تھی جس میں لگتا افتخار کی روح بسیرا کر گئی ہے۔

اپنی سوہنو باجی کو یونیورسٹی میں داخل کروانے کا اُس نے فیصلہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر معاملہ بگڑ گیا وہ لاہور سے واپسی پر کتابوں کی ڈگی بھر لایا۔ یہ تو پھر بھی قابلِ قبول تھا وہ تو ایسی جسارت کا مرتکب ٹھہرا تھا جس کی معافی ہرگز نہ تھی۔ بالکل اُسی معیار کے کپڑے اور اُتنی ہی تعداد میں جوڑے صنوبر کے لیے بھی لے کر آیا جو کپڑے اور جس تعداد میں جوڑے بڑی بی بی جی کے لیے لائے گئے۔

یعنی بڑی بی بی جی اور وہ یعنی صنوبر، کھولے کی وٹوانی دونوں ایک جیسے کپڑے پہنیں گی۔ صنوبر تو مقابلے کے قابل ہی نہ تھی۔ مقابلہ تو پڑا تھا۔ بڑے ملک صاحب سے یعنی اُن سے یہ سوچنے کا جرم بھی کیسے سرزد ہوا کہ بڑی بی بی جی کے مقابل کوئی دوسرا پہنے اوڑھے۔ وہ تو نوکرانیوں کو ہمیشہ فیشن کے الٹ کپڑے سلا کر دیتیں۔ کھلے پانچوں کے رواج میں تنگ پائنچے، تنگ کے دور میں کھلے۔ ظلم خدا کا کہ اُن کی یہ بے عزتی کروانے میں خود بڑے ملک صاحب کا ہاتھ تھا۔

صنوبر نے عطااللہ کی غیر موجودگی میں کسی نوکرانی کے ہاتھ وہ کپڑے لٹا دیے۔ لیکن یہ عمل تو جلتی پر تیل کا کام کر گیا۔

”نہ تیرے چوہڑی کے کپڑے میں سلاؤں گی۔ تیرے لیے آئی ہوئی کالک میں ملوں گی اپنے منہ پر۔ کپڑے تو یار نے لا دیے ہیں پر چوہڑی کو سجیں گے کیسے۔ اس کٹنک کو بھی لباس چاہیے۔ میں تو اپنے خصم کو دکھانے کو اوڑھتی پہنتی ہوں، تو کس یار کو دکھانے کے لیے منگائے گی جسے کسی مسلی نے بھی نہ پوچھا۔ کپڑے سجتے ہیں ہم جیسوں کو۔ جوانی ٹوٹ کے آئی تھی ہم پر۔ یہ سڈول بدن کہ قمیص کے بٹن بھی ٹوٹ ٹوٹ جاتے۔ یہ چاند پیشانی یہ قد اور مخمور آنکھیں۔ شرم سے مر جا بد بخت پر نہیں مرتی یہ کالک....“

صنوبر خود میں دفن ہو جاتی۔ یعنی جس طعنے کو سن کر اُس نے خود کو نچوڑ ڈالا تھا۔

بازوؤں میں سکیڑ سکیڑ کر اپنی ہی پسلیوں میں خود کو اُتار دیا تھا۔ جسم کی تجاوزات کو مسمار کرتے کرتے خود کو اپنے ہی چوکھٹے کے تابوت میں دفن کر دیا تھا۔ آج وہی مدفون طعنہ بن گیا تھا۔ صنوبر نے سنی ان سنی کو وتیرہ بنالیا تھا۔ کبھی کسی ضرورت کا تذکرہ نہ کیا تھا کبھی کلام نہ کیا تھا۔ جوتا ٹوٹ جاتا تو ننگے پیر پھرنے لگتی تو بڑی بی بی جی اپنا کوئی پرانا جوتا الار کر اس پر پھینکتیں جو سیدھا اُسے ضرب کرتا۔ ''گدھی ننگے پیر پھر رہی ہے۔ نہ شرم نہ حیا۔ جب چار زنانیاں اکٹھی ہوتی ہیں اسی وقت اس گدھی نے باہر نکلنا ہوتا ہے۔ بھئی بتائے کہ جوتا نہیں ہے اس کے پیر میں۔'' یعنی جوتا ٹوٹنے میں بھی اُس کی کسی بے حیائی کا عمل دخل تھا۔ وہ پرانا جوتا اُڑس لیتی جو کم از کم دو نمبر اس کے پیر سے بڑا ہوتا۔

کپڑوں کی مد تو سرے سے ہی کوئی نہ تھی۔ دو جوڑے پچھلے دس سال سے جب سے جسمانی تبدیلیاں مکمل ہوئیں تو نہ پھٹے نہ بدلے۔ نہ اُن کے چھوٹے ہونے کا ڈر تھا نہ تنگ ہونے کا۔ وہی دو جوڑے جن کی سلائیاں گھِس گھِس کر دھاگے نکل گئے تھے۔ رنگ اُڑ گئے تھے۔ بڑی بی بی جی کی تو سردی، گرمی دن اور رات کی الگ الگ پوشاکیں تھیں۔ اس کے یہی دو بوسیدہ جوڑے نائیلون کے کپڑے جو نہ کبھی پھٹیں نہ ہی جان چھٹے۔ گرمیوں میں پسینے اور گرمی دانوں سے لتھڑ پتھڑ جلد میں بلیڈ کی طرح دھنس جاتے اور سردیوں میں ٹھنڈے ٹھار جیسے برف کی پٹیاں لپٹی ہوں بدن پر۔

اب اکٹھے چار جوڑے وہ بھی بی بی جی کے جوڑوں کے ہم پلہ۔ اب جو لڑائی پڑی ہے تو مہینوں مغلظات اور بد دعاؤں کی آندھی جھلتی رہی ہے۔ اُنھیں دکھ بڑے ملک صاحب پر تھا کہ اُن کی رضا کے بغیر یہ پاگل کبھی خریداری نہ کر سکتا تھا۔ یعنی ملک صاحب جن کی سوچ صرف بی بی جی سے شروع ہوتی اور اُنہی پر ختم ہو جاتی تھی بیچ میں کبھی کوئی بیٹی بیٹا نہ آ سکا تھا اب اُن کی سوچ بے وفائی کی مرتکب ٹھہری تھی یعنی بی بی جی کے لیے کپڑے خریدتے ہوئے اُن کے دماغ میں صنوبر کا خیال بھی آیا۔ یعنی سوچ کی خیانت کے وہ مرتکب ٹھہرے

جس میں آج تک کسی اور کا گزر نہ ہوا تھا۔ تو اس سوچ کی یکتائی کے بیچ وہ کسی سوکن کی طرح در آئی۔ وہ گالی گلوچ جو اُس کی بلوغت کی طعنہ زنی سے شروع ہوا۔ پھر اس کے بر نہ آنے کی شرمندگی میں موڑ کھا گیا۔ اب اسے سوکن کا درجہ دے گیا تھا۔

اُس نے خود کو کمرے میں مقید کر لیا۔ اُس کے کانوں سے ٹکرانے والی غلیظ بھنبھناہٹ پھر بھی پردۂ سماعت کو چھیدتی رہتی جس کے مقابل عطاء اللہ کی جوابی سنگ باری جاری رہتی۔

''سڑ جل مڑ اور لا کر دوں گا اپنی چھونو آپی کو کپڑے۔ لاکھ لاکھ کا جوڑا لا کر دوں گا۔ تو سڑ۔ ابو نے بندوق پیٹی میں چھپا رکھی ہے ورنہ تو میرے ہاتھوں ایسے ہی مر چکی ہوتی جیسے تو نے افتخار بھائی کو مروایا۔''

لڑائی کا رخ تبدیل تو ہو جاتا لیکن اس پاگل لڑکے کو بھڑکانے اور ورغلانے کا الزام پھر اُسی پر آتا۔ گالیوں اور بددعاؤں کا ہدف پھر بھی وہی ہوتی چاہے پس منظر بدل چکا ہوتا۔ یہ لڑائی اُس وقت تو اپنے عروج پر پہنچ گئی جب وہ کپڑے سل کر بھی ساہیوال کے اُسی درزی سے آئے جن سے بڑی بی بی جی کے سل کر آتے تھے۔ اب اس سے بڑی گستاخی کوئی کیا کر سکتا تھا جو بظاہر تو عطاءاللہ کا فعل تھی لیکن بڑے ملک صاحب کی اشیر باد کے بغیر ممکن ہی نہ تھا۔ جن سے پوری دنیا لرزتی تھی پر خود وہ بڑی بی بی جی کی محبت میں بے بس۔ محبت کے شکنجے میں جکڑے۔ اس عشق کی مثالیں گیتوں میں پروی جاتیں ملکہ نور جہاں اور شہزادہ سلیم جیسی داستانِ محبت۔

اُس نے وہ کپڑے تن پر لگا کر بھی نہ دیکھے تھے۔ جو بنا ناپ کے جھولے مولے سل کر آئے تھے۔ جن میں اس کا کمزور ہیئت بدن جھولتا ہی رہتا۔ اگر پہن بھی لیتی تو نئے کپڑوں کی گھبراہٹ میں مر نہ جاتی۔ جیسے بدن پر کوئی کڑکی چڑھ گئی ہو۔ اُسے تو نئے کپڑے نئے جوتے پہنتے ہوئے بھی شرم آتی۔ اگر کبھی اچھی خوراک عطاء اللہ لے آتا تو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتی۔ یہ اچھی چیزیں اُس کے لیے نہ تھیں، اُنھیں چھونا بھی اسے حرام لگتا۔ وہ

چاہتی یہ سب اُس کے سامنے سے ہٹ جائے اُس سے پہلے کہ بی بی جی کی نظر ان پر پڑ جائے۔ وہ تو بچی ہوئی ریند کھوند کھانے کی عادی تھی اور خود کو وہیں منطبق کر لیا تھا۔ وہ اچھا سامنے ہونے کے باوجود سب سے بُرے کا انتخاب کرتی کہ شاید بڑی بی بی جی کے احساس برتری کو تسکین مل جائے اور وہ مغلظات سے آج کے روز تو بچ جائے۔

لیکن یہ عطاءاللہ تو درپے تھا اُسے بے عزت کروانے کو۔ روز شہر سے نئی نئی چیزیں، چرغے، ملک شیک، برگر، سینڈوچ اٹھا لاتا اور لا کر اس کے سامنے کھول دیتا اور اس وقت تک نہ کھاتا جب تک وہ چکھ نہ لیتی اور اس بھیانک جسارت پر ڈرتا بھی نہ تھا۔ خوف کا ناگ تو صنوبر کی آستینوں میں پلتا تھا۔ وہ ان چیزوں کو دھتکارتی رہتی۔ کبھی کوئی نوالہ ڈال بھی لیتی تو حلق سے اُترتا بھی نہ۔ گلے کے اندر حلق میں رڑ ہکتا رہتا اور وہ بہانے سے غسل خانے میں تھوک آتی۔

خوف کا ناگ جیسے ذائقہ بھی چوس گیا ہو۔ کسی بھی خوراک کا ذائقہ بلا خوف و خطر کھانے میں ہی ہے۔ اُس کے سارے ذائقے بدذائقہ ہو چکے تھے۔ بی بی جی کے کوسنے ذائقوں کو گناہ کے درجے تک آلودہ کر دیتے جیسے اُس کی بلوغت کا گناہ بر نہ ملنے کا گناہ اُسے آلودہ کر چکے تھے۔ علاقے کی چھوٹی موٹی زمیندارنیاں جب چاول، گڑ، شکر یا سبزی پھل اپنے کھیت کی کوئی بھی سوغات ہمراہ لے کر ملنے کو آتیں کیونکہ خالی ہاتھ آنا گویا اُنھیں بے عزتی محسوس ہوتا یہاں کی روایت ہی نہ تھی۔ تو صنوبر اُن کی موجودگی میں کبھی باہر نہ نکلتی اگر کبھی پہلے سے ہی غسل خانے میں ہوتی تو بھاگ کر اندر آنے تک اُن کی نظر اس پر پڑ جاتی۔

''ماشاءاللہ سوہنی تے سنکھڑی۔ پرنایا نہیں نیں کوئی جوڑ جوڑ وہاچا۔''

بڑی بی بی جی جس انداز میں تیوریاں چڑھاتیں وہ اپنی ہی بات کی کھوہ میں اُتر جاتیں۔

''اتنی کمزور ہے شادی کے تو قابل ہی نہیں۔''

بی بی جی کی اس رائے پر وہ فوراً پینترا بدلتیں۔

''جی ہاں جی چھوٹی ہے ابھی کل کی بالڑی ہے بیاہنے جوگی نہیں۔''

''بیاہ میں بھی کون سا سکھ رکھا ہے وہ بھی ہو جائے گا خیر صلا سے.... ٹائم آیا تو.... بابل کے ویہڑے والے عیش کہاں۔''

پر یہ چھوٹا سا مرد عطاء اللہ کہتا تھا۔

''ابو! سوہنو باجی کو یونیورسٹی میں داخل کروائیں یا پھر شادی کریں میں انھیں یوں ہر وقت روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔''

بڑے ملک صاحب جب یونیورسٹی کا ماحول دیکھنے گئے تو واپسی پر اسے اپنے پاس بلا کر کہا:

''میں یونیورسٹی میں گیا تھا تمہارا داخلہ وہاں ہوسکتا ہے مجھے بھی اعتراض نہیں ہے کیونکہ مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے۔ فیصلہ تم خود کرو گی۔ لیکن مجھے وہاں کا ماحول بالکل پسند نہیں آیا۔ دو لڑکے دو لڑکیاں کسی بینچ پر کوئی لڑکا لڑکی کسی کنج میں۔ لڑکے لڑکیوں کے ملے جلے گروہ ہلڑ بازی کرتے ہوئے لیکن تم چاہو تو میں اپنی روایات چھوڑ سکتا ہوں۔ میری از حد مخالفت کے باوجود تم بی اے پاس کر گئی۔ تو اس کا مطلب ہے کہ تمہاری لگن سچی ہے۔ میں تمھیں بھیج سکتا ہوں اگر تم چاہو تو....''

خوف کے قلبوت میں جکڑا اُس کا بدن لرزنے لگا۔ جیسے زخمی کبوتری صیاد کے روبرو.... عالمِ نزاع میں.... اس اہمیت اس قدر افزائی نے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ بدن کانپنے لگا۔ زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ لڑکوں میں پڑھے گی۔ اس کے تصور میں تو کسی مرد کی ہیت ہاتھ پیر شکل وصورت بھی کبھی نہ بنی تھی سوائے ہیولوں کے۔ وہ لوگوں کے بیچ کیسے جائے گی کھڑی کیسے ہوگی، بیٹھے گی کیسے، بولے گی کیسے۔ اس کے وجود کے سارے مسامون

سے دھواں چھٹنے لگا۔ گھبراہٹ میں ہاتھ پیر رعشہ زدہ ہو گئے۔ جیسے وہ یونیورسٹی کے لڑکوں کے بیچ گھر گئی ہو اور سمجھ نہ پا رہی ہو کہ کھڑی کیسے ہو۔ بیٹھے کیسے، بولے کیسے۔ لرزتے وجود کے ساتھ وہ ڈھ گئی۔ بڑی بی بی جی نے سنا تو چیختی چلاتی چڑھ آئیں۔

''ہائے قہر خدا کا یہ اب مردوں میں پڑھے گی تا کہ کسی کے ساتھ نکل جائے۔ ادھل جائے.... باپ کو دیکھو اپنی عزت کا جنازہ آپ اُٹھا کر دفنانے جا رہا ہے۔''

عطاء اللہ تڑپ کر اٹھا۔

''چپ کرتی ہے امی ڈھمی کہ میں پھر بولوں اپنی زبان میں.... یہ فیصلہ میری سوہنو آپی کریں گی تو کون ہوتی ہے بولنے والی خوامخواہ۔ جا جا کر نوکرانیوں سے لڑ سر مار۔''

بڑی بی بی جی کا فشارِ خون نسیں پھاڑنے لگا۔ دماغ کی بھی اور حلق کی بھی۔ بڑے ملک صاحب نے پیار بھری ڈانٹ پلائی۔ ''چپ کر اے عورت ہر ویلے کڑک کُکڑی بنی رہتی ہے۔'' بڑے ملک صاحب کی طرف داری تو انھیں یوں معلوم ہوتی تھی جیسے اُن کے اختلافی لفظوں میں کوئی سوکن بولتی ہو۔ اُنھوں نے پکی ہوئی ہانڈی اور آٹے کی بھری صحنک چلا کر ماری۔ جو صنوبر سے چند قدم دور گر کر پھوٹیں۔ عطاء اللہ تیورا کر اٹھا اور مقابل کھڑا ہو گیا۔ ملک صاحب نے ڈپٹ کر کہا:

''ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پر زبانیں بند کر کے بیٹھے۔ فیصلے کا اختیار میں نے لڑکی کو دیا ہے۔ اسی کا فیصلہ قبول کیا جائے گا۔''

ملک صاحب کی شخصیت میں در آنے والی تبدیلی بعض اوقات صنوبر کو ڈرا دیتی یعنی جسے کمرے کی کھڑکی کی جھیت سے گھر کے آنگن میں بھی جھانکنے کی اجازت نہ تھی۔ اُسے فیصلے کا اختیار دیا جا رہا تھا کہ وہ لاہور کی کسی مخلوط یونیورسٹی میں پڑھنے کو جا سکتی ہے۔ اُسے لگا جیسے اس فیصلے کا بوجھ اُس پر ڈال کر وہ سرخرو ہونا چاہتے ہیں۔ وہ فیصلہ جو اس کی ہمت اور استعداد سے کہیں بڑا کہ اُس کا حوصلہ جواب دے جائے۔ پر کٹی چڑیا کی اُڑان کے لیے

پنجرے کا در کھولنا کیا منافقت ہے۔ اُڑ بھی جائے تو کسی باز یا بلی کتے کا لقمہ بن جائے۔ اُس نے وہی فیصلہ دیا جو سب چاہتے تھے۔ اُس نے کہا:

''آپ ساری کتابیں تو لے آئے ہیں میں اپنی تعلیم پرائیویٹ ہی جاری رکھوں گی۔''

اس فیصلے پر عطاء اللہ خوشی سے اچھلنے لگا۔ ''میری چھونو باجی میرے پاس رہے گی۔ میرے ساتھ رہے گی۔ میں آپ کو بہت کتابیں لا کر دوں گا۔ ڈھیروں ڈھیر کتابیں۔ ہم مربعوں کی سیر کو جایا کریں گے۔ لاکھ لاکھ کا جوڑا لا کر دوں گا اور شہزادہ بھی ڈھونڈوں گا، ہم تاش بھی کھیلیں گے۔'' صنوبر کو لگا اُس پر.... سے ایک بوجھ اُتر گیا ہے کتنا سکون ہے۔ اس چاردیواری میں۔ انسانوں سے دور، مقابلے سے دور، بھیڑ میں تو وہ گھٹ کر مر جاتی۔ وہ چہکنے لگی۔ ''جاؤ میں نہیں کھیلتی، تم بے ایمانی کرتے ہو۔ ہمیشہ روند مارتے ہو۔'' حالانکہ وہ ایسا کچھ نہ کرتا تھا۔ وہ تاش کی مختلف کھیلوں میں بہت طاق تھا۔ بڑے ملک صاحب کو بھی ہرا دیتا۔ جب کبھی وہ گھر پر ہوتے تو وہ تاش کی گڈی پھینٹتے ہوئے پکارتا۔

''آ جائیں ابو ذرا تاش کی بازی ہو جائے۔''

اور وہ چلے آتے۔

''موٹو تم روند مارتے ہو۔''

''میں روند نہیں مارتا۔ آپ دونوں سے اچھا کھیلتا ہوں۔'' بڑی بی بی جی ہنگامہ کھڑا کر دیتیں۔ ''ظلم خدا کا باپ بیٹی سے تاش کھیل رہا ہے۔'' وہ چیختا۔

''چپ امی ڈھمی ایک لفظ نہیں۔ ورنہ میرا پتا ہے نا....''

اس گھر کی قدیمی فضائیں حیران تھیں۔ یہ کس نے جنم لیا ہے اس محبس خانے میں جو بولنے، ہنسنے، جھگڑنے جواب دینے، فیصلہ کرنے کی ہمت رکھتا ہے۔ بڑی بی بی جی جو بھی برا بھلا کہتیں اُسے الٹا دینے کی ہمت۔

"جو کچھ میری سوہنو آپی کو کہہ رہی ہو نا وہ سب کچھ تم خود ہو۔"

بڑی بی بی جی اُس کی سمت چھڑیاں جوتے اچھالتیں۔ وہ قہقہے لگاتے ہوئے واپس اُنہی کی سمت پھینکتا۔ بی بی جی کبھی کبھار کوئی دھپا مکا لگانے میں کامیاب ہو جاتیں۔ لیکن بددعائیں ابھی زیرِ زبان ہی تھیں۔ البتہ گالیوں کو اذنِ سفر مل چکا تھا۔ لیکن وہ ان گالیوں کو بھی الٹا کر پھینکنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔ بلکہ لگتا اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اپنے بڑے بہن بھائیوں کی طرح نہ گھٹ گھٹ روتا۔ نہ جلتا، کڑھتا، جیسے سمجھتا ہو یہ گالیاں محض دل لگی ہیں اور وہ جواباً زیادہ سنگین دل لگی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ بڑھاپے کی اولاد والی سبھی مراعات سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔

لیکن صنوبر تو بڑھتی عمر کے ساتھ اُسی رفتار سے ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ جسے کسی نے پوچھا تک نہ تھا تو یہ بھی اسی کا قصور تھا۔ وہ جسے پچھلے چھبیس ستائیس برس سے کبھی باہر کی ہوا نہ لگی تھی جو دو سال بعد امتحان دینے ساہیوال شہر جاتی بھی تو برقعے میں لپٹی پردوں والی گاڑی میں چھپی خود اپنے ہی وجود سے شرمندہ اپنی ہی ذات میں دھنستی۔ جسے خود اپنی ذات کے اثبات کی اجازت نہ تھی۔ اُسے کوئی دوسرا کیسے دریافت کر سکتا تھا۔ کسی کو کیسے اُس کی طلب کی ہمت ہو سکتی تھی۔ جس کا وجود چپ اور دکھ کی ایسی کھوہ بن چکا تھا۔ جس کے کھکھل پر حرفوں کے گونگے پرندے پر جھنکارتے تھے۔ کتابوں کے طوطا مینا جو عطاء اللہ کی عطا تھے۔ جو لکھے لفظوں کے ڈھیر جمع کرتا رہتا۔ کتابوں کی دنیا نے عجب استغنا بخش دیا تھا کہ اس کا انتظار انہی کتابوں میں مقید ہو گیا۔ اس کی خوشی طلب خواہش انہی کتابوں سے پھوٹتی اور دفن ہو جاتی۔ لیکن وہ حیران رہ گئی کہ اُس کی طلب کی جسارت پھر بھی کر لی کسی نے....

▪▪▪▪

ماسٹر اللہ دتہ

اُس کا خیال تھا کہ اُسے بھیک کی طرح مانگنے والے کی جھولی میں ڈال دیا جائے گا لیکن اُس پر کھلا وہ تو اصولوں اور معیاروں میں ناپی تولی جائے گی۔ وہ دھتکاری ہوئی بڑھی بھی بھاروزن والی ہو جائے گی۔ جب ماسٹر اللہ دتہ اپنے بیٹے اچھو کا رشتہ لے کر دست بستہ حاضر ہوگا تو وہ بڑے خاندان کی نایاب بیٹی بن جائے گی۔ جب کہ خود اچھو اب ملک اسلم بن چکا تھا۔ پورے پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان میں پہلی پوزیشن لے کر اے سی صاحب کہلانے لگا تھا۔ وہ پرائمری ٹیچر جو ایم اے انگریزی کر کے بھی باپ کی غیر حاضری کے دنوں میں عطاللہ کو ٹیوشن پڑھانے آتا تو اس انوکھے لاڈلے کی ہر بدتمیزی کو سہ بھی جاتا۔ لیکن شاید اندر ہی اندر کہیں یہ منصوبہ بھی اسی بدتمیزی نے بنوایا ہوگا کہ کسی روز یہاں اس طرح آئے گا کہ خود بڑے ملک صاحب اُٹھ کر اسے احترام دیں گے۔ خود ماسٹر اللہ دتہ جس نے عمر بھر اس خاندان کا نمک کھایا تھا۔ برابری والے بدلے کی خواہش کہیں تڑپ رہی ہوگی جو اسی خاندان کی ذات برادری سے ہونے کی وجہ سے بیٹے کے عہدے کو عزت

دلانے آ گیا تھا۔ حالانکہ وہ کسی بھی اچھے خاندان سے ناتا جوڑ سکتا تھا۔ لیکن کسی بڑے شہر میں یہ کون جان پاتا کہ اصل میں یہ ماسٹر اللہ دتہ ہے جو اس بڑے خاندان کا سمدھی بن گیا ہے۔ یہ عزت اور یہ نام مقام تو اسی علاقے کے اس بڑے زمیندار سے رشتہ جوڑ کر ہی مل سکتا تھا جہاں ماسٹر اللہ دتہ عمر بھر پرائمری سکولوں میں تبادلہ در تبادلہ کی صورت میں ایک اچھے استاد کے طور پر شناخت پاتا رہا۔ باہر کی دنیا میں ملک اسلم اے سی صاحب کو تو لوگ جانتے ہوں گے لیکن ماسٹر اللہ دتہ کو کون جانتا تھا کہ کیسی اچھی ساکھ والا استاد ہے۔ باہر کی دنیا میں تو بس اے سی صاحب کے باپ کے نام سے ہی متعارف ہو سکتا تھا۔ مقال تو پڑے گی کہ ماسٹر اللہ دتہ کے بیٹے کی شادی ملک صاحب کی صاحبزادی سے ہو رہی ہے۔ اے سی صاحب کو کون پوچھے اور باہر کی دنیا میں ملک صاحب کو کون جانے۔ یہ کیسی جسارت تھی کہ جس خاندان میں ایک کمی کمین کی حیثیت سے زیادہ پہچان نہ تھی وہاں برابری کا خواب بن لیا۔ ماسٹر اللہ دتہ کے ساتھ تو جو ہوا سو ہوا لیکن صنوبر کے گناہوں میں ایک ناکردہ گناہ مزید جڑ گیا۔

اب تو بڑی بی بی جی کی دھتکار کو ایک نیا رخ میسر آ گیا۔ ''ہائے ہائے تیرے جیسوں کو جینے کا حق ہے بھلا۔ شیشہ دیکھ کر مر جا کہیں۔ در فٹے منہ رشتہ بھی آیا تو ماسٹر اللہ دتے کے چھوکرے کا۔ اخے اے سی ہے تو کیا اوقات بدل گئی۔ مانگا بھی تو منگتوں نے۔''

اُس کے دکھ پہلے کیا کم تھے کہ ماسٹر اللہ دتے نے اپنی ناجائز فرمائش سے جینا ہی دوبھر کر دیا۔ کاش وہ ماسٹر اللہ دتے سے پوچھ سکتی کہ وہ بھی اُس کے دشمنوں کی صف میں سے ہے کیا۔ اس کا تو اپنا بدن بھی اس کے دشمنوں میں شامل ہے۔ وہی ماسٹر اللہ دتہ جس نے اُسے بھی بچپن میں حرف کی شناخت بخشی تھی جس سے جوڑ جوڑ ملاتی وہ ایم اے کر گئی تھی۔ وہی ماسٹر اللہ دتہ جس کی بیٹھک میں ملک افتخار نے ایک تعلیمی سال گزارا تھا کیونکہ سکول دور تھا اور روزانہ پہنچنا مشکل تو پے انگ گیسٹ کے طور پر افتخار نے آٹھویں کلاس کا وہیں رہ کر

امتحان دیا تھا۔ اور اس سال کو وہ اپنی زندگی کا بہترین اور پرسکون سال کہا کرتا تھا۔ جب اُسے گالیوں اور بددعاؤں سے نجات ملی تھی۔ وہی ماسٹر اللہ دتہ اتنی جرأت کیسے کر گیا۔ جو عطاءاللہ کو پڑھانے آتا تو اُس کی شرارتوں سے زچ ہو جاتا لیکن اس لاڈلے کی شکایت لگانے کا حوصلہ نہ ہوتا۔ نوکرانیاں ہنس ہنس کر دوہری ہوتیں اور عطاءاللہ کی شرارتوں کو دلچسپ کہانیوں کی طرح بڑی ملکانی صاحب کے حضور دہراتیں۔ ”آج نا چھوٹے ملک نے انڈے کے چھلکے ماسٹر اللہ دتے کی چائے میں ملا دیے۔“ قہقہے پیڑوں پر چوکبیں کرتے پرندوں کو اڑا دیتے۔ ”آج نا چھوٹے ملک نے سوڈے کی بوتل ماسٹر اللہ دتے کو لے جا دی کہ ماسٹر جی ٹھنڈی بوتل آپ کے لیے رکھی ہے جو وہ پینے لگا تو بوتل کالے موٹے کیڑوں سے بھری تھی۔“

بڑی بی بی جی بھی باوجود اپنی جبلی کرختگی کے ہنسی نہ روک سکتیں۔ ”آج نا چھوٹے ملک نے کرسی کی گدی میں کانٹے پرو دیے ماسٹر جو بیٹھا ہے تو غریب کے اگلے پچھلے سارے گناہ معاف ہو گئے۔“

ایسی شرارتوں پر چار کنال کے صحن میں کھچکلی پڑ جاتی۔ صنوبر اُس کے واپس آنے کا انتظار کرتی وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوتا پکڑ کر بری طرح پھینٹی لگاتی۔ وہ کان پکڑ کر ناک سے لکیریں نکال کر تائب ہوتا لیکن اگلے روز پھر اس کا آزاد رو دماغ کوئی نئی شرارت بن دیتا جیسے ماسٹر اللہ دتے کو ستا کر مزا آتا ہو۔ جیسے ہر اُس شخص کو ستا کر آتا ہے جس سے جواب کی کوئی توقع نہ ہو۔ کسی جوابی حملے کا خدشہ نہ ہو۔

وہ بھی معمول کا ایک دن تھا۔ صنوبر صبح سات بجے سے دوپہر بارہ ایک بجے تک اُسے ڈانٹ ڈپٹ کر پڑھاتی رہی۔ اگرچہ عطاءاللہ کو پڑھائی سے کوئی ایسی رغبت نہ تھی لیکن اپنی سوہنو آپی کو خوش کرنے کو وہ جی بھر کر رٹا لگاتا اور ساتویں کلاس میں ہی انگریزی بولنے اور لکھنے لگا تھا۔ صنوبر کی انگڑائی کا نکاس اُسی پر ہوتا اور پڑھائی کے دورانیہ میں ہی ہوتا۔

''بھول گئے پھر بھول گئے بد بخت! کل سارا دن تو سمجھاتی رہی ہوں۔ کتنی بار بتایا بتاؤ کتنی بار اُتنی ہی بار تھپڑ پڑیں گے۔ یہ املا کی غلطی یہ سپیلنگ کی غلطی۔''

وہ کپاس کی خشک چھڑی اُس پر توڑ دیتی۔ چپیڑوں سے منہ لال کر دیتی بڑی بی بی جی حال دہائی دیتی ہوئی اُس کی مدد کو پہنچتیں تو وہ انھیں باہر گید دیتا۔

''میری سوہنو آپی جو چاہیں کریں مجھے مار مار کر ختم بھی کر دیں تو بھی تمھیں امی ڈمی کو کوئی حق نہیں ہمارے بیچ آنے کا۔ یہ میری ماں ہیں تم نہیں۔''

''خاموش خبردار ایک بُرا لفظ بھی منہ سے نکالا دوبارہ کمرے میں نہیں آنے دوں گی۔''

یہ وہ دھمکی تھی جس کے خوف سے وہ بہت باتمیز ہو گیا تھا ورنہ وہ تو بڑے ملک صاحب کا بھی بڑا ملک صاحب تھا۔ وہ بھی اُس کی بدزبانی پر چپ سادھ لیتے اور صنوبر کو جھڑک کر کہتے۔

''کڑیے! اسے عقل سکھا بالکل پاگل ہوتا جا رہا ہے دیوانہ کہیں کا۔''

وہ اپنا کارگر ہتھیار استعمال کرتی۔

''جاؤ دفع ہو جاؤ میرے کمرے سے نکل جاؤ۔''

وہ منت ترلوں پر اُتر آتا، ہاتھ جوڑتا پیر پکڑتا اور آئندہ والدین سے بدتمیزی کرنے سے تائب ہوتا۔ وہ کہتی ناک سے لکیریں نکالو وہ نکالتا وہ کہتی کان پکڑ کر مرغا بنو وہ فی الفور بن جاتا۔ اس روز بھی ایسی کئی سزاؤں کے بعد وہ راضی ہوئی تھی اور اُس کی ضد پر وہ دونوں تاش کھیلنے لگے تھے۔ وہ بازی در بازی جیت رہا تھا۔ پس منظر میں بڑی بی بی جی کی گالیوں اور بددعاؤں کا سازینہ بجتا رہا۔ لیکن ان بددعاؤں کا منطقی انجام کوئی نہ تھا کیونکہ صنوبر تک ان بددعاؤں کو پہنچتے ہوئے شاید شرم آتی تھی۔ اُس تک موت کو پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی کیونکہ وہ لڑکی تھی۔ لڑکیاں کالکیں کبھی نہیں مرتیں، اُن تک کبھی کوئی بددعا نہیں

پہنچتی۔ اُن کو تو مخاطب ہی مر جانیے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی نہیں مرتیں۔ مرتے تو لڑکے ہیں جنھیں مخاطب ہی جیون جوگے کے خطاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ وہ پھر بھی مر جاتے ہیں۔ جس قدر گالیاں اور بددعائیں صنوبر کو عمر میں ملیں تھیں اُسے تو اُن کے ڈھیر تلے دب کر ہی مر جانا چاہیے تھا لیکن نہیں مری تھی زخمی چاہے کیسی ہوئی ہو اس سنگ زنی سے لیکن جانبر رہی تھی۔

اب ماسٹر اللہ دتے کی جسارت کا انقباض بھی وہ عطاء اللہ پر ہی انڈیل سکتی تھی۔ اس کے تو دماغ کی ہر حرکت ہر سوچ پر بھی گالیوں اور بددعاؤں کے کوڑے برستے تھے۔ وہ کوئی چوری چھپے خواب تک نہ بن سکتی تھی۔ وہ خواب جو کبھی پورے نہیں ہوتے لیکن ذہنی صحت کے لیے کتنے ضروری ہیں۔ اُسے تو نیند میں بھی کبھی کوئی سنہرا خواب نہ آیا جو بھی آیا سیاہ ہی آیا۔ ماسٹر اللہ دتے کے دکھائے خواب کی وہ تو جھوٹی تعبیر بھی نہ سوچ سکتی تھی۔

■■■■

سائے

دیوار کے سائے ڈھل آئے تھے۔ ڈھلے سائے میں چارپائی بچھی تھی۔ بالکل اسی جگہ جہاں کبھی صنوبر بیٹھی تھی اور کوئی نوکرانی اس کے بالوں میں تیل لگانے لگی تھی وہ اپنے بال نہ چھڑا سکی تھی اور فائر کی آواز سے بنیروں پر بیٹھے کبوتر فاختائیں سب اُڑ گئے تھے اور کوّے کاں کاں آسمان سیاہ کر گئے تھے۔ وہ آج بھی وہیں بیٹھی تھی جب ڈھلے سایوں میں نوکروں مزارعوں کے بچے عطاء اللہ کے ساتھ کھیلنے کو داخل ہوئے تھے اور وہ معمول کے مطابق اُن کے ساتھ کرکٹ کھیلنے لگا تھا۔ نوکر بچے اُسے بار بار آؤٹ کرتے لیکن وہ نہ مانتا اور انھیں ڈانٹ ڈپٹ کر دوبارہ باری لے لیتا۔

لڑکے شور مچاتے۔

''چھوٹے ملک صاحب! آپ پانچ دفعہ کیچ آؤٹ اور دو دفعہ ایلبیوڈبلیو ہو چکے ہیں۔''

لیکن وہ انھیں دھمکا کر پھر کھڑا ہو جاتا۔ آخر لڑکوں نے تنگ آ کر مشورہ دیا کہ لکن چھپائی کھیلتے ہیں۔ حویلی میں تو اس دھما چوکڑی کی اجازت نہ تھی۔ لڑکے صنوبر کے پاس آئے۔

''نکی بی بی جی! ہم نکے ملک صاحب کو باہر لے جائیں چھوتو چھوت کھیلنے کو۔''

''ہاں لے جاؤ۔''

اس کے پاس یہ اجازت نامہ کہاں سے آ گیا۔ اُسے اتنی ہمت کس نے دے دی کہ وہ فیصلہ صادر کردے۔ اپنی جرأتِ اظہار پر وہ حیران رہ گئی۔ وہ جو چھبیس ستائیس برس سے اپنے ہی وجود میں قلبوت ہے۔ یہ کون ہے جو گھس بیٹھیا ہے جو اجازت نامے مرحمت کر رہا ہے اور برسوں کے زنگ آلود قفل کو کھول رہا ہے۔

عطاء اللہ نے لڑکوں کی بات نہیں مانی۔

''سوہنو آپی کیا واقعی میں باہر چلا جاؤں۔''

''ہاں ہاں جاؤ۔ باہر کی دنیا بھی کبھی دیکھ لیا کرو۔ لڑکی بن رہے ہو دن رات گھر میں بیٹھے بیٹھے نہ کوئی سکول نہ کوئی کھیل کود۔''

عطاء اللہ، اللہ کی خاص عطا جس کی حفاظت میں سبھی مستعد رہتے۔ وہ سکول کبھی نہ گیا تھا۔ ایسا نہ ہو کہ دشمنوں کا وار وہاں چل جائے۔ جن انجانے دشمنوں نے پہلے حادثات کروائے اور اس خاندان کی وراثتوں پر حملہ آور ہوئے وہ دکھائی تھوڑی دیتے ہیں۔ اُسے باہر نکلنے کی اجازت نہ تھی مربعوں کی سیر کو بڑے ملک صاحب کے ساتھ ہی جا سکتا تھا۔ گھر کے باہر باڑے سے آگے نکلنے کی ممانعت تھی۔

وہ حیران پریشان کھڑا تھا۔

''چھونو آپی چلا جاؤں۔''

''میں کہہ رہی ہوں جاؤ۔''

''پر ابو نے منع کیا ہوا ہے انھوں نے باہر نکلنے سے روکا ہوا ہے۔'' نجانے وہ باہر جاتے ہوئے اتنا کیوں گھبرا رہا تھا۔ کبھی باہر نکلا نہ تھا کہ واقعی بڑے ملک صاحب کے حکم کی بجا آوری کہ کوئی اور شے روک رہی تھی۔ کہیں سے حکم نازل ہو رہا تھا قدم مت بڑھاؤ۔ واپس موڑ لو یہ قدم، لیکن اسے باہر دھکیلنے پر کون مصر تھا جو صنوبر کے وجود پر قابض تھا۔ وہ چلائی۔

"میں کہتی ہوں جاؤ دفع ہو جاؤ۔ چوبیس گھنٹے میرے گلے کا طوق بنے رہتے ہو۔"

پر سوہنو آپی ابو.....

"میں کہتی ہوں جاؤ جیسے ابو کی حکم عدولی تو تم نے کبھی نہ کی ہو نکلو گھر سے باہر اب بڑے ہو گئے ہو۔ گیارہ بارہ سال کے ہونے والے ہو۔ ابھی ابو کے چوچے بنے ہوئے ہو۔"

"ابو پوچھیں گے تو۔"

"تو کہہ دینا باہر کھیلنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اب جاتے ہو کہ دوں الٹے ہاتھ کی بزدل، ڈرپوک شرم کرو۔ جوان ہو رہے ہو، کب تک میری کچھڑ چڑھے رہو گے۔ کبھی مجھے بھی سکھ کا سانس لینے دیا کرو۔"

وہ اپنا سارا غصہ ہذیان ساری پراگندگی اُسی پر تو انڈیلتی تھی کہ وہ اس ساری بدکلامی، مغلظات اور بدزبانی کا کیتھارسس سہ جاتا تھا لیکن کبھی والدین کو شکایت نہ لگاتا۔ بلکہ کہتا۔

"جتنا چاہے مارلو گالیاں دے لو پر ناراض نہ ہونا چھونو آپی.... مجھے کمرے سے نہ نکالنا...."

وہ ناچاہتے ہوئے بھی جانے کو مڑا۔ قدم جیسے پیچھے کو کھینچتے ہوں۔ جیسے پیروں میں پڑی کوئی زنجیر ہو جو روکتی ہو۔ صنوبر نے چیخ کر پیچھے سے کہا:

"جاؤ دفع ہو جاؤ کم از کم دو گھنٹے واپس نہ لوٹنا۔ لڑکو! خبردار جو واپس لے کر آئے۔"

اُس کے جانے کے بعد اسے لگا وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اُس کا ساتھی اس کا دم ساز ہر پل اُس کی حفاظت میں مستعد کھڑا اس کا سپاہی چلا گیا ہے۔"

بڑی بی بی جی سہ پہر کی نیند لے کر اُٹھیں اور عطاء اللہ کو نہ پا کر پاگل سی ہو گئیں۔ نوکر پیچھے دوڑائے۔ جنھوں نے ساتھی لڑکوں کو گھروں میں جا پکڑا۔ وہ خوف سے کپکپاتے تھے اور زبانیں گنگ تھیں بتاتے بھی کیا کہانی تو بنا لکھے ختم ہو گئی تھی۔ عطاء اللہ جو گھر سے

کبھی نہ نکلا تھا۔ جس کا سکول بھی گھر میں لگتا تھا۔ اُسے باہر چلنا ہی کہاں آتا تھا۔ جب لڑکے اُس کے پیچھے پکڑنے کو لگے تو اُسے کیا معلوم تھا کہ شب کے ابتدائی سایوں میں لپٹے رستے میں ٹیوب ویل کا کنواں پڑتا ہے جو ننگا ہے جس پر چھت نہیں پڑی ہے۔ پیچھے بھاگتے ہوئے لڑکوں نے غڑاپ سے گرنے کی آواز سنی اور شب کی اوائل تاریکی میں کسی سائے کو دور بھاگتے ہوئے بھی دیکھا اور وہ ڈر کر گھروں کو بھاگ گئے۔ وہ تقدیر کا سایہ تھا جو گھر سے نکلتے ہی ہمراہ ہولیا تھا کوئی دشمن کہ خود صنوبر۔ جو عطاء اللہ کے کمزور ارادے کو بے طرح ڈانٹ رہی تھی۔ ''جاؤ دفع ہو جاؤ۔ سارا دن گھر میں گھس گھس کر لڑکی بن جاؤ گے۔ کبھی باہر بھی منہ دے لیا کرو۔ کہیں مرلیا کرو۔'' اُسے لگتا اُس کی زبان پر بی بی جی کے اثرات واضح ہوتے جا رہے ہیں۔

اُس روز بھی بڑے ملک صاحب کو ساہیوال کے رستے میں اطلاع ملی تھی۔ اُس روز بھی گاؤں سے دور بیاہی لڑکیاں آناً فاناً پہنچ گئی تھیں۔

فرق اتنا تھا کہ اب کی بار یہ ہڑپا ایسا اجڑا تھا کہ بڑی بی بی جی اور بڑے ملک صاحب کے مضبوط اعصاب کو بھی تڑخا گیا تھا۔ بڑے ملک صاحب تعزیت کے لیے آنے والوں کے بیچ یوں بیٹھے رہتے جیسے پوچھتے ہوں۔

''تم سارے کیوں آئے ہو۔ کس کی راکھ اڑانے کو بیٹھے ہو۔''

بڑی بی بی جی حیران تھیں کہ یہ کہہ کر کس کے لیے اٹھ جائیں۔

''نا تم ساری تو یہی چاہتی ہو کہ ہم سب مر جائیں پر ہم جئیں گے جو نقصان ہو گیا اللہ کی مرضی.... پر آگے نہ ہونے دیں گے۔''

اب کس نقصان کو ہونے سے وہ بچائیں گی۔ کون سا ایسا نقصان ہے جو اس کے بعد بھی ہو سکتا ہے۔ پوری رات ان ننھے منے ہاتھوں کی دستکیں دروازے پر سنائی دیتی تھیں اور لجاجت بھری آوازیں۔

"سوہنو آپی مجھے اندر آنے دیں۔ خدا کے لیے دروازہ کھولیں مجھے ڈر لگتا ہے۔ مجھ سے ناراض نہ ہوں میں مرجاؤں گا۔ مجھے بلالیں اپنے پاس چھونو باجی مجھے معاف کردیں۔ میں آئندہ وہی کروں گا جو آپ کہیں گی.... سوہنو باجی مجھے اپنے سے دور نہ کریں۔"

صنوبر کو لگتا اُس کے پیٹ میں اُس کا بچہ مرگیا ہے اور اب مردے کا زہر پورے بدن میں پھیل رہا ہے۔ عطاء اللہ کی پھولی ہوئی لاش کنویں سے نہیں اُس کے پیٹ میں سے رسی ڈال کر باہر نکالی گئی ہے اور اس کا خالی پیٹ لہو بھرے کنویں میں تبدیل ہوگیا ہے۔ اُسے مربعے پال گھوڑی یاد آئی جس کا بچہ مرگیا تھا تو وہ آنسوؤں سے روتی تھی اس نے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ اسے دق ہوگیا تھا اور آخر وہ مرگئی تھی۔ صنوبر کو لگتا اب اسے مرنے سے کوئی بچا نہ سکے گا۔ موت کی ساری دعائیں اب برہدف لگیں گی۔ وہ موت کے انتظار میں کتنی بے کار ہو گئی تھی۔ عطاء اللہ اُس کی ساری مصروفیات ہمراہ لے گیا تھا۔

■ ■ ■ ■

بڑے ملک صاحب

لیکن نہیں۔

موت کے انتظار میں بھی کسی مصروفیت کا بہلاوہ درکار ہوتا ہے۔ پھانسی کا مجرم بھی آخری رات نمازیں نپٹنے اور قرآن پڑھنے کی مصروفیت میں گزارتا ہے۔صنوبر کی نہاد میں خدمت لکھا تھا۔ اُس نے بڑے ملک صاحب کی نگہداشت کا فریضہ غیر محسوس طریقے سے سنبھال لیا۔شاید یہ خودغرض فطرت اپنے جینے کا جواز تلاش کر رہی تھی۔ اُن کے کھانے پینے، سونے جاگنے کا وہ پورا خیال رکھنے لگی۔ کہ اس خیال داری میں اس خدمت گزاری میں اپنے جینے کا جواز ڈھونڈنے لگی۔

عطااللہ کو گئے وہ ساتویں رات تھی۔ جب وہ دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔تو ملک صاحب سجدے میں تھے۔اُسے لگا وہ رو رہے ہیں۔

کیا بڑے ملک صاحب بھی رو سکتے ہیں۔ یہ فطرت کتنی ظالم ہے چاہے تو سمندروں کو ساحلوں ساحلوں رولا دے۔ چاہے تو پہاڑوں کو ریزہ ریزہ تڑخا دے۔اُس نے مری ہوئی آواز میں پکارا۔

''ابا جی جی۔''

صنوبر پر کھلا اس نے زندگی میں پہلی بار ''اباجی'' پکارا ہے۔شاید بڑے ملک صاحب نزخ کر بیچ میں سے اباجی نکل آئے ہیں۔ وہ سجدے سے اُٹھے تو اُن کے چہرے پر جیسے کسی دعا کی قبولیت والا رنگ تھا۔ جب بندے کا مکالمہ رب سے جڑ جائے۔تو ایک غازہ سا چہرے پر پھر جاتا ہے۔تمام فکروں، پریشانیوں، لوبھ غرض اور مستقبل کی منصوبہ بندی سے لاغرض محض اک احساسِ اطمینان، جیسے جلد کے اندر سنی کے پھولوں کے زردانوں کا ابٹن گھلا ہو۔جس نے جلد کی ساری تھکن ساری عمر رسیدگی ساری کرختگی چالا کی کا کڑوا گھونٹ بھر لیا ہواور نومولود کی سی جلد لیپ دی ہو۔

''تم پوچھوگی نہیں کہ جس باپ نے تین جوان بیٹے لحد میں اُتارے ہوں۔ وہ خود کس حال میں ہوگا۔''

صنوبر اُن کے قدموں کے پاس قالین پر جیسے ڈھ گئی اور گھگھی بندھ گئی۔

''تم ناراض ہوگی کہ افتخار کے ساتھ زیادتی ہوئی۔اُس وقت میری سوچ فرق تھی میں سمجھتا تھا کہ یوں سختی سے وہ پڑھے گا تو سنور جائے گا۔تم سوچتی ہوگی امتیاز کو میں نے پیار کے شکنجے میں کس کر ان توقعات میں اُسے گھونٹ دیا جو اُس کے بس میں نہیں تھیں۔ وہ مجھے خوشی دینے کے عوض دکھ دے گیا۔ وہ نادان میری ناجائز خواہشات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ میں سمجھتا تھا وہ پڑھائی میں طاق ہے۔میری ڈاکٹر نہ بننے کی حسرت کو پورا کرے گا۔

تم سوچتی ہوگی عطاءاللہ کو باہر کی ہوا نہ لگوا کر میں نے اُسے اس قابل بھی نہ چھوڑا کہ وہ خود سے چل سکے۔تاریکی کے خطرات کو بھانپ سکے۔میں اتنا خوفزدہ تھا کہ کہیں پھر ہونی نہ ہوجائے میں ہونی کے سبھی رستے بند کرتا رہا۔اُسے سکول تک نہ بھیجا لیکن تم نے اسے پڑھائی میں بہت طاق کردیا تھا۔سب کچھ منصوبے کے تحت چل رہا تھا کہ اچانک ہونی کو ہونے کا موقع دستیاب ہوگیا۔ جسے کبھی دن کی روشنی میں بھی باہر جھانکنے نہ دیا وہ شب کے سایوں میں ویرانوں کا ہم قدم ہوگیا۔''

صنوبر کا جی چاہا وہ چیخ کر کہے۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے ابا جی! وہ تو میں تھی جس نے زبردستی اُسے باہر بھیجا تھا۔ وہ میں تھی جو سب کو مرتے ہوئے دیکھتی رہی وہ میں تھی جس کے اندر تقدیر حلول کر گئی تھی۔ وہ میں تھی جو موت رنگ پہچان جاتی تھی۔ وہ میں تھی جس نے موت جیسی کمینی طاقت سے ٹاکرہ لگا لیا تھا۔

''نہیں ابو جی چھونو آپی نے نہیں بھیجا میں خود گیا تھا مجھے ہونی آپ آ کر لے گئی تھی۔''

پتا نہیں عطاء اللہ کہاں سے بولا تھا۔ صنوبر گھٹنوں پر ڈھ گئی سیاہ چادر میں لپٹی جیسے کوئی سوالیہ نشان سا.... بڑے ملک صاحب کو نیند کی گولی کی جیسے ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ غنودگی میں چلے گئے کہ غم کی بے ہوشی میں۔ اس نے انھیں دراز ہونے میں مدد دی۔

وہ تکیے کا سہارا لے کر تھوڑا سا اُٹھے۔ سر پلنگ کی ڈھو سے ٹکایا۔ جیسے کتبے پر بڑے ملک صاحب کی تصویر چھپ گئی ہو۔ زرد رنگت میں لپٹی ہڈیاں جیسے بھر بھری ہو گئی ہوں۔ جو چیخ پڑی ہوں۔ ریت اڑ رہی ہو۔ زرد دھول ہر سو پھیلی ہو۔ ''پتر ایک کام کرو گی۔''

''جی ابا جی۔''

وہ ہولا گئی۔ اُس کی زبان سے پہلی بار لفظ ابا جی بار بار ادا ہو رہا تھا۔ اس لفظ کی حسیت اس کے وجود میں کپکپا رہی تھی۔ اُسے لگا وہ کہیں گے الماری میں رکھا پستول نکالو۔ ایک گولی مجھے مارو اور دوسری خود کو.... یہ مت کہنا کہ چلانا نہیں آتا۔ عطاء اللہ کی ضد پر میں نے تمھیں سکھایا تو تھا۔ لیکن اُنھوں نے پلنگ کی ڈھو سے سر یوں لگایا جیسے جھول گیا ہو۔

''ہو سکے تو اپنے باپ کو معاف کر دینا بیٹا۔''

جس طرح وہ عمر میں پہلی بار ابا جی کہہ رہی تھی اسی طرح ان کی زبان سے بھی پہلی بار لفظ بیٹا ادا ہوا تھا اور معافی بھی، جن لفظوں کی ادائی پہلی بار ہو تو زبان ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔

''ہماری اپنی اپنی سچائیاں ہوتی ہیں تمھاری ماں کی بھی اپنی سچائیاں تھیں۔ وہی سب درست معلوم ہوتا ہے جو اُس وقت کی پیداوار ہوتا ہے۔ چاہے بعد میں وہ کتنا جھوٹ ثابت

ہو جائے۔ہم وقتی سچائیوں اور وقتی جھوٹ میں جیتے ہیں بیٹا۔''

وہ سسکتی ہوئی باہر بھاگی۔ وہ اباجی کی عالیشان عمارت کو یوں چٹختے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔یعنی اباجی بڑے ملک صاحب.... جب بڑے درخت عالیشان گنبد اور مینارے تڑخ کر گرتے ہیں تو اُن میں بسیرا کرنے والے پرندوں پر کیا گزرتی ہے۔صنوبر غلیظ ٹاکیوں کے بجھے سی صنوبر معافی دینے والے منصب پر تعینات ہونے سے پہلے شرم سے ڈوب نہ مرے گی۔

وہ بڑے ملک صاحب جن کی آواز سے اس کا پیشاب کئی بار خطا ہوا جن کے خوف سے افتخار گھر سے بھاگ جاتا تھا،نوکرانیاں کونوں کھدروں میں چھپتی رہتیں۔محض ایک آواز سے پورا گاؤں احترام میں کھڑا ہو جاتا وہی ملک صاحب جن کے فیصلوں پر پنچائتیں ہم آواز ہوتی تھیں اور ووٹوں کی مہریں اس نام پر ثبت ہوتیں جس اوران کی جنبشِ ابرو اشارہ کرتی، وہی بڑے ملک صاحب۔وہ سسکتی ہوئی کمرہ چھوڑ گئی۔اُس کی زبان سے تسلی تشفی کا ایک لفظ نہ نکلا۔نہ دعا نہ معافی۔اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ رضائی میں لپٹ گئی کہ آنسوؤں میں۔کمرے کے دروازے پر ننھے منھے ہاتھوں کی دستکیں تیز ہو گئیں۔

''دروازہ کھول دو چھونو آپی۔باہر سردی ہے اگر نہیں کھولو گی تو ٹھٹھر کے مرجاؤں گا۔ لیکن کسی دوسرے کمرے میں ہرگز نہ جاؤں گا۔'' اسے اپنے بدن پر برستی شاماں والی ڈانگیں دھڑ دھڑ سنائی دینے لگیں۔''صنوبر جی چائے کا کپ مل جائے گا؟ آپ بس....''اور پھر وہ الم اور کرب کی سیاہ چادر میں لپٹا ہوا مدقوق چہرہ،جس کی گردن فضاؤں میں ٹنگی رہتی تھی۔ہڑپا کی مورتیوں کے روبرو سربسجود ہونے کا گناہ سرزد ہو گیا تھا جس سے اور یہ گناہ اُس کی نہاد کو کھا گیا تھا۔

باری باری سبھی میتوں کے جنازے اس کے اندر پڑھے جانے لگے۔

وہ بینوں سے سبھی میتیں سجانے لگی۔سینہ،رانیں کوٹنے سر منہ پیٹنے لگی۔سارے ماتم

یکبارگی اس کے اندر برپا ہو گئے۔ روتے پیٹتے نجانے کب چار کنال صحن میں بھرے ماتم میں اس کا ماتم مدغم ہو گیا۔ تو چند لمحے غفلت میں پڑی رہی کہ وہ ابھی خواب والے ماتم کی زد میں ہی ہے۔ لیکن یہ تو تازہ دم عورتیں تھیں جن کے بینوں سے عرش لرز رہا تھا اور فرش دہل رہا تھا۔ ''ہائے وڈا ملک۔ آج بادشاہیاں لوٹیج گئیاں آج ریاستاں لاورثیاں رہیج گئیاں آج ملخ اجڑ گئے۔ آج پاکستان لٹ گیا۔ ہائے وڈا ملک ٹر گیا۔''

■■■■

ہڑپا فطرت

پیر جنڈی

پورے علاقے میں ہوک پڑ گئی۔ عمروں صدیوں سے بند زبانیں پٹ سے کھل گئیں۔ ''یہ خاندان کسی گناہ کی کڑی سزا میں جکڑا گیا ہے۔'' فطرت کے قانون کے مطابق اتنا سب کچھ یکبارگی کسی ایک کے ساتھ اُسی وقت ہوتا ہے جب خود قدرت اپنا وزن مخالف پلڑے میں لا دے۔ پھر سزا پانے والے خود اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے گناہوں کا شمار کرتے رہ جاتے ہیں۔

اس خاندان کے بزرگوں سے وابستہ عجیب وغریب گناہوں کی داستانیں پورے علاقے میں مشہور ہو گئیں جنھیں گمنام شاعروں نے ماہیوں اور ڈھولوں میں پرو دیا۔ عبرت اور کیے کی پکڑ پر ہر کوئی کانوں کی لویں چھو چھو کر مشہور داستانوں میں حسبِ توفیق مزید اضافہ کرنے لگا۔ اضافہ در اضافہ داستان طویل ہوتی چلی گئی۔

سب سے بڑی بددُعا تو پیر جنڈی کی لگی تھی جو دیہاتی عورتوں کی ہر دعا قبول کرتا۔ بے اولادوں کو اولاد بخشتا، بیماروں کو شفا اور عاشقوں کو معشوق سے ملاتا۔ سردیوں کی تاریک

راتوں میں سفید چغہ پہنے لالٹین اُٹھائے پانی کی باریاں باندھتے کسانوں کو پیر جنڈی والا بارہا دکھائی دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ جس جس کو دکھائی پڑنے کی شہادت ملی تھی وہ شہادت کو کسی دوسرے تک پہنچا دیتا اور یہ سلسلۂ شہادت اُن تک جا پہنچتا جو حیات نہ رہے تھے۔لیکن پیر جنڈی کے زندہ وجود کا یقین سبھی کو تھا جس کی حاجت روائی مثال تھی۔لیکن ملکوں کے ہاں نہ صرف اُس کا انکار کیا جاتا بلکہ مذاق اُڑایا جاتا، شرک گردانا جاتا۔ خود صنوبر کے سینے میں ایک خفیہ راز اُسے راتوں کو دیوانہ سا بناتا چلا آیا تھا۔ اُس وقت وہ سات برس کی تھی جب جنڈاں والے مربع ساگ توڑنے کو جانے والی ملازماؤں کے ہمراہ ہوگئی تھی۔ جنڈاں والا مربع اگرچہ فاصلے پر تھا لیکن اس مربع کی سرسوں، گنے، مولیاں، گاجریں، خربوزے، تربوز انتہا رسیلے اور شیریں کیونکہ وہ پیر جنڈی کی جوع سے تھے جس کی دُعا اور برکت نے اس زمین کی تاثیر ہی بدل دی تھی اور اس مٹی کو خاکِ شفا کا درجہ حاصل ہوگیا تھا۔ اس دھرتی کی مٹی عقیدتوں، ارادتوں، تابع فرمانیوں سے کس قدر مملو ہے۔ جبیں سجدے کو کوئی پتھر مانگتی ہے۔ ہر بدن خاکِ شفا میں گھل مل کر گل وگلزار بننا چاہتا ہے۔ ہر حلق آبِ شفا کا پیاسا تو پھر پتھر کو خدا، مٹی کو شفا، پانی کو چشمۂ حیواں بتانا کیا مشکل، یہ شرک اور وحدانیت کا سفر بھی تلوار کی دھار سا پلِ صراط۔ پتا نہیں کون سا قدم شرک میں لڑھک جائے۔

اتنی قبریں، اتنے اشجار، اتنے پتھر، مٹی، پیر بابے، بی بیاں، دم گنڈے، عرس مزار، خانقاہیں، گدیاں، بہشتی دروازے، کرامتیں، منتیں مرادیں۔ اک کمزور سے بندے کو کتنی مجسم ترغیبیں، گناہ ثواب، جنت جہنم۔ عقیدے کی بے شمار تعبیریں، تجسیمیں، یہی تعبیراتی عقیدہ جنڈی پیر کی روایت تھا جس کے روبرو ماتھا ٹیکنے سے ہر حاجت روائی ممکن، کتنا سستا سودا۔ نہ نمازوں کی پابندی نہ روزے کا کشٹ، نہ چلّے تسبیح، زکوٰۃ، حج کی ریاضت، بس ایک پیر جنڈی اور عقیدے کی پختگی۔ اُس دن بھی دونوں ملازمائیں گھرے گف جھنڈ کے چھتنارے میں گھستی چلی گئیں۔ چار کنال کے گھیرے میں کھڑے مرلہ بھر تنے کے سامنے

وہ دونوں گھٹنوں پر جھکیں اور سجدہ ریز ہوگئیں۔ ایک نے صنوبر کا ہاتھ پکڑ کر نیچے بٹھایا اور سجدے کا اشارہ کیا۔ وہ مرلہ بھر پھیلا ہوا تنا جس کے گرد نمک، گڑ، سکے اور سفید و سیاہ کوڑیاں بکھری تھیں جو کالے، لال، نیلے، پیلے دھاگوں اور کترنوں کی گرہوں میں جیسے بندھا تھا۔ منت کے اَن گنت دھاگوں، دھجیوں کے جال نے سارے چھتنارے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ ایسے ہی صنوبر کے دماغ کو بھی جکڑ لیا تھا۔ سجدہ ریز ہوتے ہی اُس سات برس کی بچی پر کھلا کہ وہ شرک کا شکار ہو چکی ہے۔ وہ سجدے سے اُٹھ کر باہر کی سمت بھاگی۔

کئی کنال کے گھیرے والے ٹہنوں، شاخوں، پتوں، جڑوں کو منت کے دھاگوں، کترنوں نے آکاس بیل کی مانند لپیٹ رکھا تھا جس کی گچ تاریکی میں پھیلی ٹھنڈی ٹھار چھاؤں میں وہ کپکپاتی تھی۔ وہ شرک کی مرتکب ہو چکی تھی، وہ کافر ہو گئی تھی، وہ عمر بھر کے لیے شرک کی بھول بھلیوں میں پھنس گئی تھی۔ جڑوں کے بٹے ہوئے رسوں کے تانے بانے اُسے جکڑ گئے تھے۔ زمین کو چومتی، جڑوں، شاخوں، ٹہنوں سے ٹکراتی، بعد مدت وہ باہر کا راستہ تلاش کر سکی تھی۔ گف چھاؤں کے اندھیارے میں اندھی بہری پیر جنڈی اپنی ڈاڑھیاں زمین پر ٹکائے یوں ساکن ایستادہ تھا جیسے درخت نہ ہو کوئی باریش بابا۔ جس کی گپھا میں چھپی ابھی تک دونوں ملازمائیں صنوبر سے بے خبر سجدہ ریز تھیں اور وہ شرک کا شکار بھی ہو چکی تھی۔ شاید اُسی کی سزا اب آ کر پہنچی تھی۔ اُس وقت تک امتیاز کا سر عجائب گھر کی مورتیوں کے سامنے نہ جھکا تھا اور وہ ابھی شرک کے واہمے سے دوچار نہ ہوا تھا۔

جب بڑے ملک صاحب نے امام مسجد کے اُکسانے پر جنڈی پیر کو جڑ سے کاٹ ڈالنے کا حکم دیا تو کئی نسلی اور قدیمی نوکر مزارعے زمینوں کی راکھی چھوڑ کر ترکِ مکانیت کر گئے۔ راتوں رات کہیں فرار ہو گئے۔ لیکن بڑے ملک صاحب کا فیصلہ نہ تبدیل ہوا۔ جس روز پیراں والا جنڈ کاٹا گیا گاؤں کے سارے کلہاڑے ٹوٹ گئے۔ کلہاڑوں کی دھاریں بنانے والے ترکھانوں کا ٹبر ایک پُراسرار بیماری کا شکار ہو گیا کہ وہ گھڑوں کے گھڑے پی

جاتے پر اُن کی پیاس نہ بجھتی۔ گاؤں کی کئی بھینسیں، بیل، گائے، بکریاں خود ہی نہر کا رُخ کر گئیں اور مردہ حالت میں تیرتی ہوئی پائی گئیں۔ پیر جنڈی کو کاٹنے کی جسارت کرنے والوں میں سے دو کی بینائی چلی گئی، دو کے مال ڈنگر مر گئے، دو کوڑھی ہو گئے۔ یہ الگ بات کہ ان سبھی داستانوں کے ثبوت کسی نے نہ دیکھنے چاہے تھے۔ محض سننے کی شہادتیں کافی تھیں جس کے سلسلے دراز تھے۔

اُس رات آندھیاں کسی بے گناہ کے قتل کا واویلا ڈالتی رہیں اور جنات بین کرتے رہے۔ جن کی آہ وزاری میں پیر جنڈاں والے اس گنہگار گاؤں پر غیظ وغضب کے ڈونگرے برساتے رہے اور سارے جھونپڑے، جھگیاں، زمین وآسمان اتھل پتھل کر دیے۔ کچھ نہ بگڑا تو ملکوں کی حویلی کا کچھ نہ بگڑا لیکن سزا تو تعاقب میں تھی۔ میاں کی بانگ کے ساتھ ہی عورتیں کٹے ہوئے تنے کے سامنے جا کر سجدہ ریز ہوئیں اور رو رو کر پہروں توبہ تائب ہوتی رہیں۔ لیکن ملکوں کے خاندان سے کوئی توبہ کرنے بھی نہ پہنچا۔ گمنام شاعروں نے اس اہم وقوعے کو اشعار میں پرو دیا اور اجتماعی معافی کے طلب گار ہوئے۔

دنوں میں کٹا ہوا درخت دوبارہ پھوٹ پڑا اور پہلے سے بھی زیادہ بیگھوں میں سایہ فگن ہو گیا۔ اس کے بعد ہی وہاں پیر جی کی قبر بھی بنا دی گئی۔ پیر جنڈی کی بجائے پیر صاحب کو پیر الحاج نورالدین کا باقاعدہ نام بھی دے دیا گیا اور سالانہ عرس بھی منعقد ہونے لگا۔

پیر جنڈی والے کا ٹھکانہ تو برباد نہ ہوا البتہ اُسے برباد کرنے کی کوشش کرنے والے نشانِ عبرت بنا دیے گئے۔ ملکوں کی تباہی کے بعد تو جنڈی پیر کی ایسی کرامتیں مشہور ہوئیں کہ منکر بھی سجدہ ریز ہو گئے۔

ان لوک گیتوں میں دوسرا واقعہ صنوبر کی پھوپھی نیک بیگم کی موت کا اسرار تھا جو اس خاندان کا ممکنہ گناہ ہو سکتا تھا۔ وہ گیارہ بارہ برس کی بچی جو ایک روز مربعوں کی سیر کو گئی تو کسی

چڑیل نے ہاتھ مار کر کلیجہ نکال لیا۔ اگلی صبح اُس کی موت کی خبر ہر کہیں لگی۔ لیکن قیاس آرائیاں بہت تھیں کہ بچی کو تشدد سے مار دیا گیا۔ اگرچہ غسل دینے والیوں نے گواہی دی کہ بینے پر چڑیل کے پنجے کا نیلا نشان موجود تھا لیکن موت پھر بھی معمہ ہی رہی۔ اب جا کر کہیں مہر تصدیق ثبت ہوئی کہ ساٹھ برس قبل اس خاندان میں سرزد ہونے والے بھیانک قتل کی سزا قدرت نے اپنے انصاف کے ترازو میں اب جا کر تلوائی ہے۔

صنوبر کو بعض اوقات لگتا، اصل میں نیک بیگم تو وہ خود ہے، اُس کے وجود میں اس خاندان کی بربادی والا زہر سرائیت کر گیا ہے۔ وہی تو ہے جو اس خاندان کو ملنے والی ہر سزا کو قبل از وقت جان جاتی ہے۔ اُسے موت رنگ دکھائی دے جاتا ہے۔ چہرے کی نسوں میں اُترتی زردی، خون کی نالیوں میں بہتی پیلی سرسوں، جلد کے بھیتر لپی ابٹن۔ جب موت سے پہلے مایوں بٹھایا جاتا ہے۔ گانا چڑھایا جاتا ہے تو اُسے اس رسم کی مہک آ جاتی ہے۔ سرسوں کے زرد تیل میں ملے ہلدی بیسن کی مہک جو کیسری نکھار دے جاتا ہے۔ عمر بھر کی کارستانیوں پر جیسے مشاطہ کا جادوئی ہاتھ پھر گیا ہو۔ پہلی رات کے دولہے دُلہن کا روپ چڑھ گیا ہو۔ تمام تر تفکرات عمر رسیدگی بیماری کسی الوہی روپ میں ملفوف ہو گئے ہوں۔ لیکن یہ سب اسی کو کیوں دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے سارے اس نظارے والی بینائی سے محروم کیوں ہو جاتے ہیں۔ آخر وہی اس لمحے کی گواہ کیوں بنا دی جاتی ہے۔

زردانوں سے بھری چہروں کی کٹوریاں حسن کی بسنتی مہک جو اُسے تیورا دیتی ہے۔ کسی دوسرے کو وہ خوشبو کیوں محسوس نہیں ہوتی۔

نظارہ تو یکساں ہوتا ہے لیکن دیکھنے کا عمل الگ الگ مناظر بنا دیتا ہے۔ کتنے خوش قسمت ہیں وہ جو وقوعے کے بعد کا منظر دیکھ پاتے ہیں۔ کتنی بدقسمت ہے وہ جسے وقوع سے پہلے نظر آنے لگتا ہے۔ کتنا اذیت ناک منصب ملا تھا۔ زوال کے اوراق موت کے لمحات پڑھنے کا منصب۔

ماضی کے سارے کھنڈر، سارے قبرستان، سارے ڈھنڈار، آنے والے کھنڈروں، قبرستانوں، ڈھنڈاروں کا زائچہ اپنے اپنے سینوں میں ملفوف رکھتے ہیں۔ تقدیر، موت، ویرانی، زوال اس لوحِ ازل کا ادراک آخر اُسے کیوں عطا ہو گیا ہے۔ وہ بھی کسی کھنڈر، کسی قبرستان، کسی ڈھنڈار میں قیام کرتی ہے کیا۔

اب کیا اُسے اپنی موت کی زردی کا تماشا کرنا باقی ہے۔ وہ دن میں کتنی بار شیشہ دیکھتی تھی۔ وہ کتنے ابٹن رنگ دیکھ چکی تھی لیکن اُس کے چہرے پر ابھی وہ سرسوں نہ کھلی تھی۔ بڑی بی بی جی کا چہرہ بھی ابھی زردانوں بھری کٹوری نہ بنا تھا یعنی زندگی ابھی باقی ہے۔ تو پھر بڑی بی بی جی چپ کیوں ہیں۔ اتنی گستاخیوں کے روبرو خاموش کیوں ہیں۔ جیسے سمجھ نہ پا رہی ہوں کہ جینے کے لیے کس ہدف کو ٹوہنی بنا کر اُٹھ کھڑی ہوں اور جھڑک کر کہیں: ”ہاں دیکھے ہیں تم جیسے نیکوکار جو ہمارے گناہ گنواتے ہو۔ خبردار! میں ابھی جیتی جاگتی ہوں، مری نہیں ہوں۔“ لیکن لگتا تھا بڑی بی بی جی کی زبان پر ایسے ہی تالے پڑ گئے ہیں جیسے صنوبر کی زبان پر عمر بھر پڑے رہے تھے۔ یہ قفل اک چھناکے سے اس وقت ٹوٹ گئے جب منشی اطلاع لایا کہ زمینوں کے کچھ نئے وارثین پٹواری اور تحصیل دار کو ہمراہ لے کر آئے ہیں کیونکہ اس بڑی زمین داری میں کوئی نرینہ وارث نہ بچا تھا اس لیے کچھ مرد وارثین کہیں سے آدھمکے ہیں جو کسی شرعی قانون کے تحت جائز حق دار ہیں۔

▪▪▪▪

ملک اکرم حسین، ملک صابر حسین

عجب قانون تھا، بڑی بی بی جی جو اس جاگیر کے سیاہ وسفید کی مالک تھیں انھیں محض آٹھواں حصہ ملا۔ صنوبر جسے پرانی ٹاکیوں پر بھی اختیار حاصل نہ تھا، آدھا حصہ اُس کے نام آیا اور آدھا حصہ اُن دو بھائیوں کے نام لگا جنھیں اس گاؤں نے ہی نہیں خود بڑی بی بی جی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ جنھوں نے اس پیچیدہ قانون جیسی ہی کسی پیچیدہ رشتہ داری کے حوالے سے بڑی بی بی جی کو ''تائی جی'' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اُس وقت بی بی جی کا جی چاہا تھا کہ یہ حویلی سارے ساز وسامان، ٹریکٹر، ٹرالیوں، مویشیوں، نوکر، مزارعوں سمیت اُٹھا کر اُن کے سر پر دے ماریں جن کے نیچے دب کر وہ مر جائیں۔ ''تائی جی ہم خواہ مخواہ تو ہیں پر زمینیں بانٹنے آئے ہیں۔ کیونکہ قانون کے کسی پیچیدہ نظام نے وراثت ہم تک پہنچا دی ہے۔''

اس ہیجانیت نے ڈھنڈاروں کی رونقیں دوبالا کر دیں۔ علاقے میں برپا ہلچل پر ڈھنڈاروں سے زیادہ علمی وتحقیقی ماحول کہیں میسر نہ تھا۔ جس محفل کی صدرِ نشیں بالی تھی۔ جس کے گرد زانو بچھائے کئی کانسٹیبل، پٹواری، بینکوں کے کیشیئر اپنی ماہرانہ رائے کے لیے موجود رہتے۔ ساری ہنگامہ خیز بحث کا نچوڑ ان جملوں میں پیش کرتے ہوئے: ''آخر تو زمینیں بے

وفا، ہرجائی، محلات کمزور مٹی، دولت آنی جانی، بس وہی اپنا جو کھالیا جو ہنڈالیا۔"

بالی سوڈے کی بوتل کا ڈاٹ اُڑاتی جھاگ پھڑ پھڑ بہتا، کانسٹیبل منہ کھول کر بالی کے ہاتھوں تلے چہرہ بچھا دیتا۔ سوڈے کے قطروں میں بھیگی مونچھیں چوستا۔ منہ سے پٹاخے چھوڑتا۔ منیر پٹواری ہنسی کا بوکا پیٹ کے کنویں میں بھر بھر انڈیلتا۔ جس نے ملکوں کی زمینوں کی تقسیم ڈالی تھی اور کانوں کی لویں چھوتا۔

"اللہ دشمن کو بھی اس انجام سے بچائے۔ کھانے کو بہت ہے پر کھانے والے نہیں رہے۔ رہنے کو بڑے مکان پر رہنے والے نہیں رہے۔ روپیہ، سونا بے پناہ پر برتنے والے نہیں رہے۔ اللہ اللہ پتا نہیں کہاں کہاں سے کتے بلے آ گئے منہ مارنے۔ سارا جمع جتھا کھلے کھاں ہوا۔ عجب نظارہ شبِ برأت کی آتش بازی جیسا۔"

چنی گوروں کے وفد کے ہمراہ اس چنڈال چوکڑی کے قریب سے اک وقار سے گزرتی، جیسے کائنات کے سارے اسرار اُس پر عیاں ہوں۔ سارے فلسفوں کی گرہیں کھول چکی ہو۔ "سر! دنیا کے ہر کھنڈر کی کہانی ایک ہی ہے۔ ہر تعمیر کی نہاد میں تخریب گھات لگائے بیٹھی ہے۔ اینٹوں نے بُھرنا ہے، ہڈیوں نے گلنا ہے، مٹی نے ہڑپنا ہے۔ پھر سے سطح زمین پر اُگانے کے لیے سب محفوظ کرنا ہے، جیسے طوفانِ نوح میں محفوظ کیا تھا۔ اصل میں کائنات کی حقیقت طوفانِ نوح ہے۔ سلسلہ در سلسلہ، آغاز اور انتہا، عروج اور زوال، پھر انتہا اور آغاز، زوال اور عروج اک زنجیر کی کڑیاں۔

جنڈ کے گھنیرے سائے تلے بچھی کرسیوں، چارپائیوں پر بیٹھے بالی اور اس کے عاشق قہقہے لگاتے ہوئے جیسے لوحِ ازل پر لکھی تقدیر پر ٹھٹھے کرتے ہوں۔ اگر کچھ بچتا ہے تو یہی ٹھٹھہ، اقتدار پر ٹھٹھہ۔ دولت پر، جاگیروں پر، طاقتوں پر، عجب گھن چکر تقدیر کا ٹھٹھہ۔

یہ دونوں بھائی اکو اور صابو ناموں کے یہ مخففات اُن کی سماجی حیثیت کے غماز تھے جو کہیں چٹیل پہاڑوں میں ذرا سے قطعہ اراضی پر مونگ پھلی اور باجرہ، مکئی اگاتے۔ اکو کسی

بینک کا گارڈ اور صابو کسی بس اڈے کا ہاکر، کتنی محدود سی پُرسکون زندگی۔ تقدیر نے بیٹھے بٹھائے مربعوں کا مالک بنا کر یکبارگی ہلچل مچا دی۔ یہ قانونِ فطرت بھی کس قدر ہیجان پسند ہے، عجوبے دکھاتا مداری، جس کے ہاتھوں میں یہ دنیا بچہ جمورا۔ چاہے تو دو ٹکڑے کر کے پھر زندہ کر دے، رومال کو کبوتر بنا دے، پھول کو چھتری۔ شعبدہ باز کہیں کی.... البتہ اس بندر بانٹ نے گالیوں اور بدُعاؤں کو نیا رُخ دے دیا تھا۔ صنوبر کو اک گونہ اطمینان ملا۔ بڑی بی بی جی کے لبوں کے قفل نا قابلِ برداشت تھے۔ جنھیں دن رات کی مصروفیت اس جائیداد کو واپس حاصل کرنے کے منصوبوں کی صورت میں میسر آ گئی۔ جیسے اسی ٹوہنی کی تلاش تھی جس نے المناک دکھوں کو ایک طرف دھکیل دیا۔ جائیدادوں کی تقسیم کسی بھی المناک موت سے زیادہ المناک موت، زمینوں کی موت، پیسوں زیوروں کی موت، موت صرف جان دار کو ہی تھوڑی آتی ہے، جو چھن گیا وہ مر ہی تو گیا۔ بڑی بی بی جی جو ایک دسترخوان کا پھاڑا جانا برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ ایک چارپائی کا ضیاع ممکن نہ تھا۔ المناک اموات میں بھی ایک آنکھ مسلسل نگرانی میں رہتی۔ کوئی شے ضائع تو نہیں ہو رہی۔ چینی، دودھ، پتی چائے میں زیادہ تو نہیں ڈالی جا رہی جو صفِ ماتم سے بھی گردن گھما گھما کر دیکھتیں کہ کام کرنے والیاں تو آٹھ جنیاں تھیں تو یہ نو کیوں کھا رہی ہیں۔ جو گڑ کی بھیلی میں سے بھی ذرا سی نکڑ بھور کر نوکروں کو چائے کے لیے بھجواتیں۔ ثابت بھیلی دیتے ہوئے بھی دل کو کچھ ہوتا۔ چاہے بُھری ہوئی نکڑ کا حصہ ضائع ہو جاتا لیکن سالم اور اچھی چیز کسی کو دینے کا حوصلہ نہ پڑتا۔ دینا ہی پڑ جاتی تو خراب کر کے دیتیں۔

کسی ملازمہ کے ہاتھ سے دودھ چھلک جاتا یا کپ گلاس گر کر ٹوٹ جاتا، گھونسوں لاتوں کے علاوہ یہ تاریخی واقعہ اُس کی آئندہ پوری زندگی کے گناہوں میں بار بار جتایا جاتا۔ اب یہ جائیدادوں کے بٹوارے کے لیے بھوکے ننگے کہاں سے آ گئے۔ اُن کے منہ پر کیا یہ جائیدادیں پڑتی ہیں۔ یہ قانونِ فطرت بھی بڑا رنگ باز عجب عجب تماشے لگا تا رہتا ہے۔

حد تو یہ کہ وہ کروڑوں روپے بھی بٹ گئے جو بینکوں میں مدتوں سے پڑے تھے، جو جائز ضروریات سے پہلوتہی کر کے بچائے گئے تھے۔ اگر معلوم ہوتا تو اُجاڑ نہ دیتیں۔ یہ حوادث نامعلومیت کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں تو ہی حادثہ کہلاتے ہیں۔

علاقے کے وہ لوگ جو اس خاندان کی تباہی پر محض اس لیے خوش تھے کہ ہوئے والوں کا لٹ جانا نہ ہوئے والوں کو خوامخواہ خوشی دیتا ہے۔ طبقات، تفریق، تقسیم کے نچلے گروہوں کا وہ بدلہ جو وہ خواہش کے باوجود نہیں لے سکتے لیکن بعض اوقات یہ کام اُن کی آسودگی کے لیے تقدیر اور فطرت خود کر دیتی ہے۔ ناقابلِ برداشت خوشی، لیکن وہ بھی ان اچانک مالکان کو برداشت نہ کر پا رہے تھے۔

پرانے خاندان کی ملکیت و حاکمیت کے تو وہ عادی تھے جو خاندانی اتم تھے۔ نسل در نسل حکمرانی کے عادی، اس لیے عادت کی طرح قابلِ قبول بھی۔ لیکن یہ نئے حاکم اور مالک تو انہی رعیت کے جیسے۔ خود سے اتم کی ملکیت تو قابلِ برداشت لیکن خود جیسوں کا اچانک حاکم بننا جچتا ہی نہیں۔ ملکیت اور حاکمیت بھی خانوادوں کو سوبھتی ہے، جن کے نسلی، سماجی تفوق کو رعیت قبول کر چکی ہوتی ہے۔ عادت بنا چکی ہوتی ہے۔ کسی نئی عادت کا پڑنا آسان نہیں ہے۔ یہی تو آزادی اور غلامی کا فلسفہ ہے۔ ورنہ آزادی کے لیے لڑنے والوں کو کبھی حاکمیت ملی۔ وہ تو پرانے حاکموں کی حاکمیت کو نئے حاکموں تک منتقل ہونے سے بچانے کے لیے لڑتے ہیں۔ اُنھیں تو ہر حال میں محکوم ہی رہنا ہے، اقتدار چاہے پرانے حاکموں کا ہو کہ نئے حاکموں کا لیکن وہ جانیں دیتے ہیں، لڑتے ہیں۔ پرانے حاکموں کی حاکمیت برقرار رکھنے کو یا پھر پرانے حاکموں سے چھین کر نئے حاکموں تک پہنچانے کے لیے۔ ہر انقلاب کی حقیقت یہی ہے۔

پورا علاقہ پرانے حاکموں کی حفاظت کے لیے سینہ سپر تھا۔ ملازم دن رات پہرے داری پر تعینات رہتے کیونکہ زنانہ حویلی سے متصل مردانہ حویلی میں یہ دونوں بھائی براجمان

ہو گئے تھے۔

زمین کی پرانی خصلت کہ ہرجائی ہے۔ اپنے مالکان بدلتی رہتی ہے لیکن اب والے مالکان کے تو ظرف کو بھی نہ دیکھا ٹھونس دیا بس۔ منہ چھوٹا تھا۔ نوالہ بہت بڑا تھا۔ نوالہ منہ کے برابر لانے کو ہاکر برادری اور چوکیدار برادری امڈ کر آئی۔

وہ اکو چوکیدار اور صابو ہاکر سے یکبارگی ملک صابر حسین اور ملک اکرم حسین ہو گئے۔ اتنے بڑے اور معتبر ناموں کا بوجھ اُن کے وجود سے کہیں بھاری تھا۔ اگر دولت وجود سے بھاری نہ ہو تو ترسیل کیسے ممکن ہو۔ جہاں برداشت جواب دے جاتی ہے وہاں کھیسے کھل جاتے ہیں۔

وہ روپوں کی گڈیاں تاش کے پتوں کی طرح پھینٹنے لگے اور سونے کے ٹھیسے فضاؤں میں اُچھالنے لگے۔ اُن کے بس میں ہوتا تو مربعوں کے ہار بنا کر گلوں میں پہن لیتے۔ مویشیوں کے ریوڑ، ٹریکٹر، ٹرالیاں، احاطوں اور گاڑیوں کو پہیے لگا فلوٹ بنا کر گھومتے۔ ہوئے کو چھپانا تو نہ ہوئے جیسا نا۔ پھر کون مانے کہ اکو اور صابو ملک اکرم حسین اور ملک صابر حسین ہو گئے ہیں۔

نوکروں مزارعوں نے نوکرانیوں کے ہاتھ پیغام بھجوائے: ''بڑی بی بی صاحب جی کو عرض گزارو، زمینیں جلد ہی ہماری ملکیت میں واپس آنے والی ہیں۔''

جس روز دولت اور لاکرز کی تقسیم ہوئی اُس رات مردانہ حویلی میں گاؤں کی تاریخ میں پہلی بار مجرا ہوا۔ شرابوں کے ڈاٹ کھلتے اور ناچنیاں دونوں بھائیوں کے سروں پر سے گھما کر جام پلاتیں۔ دونوں بھائی بدلے میں نوٹوں کی گڈیاں وارتے اور فضا میں گہنے اُچھالتے۔ اُس رات کئی گڈیاں اور زیورات غائب بھی ہوئے۔ دونوں بھائی جب دن ڈھلے ہوش وحواس میں لوٹے تو ایک دوسرے پر چوری کے الزامات لگانے لگے۔ دور دراز سے یکبارگی ازدحام کر جانے والے دوستوں، رشتہ داروں نے دلاسہ دیا۔

کیوں گھبراتے ہو ملکو! ابھی تو گوڑھے سے پہلی پہلی پونی چھٹی ہے۔ ابھی تو کئی احاطے، حویلیاں، مویشی، تیار فصلیں منتظر کھڑے ہیں۔ چھپڑ پھاڑ کے رب نے تمھیں دیا ہے، کیوں غریبوں کی طرح سوچتے ہو۔ اگر خدا نے امیر کر دیا ہے تو امیروں کی طرح جیو کہ کوئی کہہ نہ سکے کہ ملک اکرم، ملک صابر کبھی اکو اور صابو بھی رہے ہیں۔ یہ لاکھ دو لاکھ، بر کی دو بر کی، ملکیتوں کا صدقہ اُتر گیا۔ اس غریب غربا سوچ کو نوچ کر پھینک دو ورنہ علاقے کے امیر تمھیں کبھی خود میں گھسنے نہ دیں گے۔ اپنی امارتیں ذرا شو کرو ملکو! کہ پتا چلے علاقے کو نئے رئیس ملے ہیں۔"

....

ڈھنڈاروں کے ڈھابے پر پہلے ملک اکو پہنچا اور کسی تنی بالی کی چوٹ کھا کر تڑپنے لگا۔ ناز و اَدا گلے کا طوق بن گھونٹنے لگے۔ سنگِ مرمر کی مورتی آنکھوں میں دندناتی ہوئی پتھر ہو گئی۔ نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کے زیورات فضا میں اُچھالتے ہوئے بالی کا ریٹ پوچھ لیا۔

بالی سینہ اَکڑا کر اُٹھی، شفون کی گلابی قمیص مسک گئی۔ شموز کی لال رنگ، تلے موتیوں سے بجی بنیان جھلکیں مارنے لگی۔ خوشابی کھسّہ پیر سے اُڑا اور نوٹوں کی گڈیوں کے ہمراہ اُڑتا ہوا ملک اچھو کی جھولی میں آن پڑا۔ "اوئے چھوٹے!" "ذرا پولا اُٹھا کے لا نکے۔"

گھنے جنڈ میں چھپے پکھیرو چہکنے لگے، کوئل کو کنے لگی، جیسے سبھی بالی کے ہمنوا ہوں۔ ملک اکو باچھوں سے رالیں ٹپکاتا کُھرلی میں بھڑاونڈا بے تحاشا چرنے لگا اور بالی کے جڑاؤ کھسے کو چومنے لگا۔ بالی پھر کڑکی: "اوئے چھوٹے ذرا لا پولا لا، بگھیاڑ کے منہ سے چھین کر لا۔"

تبھی ملک صابو ہاکر برادری کے ہمراہ ڈھابے پر پہنچا۔ ہری کنی والی لال لنگی خوشابی کھسے کی چڑ چڑاہٹ میں پیروں تلے گھستی تھی۔ پانچوں انگلیوں میں فیروزے، عقیق، نیلم اور

رو بلی جگتے تھے۔ گلے میں سونے کا کنٹھا بجتا تو یار، بیلیوں کے خوشامدی قہقہے ہمراہ بجتے۔
چند دنوں میں ہی گوشت اور رنگ بھر گئے تھے امارت غرور بن ڈکراتی تھی۔
''اوئے چھوٹے! جو کچھ تیرے ڈھابے میں ہے سب ڈھیر کر دے بالی کے قدموں میں اور بل ملک صابر حسین کے حساب میں ڈال جو یاروں کا یار ہے، جو دل کا شہنشاہ ہے، حوصلے کا حاتم طائی ہے۔ جو خرچ بنا گنے کرتا ہے۔ جس کا بٹوا یاروں بیلیوں کے پاس رہتا ہے۔''لونڈے لپاڑے جیسے منادی سناتے ہوں۔ ملک اکو صابو پر جھپٹا۔
''اوئے شوہدے کمینے! پہلے میں نے آرڈر کیا ہے۔ آرڈر پر آرڈر کر کے چڑھی مار رہا ہے وہ بھی ایک کنجری کے لیے۔ اپنے بڑے بھائی پر چڑھی مار رہا ہے۔''
ملک صابو بھنبھنا کر حملہ آور ہوا اور بڑے بھائی کی گردن دبوچ لی۔ کرتے کی طلائی زنجیر جھنجھنائی۔ بازو کا وزنی کڑا کھڑکا۔ ''تو کب سے بڑا ہو گیا؟ کیا تو زیادہ جائیدادوں کا مالک ہے؟ زیادہ دولت ہے تیرے پاس، زیادہ نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کے ٹھپے؟''
صابو نے نوٹوں کی گڈی پھینٹ کر فضا میں اُڑا دی۔ چرواہے، بھیک منگے، گارڈ تماشبین امڈ کر آئے۔ بالی اُٹھی تو جیسے دھکا کھا کر بھیڑ کا دائرہ اور نزدیک آ گیا۔
''ملکو! بالی کے لیے کیوں لڑتے ہو۔ گاؤں کی شاملات جیسی بالی۔ دونوں اپنے اپنے ریوڑ چراؤنا۔ مویشی چراگاہ پر بھی کبھی جھگڑے ہیں، گھاس سے مطلب رکھو۔'' ملک اکو نے گردن چھڑائی اور ہونکتے ہوئے سینے پر ہاتھ مارا۔
''بالی نہیں تُو آج ایک فیصلہ کرے گی، ہم دونوں میں سے ایک کا انتخاب کر۔ تجھے کسی ایک کی ہو کر رہنا پڑے گا، فیصلہ تیرا ہے۔ اگر اس کے حق میں ہے تو آج سے تو میری بھابھی مجھ پر حرام۔ اگر فیصلہ میرے حق میں ہے تو چل میرے ساتھ حویلی میں چل کے بیٹھ۔''

بھیڑ مزید گھنی ہو گئی۔ تماشا مزید گھمبیر ہو گیا۔ سیکڑوں سینے سانس سے بوجھل تھے۔ منصف کے فیصلے کے منتظر سارے دل یک صدا ہو گئے تھے۔ بالی نے تلے موتیوں سے

جڑاؤ کھسہ اُتار کر دونوں پیر کرسی پر سمیٹے۔ بھاری سیاہ بالوں کی ناگن گت لہرا کر سونٹا سا برسایا۔ بھیڑ یکبارگی ایک قدم پیچھے سمٹی۔ ملک صابو ناگن گت کی ضرب سہلا رہا تھا کہ ملک اکو نے آخری داؤ چل دیا۔

''میں نکاح کرتا ہوں تم سے، آج سے تم شاملات نہیں میری عزت ہو۔ صرف ملک اکرم حسین کی عزت۔ آج سے جو آنکھ دیکھے پھوڑ دوں، جو منہ رالیں کیرے وہ پھاڑ دوں۔''

بالی نے سوڈے کی بوتل ایک سانس میں چڑھائی اور خالی بوتل فضا میں اُچھال دی جو سیدھی کسی چھوٹے کے ہاتھوں میں آئی۔ وہ بوتل میں زبان گھما کر سطح پر چپکے چند قطرے چاٹنے لگا۔ پورا مجمع بوتل کے پیندے میں ہونکتا تھا جیسے خوفزدہ ہو کہ بالی کا جواب کہیں ہاں میں نہ آ جائے۔ اگر ہاں میں آ گیا تو جُھنڈ خالی ہو جائے گا۔ لالیاں، گھگیاں، چڑیاں، طوطے، کبوتر سبھی اپنے گھونسلے اُٹھا لے جائیں گے۔ کوئل کو کنا چھوڑ دے گی۔ کنالوں میں پھیلے جنڈ کے سائے سمٹ جائیں گے۔ ڈھابا اُجڑ جائے گا اور ڈھنڈار ویران ہو جائیں گے۔ پانچ ہزار قبل مسیح کی وہ عورت جو سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی ہے اُس کی زندہ شبیہ کیا عجائب گھر کی الماریوں میں بند ہو جائے گی۔ جہاں کئی پہلے ہی حنوط شدہ پڑی ہیں، ایک زندہ عورت حنوطی الماری میں۔ مشترکہ دُکھ نے مجمع کو گنگ کر دیا۔

آخر کار وقت کے منصف نے سکوت کی اک صدی بعد فیصلہ صادر کیا۔

''یہ بات ہے تو ملکو! تم آپس میں فیصلہ کر لو۔ جو میرے نام آدھ مربع زمین کا لگوائے گا میں اُسی کی پابند ہو جاؤں گی۔''

مجمع نے کھل کر سانس لیا، بھلا بالی کو کوئی آدھ مربع زمین کے عوض کیوں خریدے گا جس کا ریٹ سو پچاس ہے۔ مندے کے دنوں میں تو دس بیس۔ کبھی تو صرف سوڈے کی بوتل یا دودھ پتی کا پیالہ.....

بالی کی عقل مندی پر بھیڑ نے بکرے بلائے اور دونوں پہلوانوں کو ہلاشیری دی جیسے

اُن کی ہزیمت کا مزا اُٹھاتے ہوں۔ یعنی سانپ بھی مر گیا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹی۔
''اوئے چھوٹے! ذرا لا جلیبی کا تھال من مرضی کی اُٹھاؤں گی۔'' بالی جیسے اپنی چال سے مدمقابل کو چت کر چکی تھی اور جیت کا جشن مجمع مل کر منا تا تھا۔ دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کو حریفانہ نگاہوں سے دیکھا جیسے دونوں کا کتا ریس میں لگا ہو، دونوں کتے برابر بھاگ رہے ہوں، اب جیت کے پوائنٹ کو دیکھو کون پہلے چھوتا ہے۔ دونوں اپنے اپنے کتے کی جیت کے تذبذب میں کچھ دیر ہونکتے رہے۔
آخر بڑے بھائی نے فائر داغ دیا۔
''مجھے قبول ہے۔ ہاتھ رکھ کس مربعے پر رکھتی ہے۔'' ملک اکو سینے پر ہاتھ رکھ کر چاروں اطراف گھوما، جیسے مجمع سے داد وصول کرنا چاہتا ہو لیکن مجمع کو یکبارگی سانپ سونگھ گیا تھا۔ نگاہیں بالی کے لبوں پر جمی رہ گئیں۔ جیسے یہ گلابی تر و تازہ خوبصورت لب کوئی صور پھونکنے والے ہوں۔ یکبارگی یہ ہونٹ یوں کھلے جیسے وہ پٹ سے سوڈے کی بوتل کا ڈاٹ اُڑاتی تھی۔ ''روڑوں والا پکا مربع۔'' بالی نے سرخی لگے ہونٹوں کی لالی چوس ڈالی۔ دانت کی تیز نوک پر لہو کا قطرہ سا تھرتھرایا۔
''چل تیرا ہوا۔'' ملک اکو نے سینے پر دھڑ دھڑ تین بار ہاتھ مارا۔ مجمع کا اجتماعی دل اس دھمک میں ڈوب گیا۔
''چل اُٹھ اب میرے ساتھ حویلی میں چل۔''
ملک اکو نوٹوں کی گڈیاں اور سونے کے ٹھپے فضا میں اُچھال اُچھال چھینے لگا۔
''نہ ملکا! بالی دس سال ڈھنڈاروں میں بیٹھ کر کھیہ نہیں اُڑاتی رہی، پہلے اشٹام لکھ، پکا اشٹام۔'' بالی دونوں جوتے پہن کر زرد چنری میں سمٹ گئی جیسے کٹوری میں پھول، ملک صابو مار کھائے زخمی کتے کی طرح جب دم دبا کر ہا کر برادری کے دائرے میں منہ چھپا کر ڈھنڈار چھوڑ رہا تھا تو خلقت ''ملک اکو زندہ باد'' کے ڈھنڈار شکن نعرے لگا رہی تھی جیسے ملک اکو کے

کتے نے ریس جیت لی ہو۔ کبوتروں نے بازی مار لی ہو۔ بٹیروں نے چونچیں مار مار کر حریفوں کے سر پھوڑ دیے ہوں۔

تماشائیوں کی بھیڑ میں سے منیر پٹواری بھی نکل آیا تھا اپنے کھاتوں سمیت، یا کوئی بلا لایا تھا۔ بس چند ثانیوں میں بالی ڈھنڈاروں والی، بالی کنجری جو آپ خود کو کنجری کہتی تھی وہ ایک جھٹکے میں اقبال بیگم زمیندارنی ہوگئی۔ جیسے صابو اور اکو ایک جھٹکے میں ملک صابر حسین اور ملک اکرم حسین ہو گئے تھے۔

اسی سرعت سے گڑوی والیاں، ہیجڑے، میراثی بھانڈ ودھائیاں دیتے کہیں آثاروں کے ٹیلوں میں سے برآمد ہو گئے کہ عجائب گھر کی مورتیوں میں روح پڑ گئی تھی۔ بالی نے زرد دوپٹے کا گھونگھٹ بنالیا تھا۔ امام مسجد بھی پتا نہیں دودھ پتی کے انتظار میں وہیں بیٹھا تھا کہ اُسے بھی لپک کر کوئی بلا لایا تھا۔

خلقت بالی کے نقصان کو بھلا کر تماشے کی ہیجانیت کا شکار تھی جیسے سفید رومال کبوتر میں تبدیل ہو گیا ہو اور وہ وقوعے کی حیرت اور شدت سے گواہی کی اہمیت میں مُجمّد ہو گئے ہوں۔ بالی نے شرما شرما کر ''قبول ہے، قبول ہے'' دہرایا تو جیسے ان الفاظ نے سارا کنجر پنا چوس لیا۔ نکاح کے رجسٹر پر بالی اقبال بیگم لکھی گئی تو اقبال بیگم کا احترام سب پر واجب ہو گیا۔ چار دیواری، پردہ، یکتا شوہر، نکاحی بیوی کی ساری حدود اور شرمیں لاگو ہوگئیں۔ نکاح کے معاہدے نے حد فاصل کھینچ دی۔ وہ جملہ بازی، وہ ہنسی، ٹھٹھول، وہ دھول دھپا، آثاروں کے غولِ بیابانی میں کہیں، بین کے لحن میں گونجتے رہ گئے۔

ڈھنڈاروں کی واحد لیڈی گارڈ چناں کو تو بہت دیر میں معلوم ہوا۔ بروقت پتا چلتا تو شاید بالی اور اقبال بیگم کے بیچ حائل ہونے کی کوشش کرتی، بالی کو یاد دلاتی۔ بالی تو آپ ہی کہتی تھی:

''ایک مرد کی غلامی سے سو مردوں کی مختاری بھلی۔''

اُس نے بالی کو گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانکا اور افسوس سے سر ہلایا، جیسے کہتی ہو: بکی تو آج ہے تو بالی، پہلے تو دکاندار تھی۔ آڑھتی تھی، سوداگر تھی، جنس تو آج بنی ہے۔ ساری آزادیاں ساری زبان طرازیاں، ساری خوبصورتیاں اس زمین کے ٹکڑے میں دفن کر دیں تو نے، وہ زمین جو کبھی کسی کی نہ ہوئی۔ ہرجائی خود اپنی ذات میں طوائف کی فطرت رکھنے والی، تو اس بے وفا، ہرجائی کی شرط پر باوفا اور یکتائی ہوگئی۔

ٹکٹ کے لیے قطاریں بنائے کھڑے افراد اس دُلہن کو حیرت سے تکتے تھے، جیسے اصل میں اسی کے دیکھنے کو بھیڑ لگی ہو، جو اس زرد گھونگھٹ میں سے کنج کنواری سی نکل آئی ہو۔ پہلی پہلی سہاگ رات منانے کو حجلۂ عروسی میں پہلے پہلے دولہے کی منتظر نئی دُلہن، جیسے کہتی ہو:

''میں کنجری پیدا تھوڑی ہوئی تھی، انہی مردوں نے بنایا کہ انھیں اپنی بیویوں کے بدبودار سانسوں کے بیچ بیچ خوشبودار سانسوں کی ازحد ضرورت ہوتی ہے۔ آج انہی میں سے ایک ان خوشبودار سانسوں کو بدبو کا اعتبار بخش رہا ہے۔

یہ روپ تو نرا جوگی والا پھیرا آج ہے کل نہیں۔ کب خوشبودار سانس بدبودار ہو جائیں، کب بدن کی جوان مہک عمر کی ہمک میں تبدیل ہو جائے۔ اگر بالی عزت کے بچھو سے ڈسی جائے تو اقبال بیگم عزت داروں سے کفن دفن حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، تو سودا اچھا ہے۔''

بالی جس کی چیرویں آنکھوں کے شربت ابھی بھی ٹپکتے تھے، جس کی ستواں ناک کا بلاک جھنجھناتا تھا، جس کے پیازی ہونٹوں کا رس پی پی ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ تنگ قمیص میں کسی کمر میں ابھی بھی سو سو بل پڑتے تھے، جس کی سڈول چھاتیاں ابھی بھی ڈھنڈاروں کی مورتیوں کی ساخت اوڑھتی تھیں اور بدن مکھن میں بھیگے گلابوں میں گندھا تھا۔

یہ سارے مل کر بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ جو ملک اکو زندہ باد کے نعرے بلند کر

رہے تھے۔ تو درست ہی کر رہے تھے کہ ابھی وہ اتنی باقی تھی کہ آدھ مربعے کے بدلے نکاح جا سکے۔ جس نکاح کے وہ سبھی گواہ تھے۔

یہ براتی ڈھنڈاروں کے ڈھابے پر کڑاہی گوشت، تکے کباب، پکوڑے، سموسے جی بھر کر اُڑا رہے تھے۔ یہ عوامی برات کسی گنتی شمار میں تھوڑی تھی۔ کوئی وقت مقرر تھوڑی تھا۔ یہ ضیافت اُس وقت ختم ہوئی جب ڈھابا خالی ہو کر بند ہو گیا جیسے مالک کو خوف ہو کہ کہیں اُس کے دیگچے، کڑاہیاں، گلاس، پلیٹیں بھی نہ ڈکار لیے جائیں۔

آج ڈھنڈاروں میں عجب دن طلوع ہوا تھا۔ یہ سنگِ مرمر سے تراشی ہوئی دیوی چھوٹے چھوٹے پجاریوں سے پوجا پاٹ کرواتے راج پاٹ پر جا بیٹھی تھی۔ اُس حویلی میں آن اُتری کہ جہاں کبھی شادی مرگ پر آ جاتی تو اس فرش کو بھی دھویا جاتا جہاں اُس کے غلیظ پیر پڑتے تھے اگرچہ وہ تلے موتیوں سے کڑھے خوشابی کھسے میں مقید ہوتے۔

یہ زمانہ کس کا سنگی، یہ زمین کس کی سجن، یہ طاقت کس کا گھمنڈ، یہ عزت کس کا اعتبار، اس کی جگہیں تو بدلتی رہتی ہیں۔ یہ ادلا بدلی کا کھیل بھی فطرت کا بے ہنگم ٹھٹھہ۔ اس واقعے کی اطلاع بڑی بی بی جی کو دینے کئی نوکر، مزارعے، کڑاہیاں، جلیبیاں ڈکار کر پہنچے۔

''بڑی بی بی صاحب جی کو ودھائی ہو۔ زمینوں کو ہاتھ لگ گیا ہے۔ اللہ کی برکت سے ہم جلد ہی پہلی بولی لگائیں گے۔''

اقبال بیگم مردانے والی حویلی میں اُتری تو اُس کے کھلے دروازے بند کر دیے گئے کہ چار دیواری کی وجہ موجود تھی۔ دروازوں اور تالوں کی وجہ بالی کبھی نہیں ہوتی، اقبال بیگم تو ہوتی ہے۔ یہ چار دیواری یہ دروازے، کھڑکیاں، تالے، کنجیاں سب بامعنی ہو گئے کہ بالی اقبال بیگم ہو گئی۔

دودھ پتیاں پلانے والوں سے پردہ ہو گیا۔ دودھ سوڈے چھٹ گئے۔ تلے موتیوں والی بنیانیں، روپہلے کھسے، چنبیلی اور گلاب کی خوشبوئیں، گالیاں اور دھپے چار دیواری کے اُس

پارہ گئے۔ یہ عزت، یہ ثواب، بے نمک پھیکے شلجم، بالی نمکین گوشت کی تیکھی کڑاہی، ہرے مرچ مسالے والی اور باسی دال سی بدمزا اقبال بیگم، ملک اکو کا دل جلد ہی بھر گیا، منہ پھر گیا۔

بالی کا ذائقہ ڈھابے کا مرہونِ منت تھا۔ جب تھوڑی تھوڑی سب کو ملتی تھی، پان جیسی، ٹافی جیسی، سگریٹ جیسی، پان سپاری جیسی۔ حویلی کی چار دیواری میں ایک ہی مرد کو سارے پان، سارے سگریٹ، ساری ٹافیاں ٹھونس دیں تو ابکائیاں اور اُلٹیاں، کھایا پیا باہر آنے لگا۔ پان، ٹافی، سگریٹ، مسالے پیٹ کیسے بھریں، البتہ جی بھر دیں۔

■■■■

مُنشی ریحان

سولہ سترہ برس کا منشی ریحان پل پل کی خبریں حویلی میں لاتا کیونکہ منشی رمضان کی اچانک قولنج سے موت کے بعد جدی پشتی منشی کی گدی پر حال ہی میں بیٹھا تھا۔ نئی نئی ذمہ داریوں کے جوش سے بھرا ہوا۔ نام تو اس کا ریاراں تھا لیکن سکول کے رجسٹر پر ریحان لکھا گیا تھا۔ وہ گاؤں کے ان چند بچوں میں شامل تھا کہ جن کے ناموں کا تلفظ سکول ماسٹر تجویز کر کے حاضری رجسٹر میں لکھتا ہے۔ بعض اوقات تو یہ تلفظ انتہائی حیرت انگیز ہوتا مثلاً چھما شمیم احمد، نسو نصیر احمد، احموں احمد یار، اسی طرح ریاراں، ریحان احمد۔

ریحان احمد ایسا ہوشیار کہ جماعت کا مانیٹر بن گیا اور ہر کلاس میں اوّل آنے لگا اور ماسٹر کی جگہ سبق بھی وہی یاد کروانے لگا۔ نویں جماعت میں تحصیل میں اوّل آیا لیکن دسویں جماعت میں ایک روز منشی رمضان چپکے سے مر گیا۔ بغیر کسی پیشگی اطلاع یا علاج کے ایسے ہی مر گیا جیسے یہاں کسانوں کے جانور مرتے رہتے ہیں کہ سارا دن ہل میں جتے رہتے، شام کو پنجالی گلے سے اُتاری تو اداس اداس کھڑے ہو گئے، مغرب تک چارا پٹھا چھوڑ دیا۔ پوری رات اوڑھ پوڑھ کیا لیکن میاں کی بانگ کے ساتھ ہی دم دے دیا۔ گدھوں کی ضیافت اُڑانے سے بھی پہلے اگلی صبح اسی پنجالی میں باری کے انتظار میں کھڑا ویڑ کا جوت دیا گیا۔

منشی رمضان بھی بس تربوز کھانے کے چند گھنٹوں میں ہی دم دے گیا تو اگلی صبح اس کی بیوہ راجن ریحان کو باری کے انتظار میں کھڑے ویڑکے کو بڑی بی بی جی کے حضور پیش کر گئی۔ گدی تو خالی نہ رہ سکتی تھی۔ امتحان کی سیٹ چاہے خالی رہ جائے۔

ریحانا جس کی فرماں داری، سمجھ بوجھ، حساب میں مہارت، گفتگو کا سلیقہ، اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ، سکول کی چند جماعتوں کی دَین تھا جو اُسے ریاراں نہیں ریحان بناتا تھا۔ کسی کی زبان سے ریانا نکلتا ہی نہ تھا، دماغ خود بخود ہی تلفظ کی درستی کر دیتا تھا جیسے ماسٹر نے رجسٹر میں کر دی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ باندھ کر یوں کھڑا ہوتا جیسے کسی پیر کا کوئی مرید کبھی آنکھ اُٹھا کر بات نہ کرتا۔ بات اس قدر نپی، تلی اور شائستہ جیسے ایم اے پاس ہو، جو سیاست، تاریخ، ادب سب جانتا ہو۔ جیسے اس طبقے کی ساری خام دانش ریحان میں مجتمع ہو کر صیقل ہو گئی ہو۔ اس کی انہی خصوصیات نے اُسے سولہ برس کی عمر میں چھبیس برس کی عقل دے دی تھی۔ یہ پہلا مرد ملازم تھا جسے حویلی کے اندر داخل ہونے کی اجازت تھی جو سارا سودا سلف لاتا، اخبار، رسالے بھی خرید لاتا۔ پوری زمینداری، فصلوں، کھاد، پانی کا حساب زمینوں کی گرداوری، پٹوار خانے، کار سرکار، تھانے کچہری سبھی معاملات وہی نبیڑتا۔ اس کی نو جماعتیں ہر جگہ اُس کے لیے زینے بنتی چلی جاتیں۔

بی بی جی کا پورا حساب ہر روز کی پوری رپورٹ اور نئے ملکوں کی عیاشیوں کی خبریں پہنچاتا اور نوید سناتا۔ ''پریشان نہ ہوں بی بی صاحب جی، آج یا کل یہ زمینیں ہماری ہوں گی۔'' بڑی بی بی جی بگڑ جاتیں۔ ''نہ ہماری ہوں گی سے کیا مطلب ہماری ہیں، جدی پشتی ہماری ہیں، ہماری ہی رہیں گی۔'' ''جی بی بی جی بالکل سچ، واپس بھی جلدی آ جائیں گی اللہ کے حکم سے۔ مالکوں کو مالکوں کا مال مل جائے گا۔''

▪▪▪▪

اکو، صابو

بی بی جی کی گالیوں اور بددعاؤں کا سرچشمہ اُن دونوں بھائیوں کی سمت مڑ جاتا جو نوٹوں میں چرس بھر بھر اُڑاتے، جن کے گرد رنگ بازوں کے ٹھٹھ لگے رہتے، سارے بے روزگار، ویلے، نشئی، چرسیے، سپیرے جوگی، بازی گر، شعبدہ باز، میر میراثی جھولیاں بھر بھر خوشامدوں کے بدلے مال سمیٹتے۔

''مائی باپ اُوپر رب تے تھلے آپ ہی آپ۔آپ کی خدا ترسی کے چرچے پورے سندھ ہند میں۔ہمیں ریاست میں خبر لگی کوئی رئیس اُتارو باروں میں اُترا ہے۔ہمیں سندھ میں پتا چلا نیلی بار کو سونے روپوں میں ڈھک دینے والا رب نے کوئی سخی اُتارا ہے جس نے راوی کے پانیوں کو بھی سونا چڑھا دیا۔ بار کی دھرتی کو چاندی کر دیا ہے، جس نے کبھی سو نہیں دیکھا اُسے لاکھ دکھاتا ہے، جس نے کبھی پیتل نہیں پہنا اُسے سونا پہناتا ہے۔''

گڑوی والیاں لَے اُٹھاتیں:

رب آساناں تے آپ حیران

اے جگ تے کیہڑا بندہ میں لا اُتاریا

ہیراں دے پکڑتے:

"سارے جگ دے خزانیاں دیاں کنجیاں ملک صابر حسین، بادشاہ نیلی بار دے کھیسے اچ سو بھدیاں، ملک اکرم حسین دے کھیسے پھٹ پھٹ پیندے، ہماشا دیاں جھولیاں بھر بھر دیندے۔"

زمینیں تو پچھے ماہی فصل اٹھواتی ہیں۔ اتنے منہ، اتنی جھولیاں، اتنے کھابے، شرابیں، مجرے، چھ مہینے انتظار میں تھوڑی بیٹھ سکتے ہیں۔ لگتا تھا جلد ہی سونے کے انڈے دینے والی مرغی حلال کرنا پڑے گی۔ مرغن کھانے، گھی، مکھن، روسٹ، بروسٹ، شربت، شراب عمر بھر حسرت رہنے والے ذائقے جیسے وہ کھا کھا کر مرجائیں گے۔ غریب کی بھی عجب قسمت نہ ملے تو بھوک سے مرجائیں، مل جائے تو کھا کھا کے مرجائیں۔ سب سے خوبصورت موت نعمتیں کھاتے کھاتے مرجانا۔ مرغن کھاتے کھاتے دل کے دورے کا پڑ جانا، میٹھا کھاتے کھاتے شوگر ہوجانا، شرابیں پیتے پیتے جگر پانی ہوجانا، سگریٹ سلگاتے سلگاتے پھیپھڑے چھید و چھید ہوجانا۔ موت تو برحق ہے، ہر ایک پر آنی ہے۔ جس قدر چاہو احتیاطیں برت لو، کھانے میں، جینے میں، صحت میں جتنا چاہو خیال کرلو لیکن موت تو اک شکاری دبوچ کے چھوڑتی ہے تو پھر کھاتے کھاتے دنیا کی نعمتیں اُڑاتے اُڑاتے عیاشیوں کے تھال ڈکارتے ڈکارتے کیوں نہ مرا جائے۔ جلد یا بدیر، آخر تو موت برحق ہے، اُسے ہر حال میں آنا ہی ہے۔

دونوں بھائی اس قدر موٹے ہوگئے کہ اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہوگیا، چہروں پر دولت کا خمار ایسا کہ اچھے بھلے ملک اکرم حسین اور ملک صابر حسین نظر آنے لگے۔ نظرِ بد سے محفوظ رکھنے والے عمال، پیر فقیر، بھنگ گھوٹنے والے ملنگ، ہاتھ کی لکیروں میں تقدیریں ڈھونڈنے والے، فال نکالنے والے اُمڈ کر آئے۔ ڈھوئے ڈھونے والے بھی پیچھے نہ رہے، چھاج، پکھی، کھسے، لنگی کے بدلے سونے کے بسکٹ لے پلٹے۔

بندر، ریچھ، سانپ کے تماشے، پیرفقیر، نوگزے کے ملنگ اور حسن کے بازار، سودے سستے قیمتیں چڑھی ہوئیں۔ جیسے یہ زمینیں جائیدادیں نہ ہوں نشے سے بھرے سگریٹ ہوں جو پھونکے چلے جا رہے ہوں۔ اچانک مل جانے والی دولت کی آتش بازی کا نظارہ اتنا ہی اچانک اور عجب۔

ملک صابو اپنی پجیرو جیپ دکھانے کو اُس بس اڈے پر گیا جہاں وہ کبھی ہاکر ہوا کرتا تھا۔ اڈے کے مالک کے دفتر کے باہر جا کر اتنے ہارن دیے کہ وہ خود غصے سے بھرا باہر نکل آیا۔ اپنے دروازے پر نئی پجیرو جیپ دیکھ کر سٹپٹا گیا۔ سندھی ٹوپی والے ڈرائیور نے دروازہ کھولا، سچے زری کے کھسے والے پیر دروازے سے باہر آئے جن پر کڑ کڑ کرتی سفید شلوار کے پائینچے، جھلائے اور پر سنہری کامدانی والی شیروانی، لال پگ پر سونے کا کلپ جیسے کوئی دولہا اپنی برات کے ساتھ اُترا ہو۔

مالک اپنے معمولی ہاکر کی کایا کلپ دیکھ کر دم بخود رہ گیا۔ دونوں ہاتھوں میں سجی قیمتی انگوٹھیاں، گلے کا وزنی کنٹھا اور طلائی بٹنوں کی چین تو اُسے بعد میں دِکھی۔ ملک صابو کو خوش آمدید کہنے سے پہلے پہلے مالک ایک نئی ٹرانسپورٹ کمپنی کے ہیولے میں پورے رنگ بھر چکا تھا۔ ایک شور مچ گیا:

''ملک صابر حسین صاحب۔''

ہاکر، ڈرائیور، کنڈیکٹر، ٹکٹ کلکٹر، پورا اَڈا ٹوٹ کر اُمڈ آیا۔ مبارک بادیوں کے شور میں ملک صاحب نے ہزار ہزار کے نوٹوں کا مینہ برسا دیا۔ ملک صابو کے پیچھے پیچھے ٹرانسپورٹ کمپنی کی پوری سکیم چلی آئی، راتوں رات اربوں پتی بننے کی سکیم۔ یہ سارے تو اُس سکوارڈ کے ڈرائیور اور گارڈ تھے جنھیں ملک صابو حسین کے ہمراہ چلنا تھا کہ پاکستان کی نمبر وَن ٹرانسپورٹ کمپنی کے مالک کو بے پناہ حفاظت کی بھی تو ضرورت تھی، آخر حاسد اور دشمن بھی تو اسی رفتار سے بڑھنے تھے جس رفتار سے دولت اور اقتدار نے دن دوگنا رات

چوگنا ہونا تھا۔ الیکشن قریب تھے، اس بے پناہ دولت کا مصرف اس سے بہتر کیا ہو سکتا تھا۔ سیاست میں invest کرو اور پھر سیکڑوں فیصد منافع سے واپس۔ اک اور خواب بننے والے بھی ہمراہ ہی چلے آئے لیکن سالانہ فصل پر، اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکتا تھا، مسئلہ یک مشت سرمایے کا تھا۔ پورے علاقے میں اتنی دولت کس کے پاس تھی لیکن بڑی بی بی جی اس منصوبے کا ڈول پہلے ہی ڈال چکی تھیں۔ گھر میں جو کبھی دیسی مرغ، تیتر، بٹیر پکتے تھے اب وہ کس لیے پکنے تھے۔ کھانے والا تو کوئی رہا نہ تھا۔ زمینوں کی ساری آمدنی سمولی بینکوں میں جمع ہو جاتی تھی۔ بھینسوں کا دودھ تک بکنے لگا تھا۔ جس کا بیچنا کبھی کمینگی سمجھا جاتا تھا۔ پر کس نے کھانا پینا تو کیا ضائع کر دیں۔

ملک صابو دست بستہ حاضر ہوا اور پیروں پر گر گیا۔ ''بڑی بی بی جی! آپ رشتے میں تائی لگتی ہیں، مجھ یتیم کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ جائیدادیں آپ کی ہیں، جدی پشتی، واپس اپنے مالکان کی سمت جانے کو ہمک رہی ہیں، بس رخصت کریں دعاؤں کے ساتھ، جو دُنیا کا بھاؤ ہے وہی مانگتے ہیں، زیادہ آپ سے طلب نہیں ہے، گھر کی بات گھر میں ہی رہے تو اچھا۔''

بڑی بی بی جی کا فشارِ خون سرناک منہ میں اُبل کر نسیں پھاڑنے لگا۔ قریب تھا کہ گالیوں اور بددُعاؤں کا فوارہ پھوٹ نکلتا لیکن ریحان کی سمجھ داری سے بڑے ضبط کے ساتھ سودا طے ہوا اور ملک صابر حسین ساری زمین، حویلی کا حصہ، اونے پونے بیچ کر صابو کا صابو رہ گیا۔ کچھ ہی عرصے میں ملک صابو کو بسوں کے اڈے پر ہاکر کے طور پر دیکھا گیا۔ وہ ساری دولت جس کمپنی میں لگی وہ ڈوب گئی۔ سارے دوست زمین نگل گئی۔ سارے محافظ ٹھٹھے لگاتے شام کی محفلوں میں عبرت کی کہانیاں سنانے لگے۔ ان گناہوں کی تفصیل جن کی پاداش میں یہ حشر ہوا۔ ایک روز صابو شدید بیماری کی حالت میں لایا گیا جس کا علاج کروانے والا کوئی نہ تھا، گردے پانی ہو گئے تھے۔ کسی فٹ پاتھ سے کوئی ترس کھا کر اُٹھا لایا تھا لیکن ملک اکو خود اپنی بیشتر زمین بیچ چکا تھا۔ یہ تو بالی تھی جو اُسے دو وقت روٹی پکا دیتی

تھی۔ آخر وہ مر گیا تو گاؤں والوں نے اس موت کا جواز بھی اُس زیادتی کو گردانا جو ملکوں کے خاندان کے ساتھ ان دو بھائیوں نے کی تھی، یہ کہاں کے مالک اور ملک۔ ایسے تھوڑ دلے، کم ظرف کہ ملکیتیں برداشت ہی نہ کر سکے، جو دولت اور جائیداد کا بوجھ برداشت ہی نہ کر سکے اُسے ملکیتوں کا حق ہی نہیں۔

صنوبر کو بوڑھا راگ ولی یاد آیا۔ انگریزی فوج کا صوبے دار جسے فوج کی خدمت کے صلے میں اس گاؤں میں اڑھائی مربعے ملے تھے جس کی کوئی اولاد نہ تھی لیکن اتنا کنجوس کہ بیوی کو آٹے کی مٹھیاں من کر دیتا اگر کبھی وہ ایک مٹھی زیادہ ڈال لیتی تو اُس کی انگلیوں کے گٹوں پر چھڑیاں مارتا۔ ایک مٹھی دال کی، اگر دال کبھی سخت رہ جاتی تو اُس کی کلائیوں کو انگاروں سے داغتا کہ بوڑھیا فضول خرچی کی مرتکب ٹھہری ہے۔ کہتا بس دال کا پانی نکال لو، اگر گھنی ہو گئی تو فضول خرچی ہو گی۔ اُسی راگ ولی کی جمع دولت اور زمینوں کا جو وارث بنا تھا اُس نے اس زمین اور دولت کو سگریٹ بنا پھونک ڈالا تھا۔ اونے پونے خریدنے والی بھی بڑی بی بی جی تھیں جو کہتی تھیں:

”شوم دی کھٹی تے گئی کتے چٹی“

پتا نہیں یہ زمینیں اتنا ہرجائی مزاج کیوں رکھتی ہیں۔

ملک اکو کو بھی لیزنگ کمپنی کا منصوبہ بینک منیجر نے دیا تھا۔ اُس منافع بخش پروجیکٹ کے لیے بھی سرمایہ یک مشت درکار تھا جو علاقے میں بڑی بی بی جی ہی ادا کر سکتی تھیں۔ جن کے پاس ساری زمینیں واپس آ چکی تھیں، سوائے اُس آدھ مربعے کے جو اقبال بیگم کے نام لگا تھا، جسے واپس اپنے نام کروانے کو ملک اکو کے تشدد سے اقبال بیگم کتنے برس سے بالی کے ماتم سے نبرد آزما تھی۔ پہلی مار نکاح کے تیسرے روز پڑی تھی جب زمین ملک اکو کے نام لگوانے سے انکار پر ٹھڈے دھپے، لاتیں، مکے برسانے کا آغاز ہوا تھا۔ وہ جان تو دے سکتی تھی لیکن زمین واپس نہ کر سکتی تھی۔ یہی تو عزت کی گارنٹی تھی جس نے بالی کو اقبال بیگم

بنایا تھا۔ اس زمین کی فرد پر ہی تو پہلی بار اقبال بیگم لکھا گیا تھا۔

بالی چولہا دخاتی، دھواں نگلتی، لاتیں، دھپے، گالیاں کھاتی، دنوں میں اقبال بیگم ہوگئی۔ ناک کی تھلی ہی نہ اُتری۔ نتھنوں میں پھنکارتی خوشبوئیں بدبو ہوگئیں۔ لال شموز کی نکی بنیان ہی بوسیدہ نہ ہوئی۔ اندر اُمڈتی ملائم پھسلنی چھاتیاں خشک اخروٹ ہوگئیں۔ چیروں آنکھوں کا کاجل ہی نہ بہا۔ بینائی دھندلا کر پیاسے کٹورے ہوگئی۔ پیشانی پر لہراتے سیاہ گھونگر ہی نہ بکھرے، جیسے ستاروں بھری رات ملگجے اندھیرے میں مدغم ہوگئی۔

بالی اپنے وجود سے کہیں منہا ہوگئی اور سوکھا سڑھا چمڑا ٹیڑھی میڑھی ہڈیوں پر اقبال بیگم کو لیپ گیا۔ جیسے جیسے ملک اکو کی زمینیں واپس بڑی بی بی جی کے نام چڑھتی چلی گئیں ویسے ویسے ہی بالی اقبال بیگم کے چوکھٹے میں دم توڑتی چلی گئی۔ جیسے ملک اکو اور ملک صابو کے ہاتھ سے ساری زمینیں اچک کر اُنھیں اکو اور صابو میں واپس لٹا دیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کی زندگی کتنی اچھی گزر جاتی۔ سکون سے، میانہ روی سے، کسی شریف عورت سے نکاح، بچے، اُن کی پرورش اور تعلیم میں زندگی جتا کر پھر اسی معمول کے چکر میں بوڑھا ہو کر پوتوں دوہتوں کے ہاتھوں میں اطمینان سے مر کر کتنی سیدھی اور شریفانہ زندگی گزار سکتے تھے لیکن وہ تو ایک راہِ مستقیم کو چھوڑ کر ٹیڑھے راستے پر چل پڑے۔ ٹیڑھی راہ کا انتخاب کرنا ہر کسی کا حوصلہ تھوڑی ہے۔

اچانک مل جانے والی دولت کو بے دریغ لٹانا، بے وقوف بننا، ہر فراڈ کو منصوبہ سمجھنا، غیر شریفانہ زندگی کو دولت کا جائز مصرف سمجھنا، غیر شریفانہ خوراک، غیر شریفانہ اطوار۔ جگر پانی، گردے راکھ کر ڈالنا اور پھر مر جانا۔ اُنھی کا تماشا بننا جو بے وقوف بناتے، لوٹتے اور فریب دیتے رہے۔ زندگی کا ایک مختلف انجام، معمولات سے ہٹ کر غیر معمولی موت۔

ہر ایک بے وقوفی میں ایسا جی دار کہاں ہوتا ہے۔ کتنے ہیں جو سیدھی راہ سے ہٹ کر ٹیڑھی راہ اختیار کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ جو مذاق مخول، لعن طعن اُنھی کا سہتے ہیں جن کے

ہاتھوں بے وقوف بنتے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر تو سبھی زندگی گزار جاتے ہیں۔ خود کو مثال بنا دینے والے ہیں کتنے، جن کی حماقتوں کو گیتوں میں پرویا جائے، جو کہاوتوں میں زندہ رہیں۔

مختصر سی زندگی کی اس طرح خاک اُڑا دیں کہ وہ مزید مختصر ہو کر یادگار ہو جائے، چاہے عبرت کہا جائے پر یادرگار کردار بننا ہر ایک کے حوصلے کا امتحان تھوڑی ہے۔ یہ تو ملک اکو اور ملک صابو کا ہی جگرا تھا۔

....

محمد اسلم

ماسٹر اللہ دتہ کا لائق فائق بیٹا اچھو، محمد اسلم اے سی سٹی حال مقیم کوٹ لکھپت جیل قیدی نمبر 357 پچھلے آٹھ برس سے اپنی سوچ کی کوتاہی اور فلسفے کی ناکامی پر غور کرتا رہا تھا۔ وہ اپنے بلند ارادوں اور اونچے منصوبوں کی بنیادی غلطیاں تلاش کرتا رہتا تھا۔ اپنی جون بدلنے کو عوامیت کی ذلتوں سے چھٹکارا پا کر خاندان کو اشرافیہ کی عزتوں سے ہمکنار کرنے کی خواہش رکھنے والا اچھو، محمد اسلم اے سی سٹی بھول گیا تھا کہ یہ اُس کی کمتر طبقاتی فطرت کی کم نظری تھی۔ وہ اے سی صاحب بن کر بھی اشرافیہ کا کمین ہی رہے گا۔ کیونکہ وہ ایک پرائمری سکول ماسٹر کا غریب بچہ ہے۔

اگر ان بڑے عہدوں کا کوئی جھالو نہ ہو تو یہ سب اپنے ہی گلے کا طوق بن جاتے ہیں۔ کوئی مضبوط خاندانی حوالہ کسی جرنیل کسی سیکرٹری کسی بڑے بزنس مین کسی ٹائی کون (Tycoon) کا واسطہ۔ ورنہ ہر پچھ پرتیت میں بڑے عہدے والا پھانسی کا پھندہ اُسی کی گردن کا ناپ نکلے گا جس کی پشت خالی ہوگی جس کا کھونٹا کمزور ہوگا۔

ان بڑے عہدوں کی میوزک چیئر کا ایک ہی اصول کسی کرسی کا پایہ کتنا مضبوط ہے۔
محمد اسلم غریب سول سروس کی گھومنے والی کرسی کو اشرافیہ کے محل کا طلسمی دروازہ سمجھ بیٹھا تھا۔
بھول گیا کہ وہ ماسٹر اللہ دتے کا بیٹا ہی رہے گا چاہے چیف منسٹر کا پرسنل سیکرٹری ہی کیوں نہ بن جائے۔

جب چیف منسٹر کا تختہ الٹا جائے گا تو وہ مجرموں کی فہرست میں سرفہرست آ جائے گا۔
اُس سے باز پرس کرنے والے وہی ہوں گے جو کبھی اُس کے ماتحت رہے تھے جو اُس کے اعصاب توڑنے کو تشدد کے سارے اسلحوں سے تو لیس ہوں گے ہی لیکن اُن کی شدت میں یہ کرودھ اور حسد اوزاروں کی سنگینی سے کہیں زیادہ ہوگا کہ انہی میں سے ایک اُٹھا اور اُن کا افسر بن بیٹھا۔ چاہے وہ اپنی محنت مقدر سے بنا لیکن اُس کا بننا ہی اپنے جیسوں کے لیے بے عزتی کا باعث ہے۔ وہ آسمانوں سے اُترنے والے آقاؤں کو تو خوشامد کی انتہا میں قبول کر سکتے ہیں لیکن اپنے جیسوں میں سے اُٹھ کر حاکم بننے والے کا تو شاید قتل بھی جائز ہے۔ وہ جو دن رات اُسے سلطانی گواہ بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ سب وہی تھے جو اُس کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے چپڑاسی سے پوچھتے تھے۔

''صاحب کا موڈ کیسا ہے۔''

اور اب جیسے اسی جملے کا انتقام وصول کرنے کا سنہری موقع ہاتھ سے جانے نہ دینا چاہتے ہوں۔

اگرچہ اُنھیں زیادہ محنت کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی وہ تو سلطانی گواہ بننے کو پہلے ہی تیار تھا۔ کسی کی سیاسی لڑائی لڑنے کو تھوڑی دن رات محنت کی تھی۔ وہ دوسروں کی ڈینگوں میں آنے والا بھی نہ تھا۔ وہ اپنی قربانی کسی آدرش کسی حاکم کو بچانے کے لیے بھی دینے والا نہ تھا۔ وہ حق اور صداقت کا ترازو بھی نہ تھامے ہوئے تھا۔

اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ چیف منسٹر کا پرائیویٹ سیکرٹری تو تھا لیکن کسی راز کا ہم راز نہ تھا۔

جن جرائم کی لمبی فہرست میں اُسے معاونِ کار لکھا گیا تھا وہ اُن سے آگاہ ہی نہ تھا۔ ورنہ وہ اُن کے خلاف سلطانی گواہ کیوں نہ بنتا۔ جو خود تو ضمانتوں پر رہا تھے۔ اگر جیل میں بھی تھے۔ تو صاف ستھرے کمرے، اے سی، ٹیلی ویژن، اخبار، سیر ورزش، گھر کا کھانا، مہنگے ترین وکیل، ملاقاتی، مشققتی، سب سہولیات میسر تھیں۔

اور وہ خطرناک قیدیوں کی کوٹھری میں مقید، کالی خوفناک دیواریں، تشدد اگلتی، دن رات کی تمیز ختم، شدید گرم مہینے اپنی ساری شدتوں کے ساتھ اُس کے حوصلے توڑنے کو اُس کال کوٹھری میں تالہ بند۔ حوصلے تو پہلے دبکے میں ہی ٹوٹ چکے تھے وہ پرانے حاکموں کے خلاف من گھڑت کہانیاں بھی سناتا رہتا لیکن نئے حاکموں کو پسند ہی نہ آتیں۔ تشدد مزید بڑھا دیا جاتا۔ جبکہ وہ پہلے تھپڑ میں ہی وہ سب اگل چکا تھا جو اُس کے علم میں تھا۔ لیکن جو وہ سننا چاہتے تھے۔ وہ سب اُس کے علم میں ہی نہ تھا۔ جب تک دماغ ساتھ دیتا رہا وہ کہانیاں گھڑتا رہا لیکن وہ ان بے ضرر کہانیوں سے مطمئن نہ ہونے والے تھے۔ اُس کے دماغ کی ساخت تو ماسٹر اللہ دتہ کی محدود سی سوچ کی پروردہ تھی۔ خطرناک کہانیاں بھی نہ گھڑ سکا۔ شاید اسی لیے دہشت گردی اور غداری کی ساری دفعات اُس پر لاگو ہو گئیں۔ اندھی ابلتی کوٹھری میں خون چوستے مچھر، کھٹمل، زہریلے کیڑے، پھدکتے چوہے، بدن پر لیپ گرمی دانوں سے ادھڑتی جلد، رینگتے کاکروچ، ٹارچر سیل کی چھت پر بھاگتے بھیانک شور مچاتے چیختے چلاتے تشددی، کھردری سیاہ دیواروں سے لٹکتے خوفناک سائے، اُمڈتی تاریکی تو کبھی کئی سو پاور کے بڑے بڑے بلب آنکھوں میں گھستے ہوئے، روشنی کے چھٹتے گولے جو دماغ کی کھال اُدھیڑ دیتے جیسے بدن کی کھال ادھیڑی جاتی۔

تو پھر وہ کیوں سلطانی گواہ نہ بنتا اگر وہ کسی جرم کا شریک کار ہوتا تو ضرور بنتا۔ اُس کا یہی جرم کافی تھا کہ وہ چیف منسٹر کا پرسنل سیکرٹری رہا تھا۔ وہ جو سلوک سابق چیف منسٹر سے روا رکھنے کی حسرت دل میں رکھتے تھے۔ اُس کا برملا اظہار محمد اسلم پر ہوتا تھا۔

اُس کے جن جرائم کی فہرست ٹی وی پروگراموں میں بتائی جاتی اور فردِ جرم عائد کر کے فیصلے بھی سنا دیے جاتے، وہ اُس کے علم میں ہی نہ تھے۔ بے شمار پلاٹ، پلازے، بینک اکاؤنٹس کی تفصیل جو ثابت کی جا رہی تھی۔ اتنا کچھ تو اُس کی نسلوں نے کبھی تصور نہ کیا تھا۔ اُس کی اپنی ذہنی استعداد میں کہاں سما سکتا تھا لیکن ثابت کر دی گئی تھیں۔ عجب کرپشن کی غضب کہانیاں۔

جس کرپشن میں معاونت کی دن رات دھائیاں دی جا رہی تھیں۔ اُن منصوبوں کا وہ کبھی شریک کار رہا ہی نہ تھا اگر تھا بھی تو محض ایک محنتی افسر کے طور پر۔

یہ سزا اُس کی ذات تک نہ رہی۔ بھانجوں بھتیجوں بہن بھائیوں دور نزدیک کے رشتہ داروں تک پھیلا دی گئی تھی۔ نوکریوں سے نکلوا دیا گیا۔ تھانوں میں روز بے عزت کیا جانے لگا۔ سارے نامعلوم مجرموں کے جرم اُنہی پر ڈال دیے گئے۔

یہ کالی بھیڑیں جہاں سے گزرتیں لوگ ٹھٹھے لگاتے۔ اُن جرائم کی تفصیل ایک دوسرے کو سناتے جو ٹی وی اینکرز دن رات دہرا کر لوگوں کو رٹوا رہے تھے۔ بنا کسی ثبوت یا کارروائی سب ثابت۔

ماسٹر اللہ دتہ تو اک عرصہ حوالات میں بند ہی مر گیا۔ وہ غریب تو اپنی ایک عزت سمجھتا تھا۔ جو مدتوں اپنے فرض کو ایمانداری سے نبھانے اور چھوٹی سی تنخواہ کو حلال کر کے کھانے کے دعویٰ میں پوشیدہ تھی۔

اُس کے اندر وسوسوں اور واہموں نے گھر کر لیا۔ جو اُسے دنوں میں ہڑپ گئے۔ وہ حوالات میں یہی دھائی دیتا مر گیا۔

''ہائے اچھو! تو یہ بڑی نوکری نہ ہی لیتا۔

کسی سکول کا ماسٹر بن کر عزت کی زندگی گزار دیتا۔ کیا ملا اس بڑی نوکری سے جو عزت عمر بھر کی غربت کی ایمان داری سے کمائی تھی۔ وہ بھی جاتی رہی۔ میں ایک کرپٹ

افسر کے باپ کی حیثیت سے مروں گا۔ کرپشن جس کا مفہوم بھی کبھی نہ معلوم ہوا۔ میری قبر پر بھی یہی گُرز برسیں گے۔ یہ ہے وہ جس کا بیٹا کرپشن میں اندر ہوا۔ یہ ہے وہ جس کا بیٹا بڑا افسر بنا تھا۔ خاندان کی کایا بدلنے چلا تھا۔ کہیں تھکتے ہی نہ جاتے تھے۔ آج کیسی کایا پلٹی ہے۔ یہ ہے ماسٹر اللہ دتہ جو اخلاق تہذیب کی باتیں کرتا تھا۔ بیٹے کو تو ایمان داری بھی نہ سکھا سکا۔ کرپٹ، بدعنوان، راشی، بددیانت، ملک وقوم کا مجرم، غدار وطن پروان چڑھایا۔''

یہ ساری آوازیں جیسے ٹارچر سیل میں تشدد کے وہ اوزار جو اُس پر تابڑ توڑ برستے تھے۔ جن کی شدت سے حوالات میں ہی دل تھام کر اندھا بہرہ ہو گیا۔

دیگر افرادِ خانہ تو موجود تھے ہی جو سارے طعنے الزامات ٹھٹھے ٹکول سہتے تھے۔ یہ سلسلہ اتنا دراز ہو گیا کہ اُن کے اپنے اندر چور گھس آیا تھا۔

کچھ تو ہوگا جو آٹھ برس سے سڑ رہا ہے۔ شاید کیا ہو۔ شاید کروایا گیا ہو شاید نہ کیا ہو۔ اب تو شک کے سنپولیے خود محمد اسلم اے سی صاحب کو بھی ڈسنے لگے تھے۔

کوئی تو ایسا گناہ ضرور سرزد ہوا جس کی یہ سزا۔ اُس سے کہ آباؤ اجداد سے کہیں تو کچھ ہوا ضرور جس کی پکڑ اس عہدے کی صورت میں خاندان بھر کو ملی۔ اتنا سب کچھ کسی ایک کے ساتھ اُس وقت ہوتا ہے۔ جب خود قدرت کسی جرم کی سزا دینے کو اتارو ہو جاتی ہے۔

کایا پلٹنے خاندانی پس منظر بنانے کا خواب جو ٹوٹا تو کرچیاں بہت سوں کو چُبھیں۔

نوکریوں سے فارغ کیے گئے بھائی بہنوئی، بے روزگاری، غربت اور بیماریوں کا شکار واہی تباہی بکنے لگے۔

''اے سی صاحب کیا ہماری تباہی کے لیے یہ نوکری لی تھی۔ کیا والد صاحب نے اُسی دن کے لیے دعائیں کیں اور خوشیاں منائی تھیں کبھی نہ ملی ہوتی تجھے یہ بڑی نوکری''، بھابیاں کرلاتیں۔

''کہتا تھا۔ خاندان کی تاریخ بدل جائے گی۔ ہمارا خاندانی پس منظر بنے گا۔ یہی پس

منظر کہ چھپتے پھرتے ہیں۔ دنیا تھوتھو کرتی ہے۔

کیا کہ نہ کیا اچھو نے کیا۔ بھگتنا سب کو پڑا۔

غربت کی روکھی سوکھی کھا کر سکون کی جی رہے تھے۔

ہائے کایا بدلنے چلا تھا۔ کایا ہی تو بدل دی ہے۔ مُدقدیم سے کسی نے کرپشن کا نام سنا تھا۔ کسی کو مطلب بھی آتا تھا پورے خاندان میں۔ اب جدھر سے گزرتے ہیں لوگ ٹھٹھے لگاتے ہیں۔

یہ ہے کرپٹ اے سی کا خاندان۔ کرپٹ اے سی کا بھائی بہن، بہنوئی، پھوپھا، چاچا، ماموں، خالو۔

سکول میں بچوں کو بچے نہیں جینے دیتے۔ مشہوری جو ہو گئی ہے چاروں طرف، نیک نامی۔"

"ہائے اچھو تو اے سی صاحب نج بنتا ہم بنا کسی خاندانی پس منظر کے ہی عزت دار تھے۔ تو نے وہ عزت بھی چھین لی.... جو غربت کی شرافت نے دے رکھی تھی۔ غریب تو خود کو شریف کہلا کر ہی خوش ہو جاتا ہے۔ تو نے وہ غریب شرافت بھی نہ رہنے دی۔"

ہر سو دہائی مچ گئی

"محمد اسلم کرپٹ اے سی۔"

عجب المیہ تھا۔ شام کے ٹی وی ٹاک شوز میں چیختے چلاتے لال بھبھوکا چہروں والے چرے ہوئے حلق سے تھوک اُڑاتے۔ الزامات محض ایک شخص پر ہی نہ لگاتے۔ یہ تھوک ایک چہرے پر ہی نہ پڑتے چھینٹے پورے خاندان کو ناپاک بنا دیتے۔

غریب منہ چھپاتے پھرتے صفائیاں پیش کرتے خود کو مظلوم ثابت کرتے کرتے تماشا بن جاتے۔ کالی بھیڑیں سیاہ رنگی اون دور سے پہچانی جاتی۔ خاندان بکھر جاتے بچے رل جاتے، آوارہ، بے راہ رو ہو جاتے۔ ماں باپ صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے مر

جاتے۔ خرچے کی تھوڑ سے بیوی خاندان بھر کی بھکارن جو کنجوسیاں کرتے جمع کیا وہ فریز ہو گیا۔ جائز جائیدادیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں۔ خود ٹارچر سیلز میں برسوں سہتے سہتے دماغ مختل ہو گئے۔ بعض کمزور اعصاب مر گئے، برسوں کے تشدد قید و بند، بدنامی تباہی کے طویل دور کے بعد عدالتوں نے فیصلہ سنایا۔

ملزم بے گناہ ہے۔ باعزت بری تمام الزامات مسترد، سب بحال۔

پچھلی تمام تنخواہیں پچھلی ساری ترقیاں اور مراعات سب واپس، لیکن اس فیصلے میں یہ کہیں نہیں لکھا جاتا کہ جو ان غلط الزامات کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گئے جو بدنامی اور شرمندگی برسوں اُن خاندانوں نے اُٹھائی اور وہ ماہ و سال جو کال کوٹھریوں کی نذر ہو گئے۔ جن کی زد میں بن باپ کے بچے جوان ہوئے۔ بیوی قبل از وقت بوڑھی ہو گئی۔ خاندان تاراج ہو گئے۔ کیا عدالتیں وہ سارے نقصانات لٹا سکتی ہیں۔

عجب نظامِ عدل ہے جو تمام سزائیں بھگتانے کے بعد کسی کو بے گناہ قرار دیتا ہے۔ عدالتیں برسوں ان مقدمات کی سماعتوں پر ایسے ریمارکس دیتی رہیں جو ارسطو اور ہلاکو خان کی روح کو خوش کرتی ہیں۔ اس احساس سے قطع نظر کہ اُن کا ہر جملہ ہر لفظ فیصلے کا درجہ سمجھا جاتا ہے۔ صرف ایک ریمارکس کسی خاندان کی تباہی کے لیے کافی ہے۔

معطل اے سی محمد اسلم تو کسی کی لڑائی لڑنے کو افسر نہ بنا تھا لیکن اس پر دوسروں کی جنگ مسلط کر دی گئی۔ وہ دوسروں کی لڑائی میں خرچ ہوا اور اپنا آپ ہارتا چلا گیا۔ خاندان کی بربادی کی اطلاعات کال کوٹھری میں بھی مل رہی تھیں۔

معزول حاکموں کی طرف سے بھی پیغامات موصول ہو رہے تھے۔ ڈٹ جانے کے پیغامات، اصولوں پر سینہ سپر ہو جانے کے پیغامات۔ حق کی خاطر جان دینے کے پیغامات، آنے والے اچھے وقتوں کے پیغام، جب سب لوٹا دیا جائے گا اور انعام و اکرام سے سرفراز کیا جائے گا۔ حق و باطل کی جنگ میں ثابت قدم رہنے کے پیغامات۔

محمد اسلم پانچ بائی پانچ کی کال کوٹھری میں بھرے ہاڑ جیٹھ میں پگھلتے۔ ساون بھادوں میں پھنسیوں پھوڑوں سے پکتے تڑکتے مچھروں پسوؤں سے ادھڑتے، یخ سردی میں جوؤں اور کھٹملوں سے بھرے بدبودار کمبل میں ننگے فرش پر سکڑتے صبح وشام زہریلی دال کا پانی اور کچی روٹیاں نگلتے سوچتا تھا۔

سوچتا تھا اگر سب مل بھی گیا سب لوٹا بھی دیا گیا۔ تو کیا وہ الزام مٹ جائے گا۔ الزام چاہے مٹ جائے پر اُس کے داغ انمٹ ہوتے ہیں۔ کرپشن کرپشن کا کھیل کھیلتے ہوئے اُسے نشانِ عبرت بنایا گیا اور اُس عبرت کی اوٹ میں کرپشن جی بھر کر لوٹی گئی عجب کھیل ہے۔ بدعنوانی کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے دو چار کو عبرت بنا کر اپنا دامن پاک کر لو۔ اب جتنا چاہو لوٹ کھسوٹ لو۔ کرپشن کرپشن کی اتنی گرد اُڑا دو کہ اپنی کرپشن اس دھند لکے میں چھپ جائے۔

اتنا نقصان اس ملک کو کرپشن نے نہیں پہنچایا، جتنا کرپشن کے خلاف بے ہودہ بیانیہ نے پہنچایا ہے۔

اسلم کی تو چھوٹی سی سوچ تھی۔ یہ سیاست، قومی سلامتی، غداری اور کرپشن جیسے بڑے پیمانے اُس کی سوچ کے مختصر سے پیالے میں سما ہی نہ سکتے تھے۔ ایسے رنگدار پانیوں کے لیے کھلے پیٹ والی صراحیاں درکار ہوتی ہیں۔

وہ تو محنت سے، وفا شعاری سے جی حضوری سے بس اپنا پس منظر بدلنا چاہتا تھا۔ شاید اُس کے اندر جو کمی کمین والی خصلت باقی تھی جو غریب غربا والی خو موجود تھی۔ جو وفا شعاری اور جی حضوری تھی۔ اُس کی یہی خصوصیات حاکم وقت کو پسند آ گئی تھیں۔ پرائیویٹ سیکرٹری ٹو سی ایم۔ کتنی عزت اُس کے نام کے ساتھ ایک بڑی سیٹ کا نام پکارا جائے گا۔ اے سی صاحب کے والد صاحب۔ بھائی صاحب بھانجے بھتیجے صاحب، سلسلہ دراز ہوتا ہوا سارے چچیروں ممیروں پوری برادری گاؤں کو سماج میں عزت ملے گی وہی جو اس سیٹ کی عزت

ہوتی ہے۔

ہر خانوادے میں سے کہیں تو کوئی ایک محمد اسلم ایسا نکلتا ہے۔ جو اپنے خاندان کی عزت کا بنیاد گزار بنتا ہے۔

لیکن یہ کیسی بنیاد تھی جو رکھنے سے پہلے ہی کھود دی گئی جس میں خود یہ خاندان گر گیا۔

▪▪▪▪

رات

ہر دو برس کے بعد ایک ایم اے صنوبر کے بالوں میں ایم اے کے حجم کے مطابق ہی سفیدی بھر دیتا تھا۔ یہ ڈگریاں ہی تھیں جو باور کرواتی تھیں کہ ٹھہرے ہوئے جامد متعفن تالاب پر سے بھی وقت کی موہوم آہٹ گزری ضرور ہے۔

کتابیں تو امتحان کی بندش کے بغیر بھی پڑھی جا سکتی تھیں۔ پر یوں تو وہ عمر بھر ایک کتاب ہی پڑھتی رہتی جو کبھی ختم ہی نہ ہوتی۔ کڑا وقت اُس پر ٹھہر جاتا، دماغ بھٹکتا، حواس مختل ہو جاتے۔

یہ امتحان ہی تو ہے جو وقت کو ایڑ لگا دیتا ہے اور دماغ کو لگام ڈال دیتا ہے کہ بالوں میں روز افزوں بھرتی سفیدی پر بھی ماتم کرنے کو وقت وہ نہیں نکال پاتی۔ صبح شام کی اور لپکتی ہے۔ شام صبح میں تبدیل ہوتی ہے۔ رات کی سنگینی کتابوں میں گھل جاتی ہے۔ رات جس کے خوف میں وہ دن بھر مبتلا رہتی ہے۔ کیونکر کٹے گا یہ اذیت ناک سلسلہ ہائے شب۔ جسے ہر ہر روز جھیلنا ہوتا ہے۔

یہ رات دکھ کا گھر، اذیت کا ٹھکانہ تنہائی اور موت کی خاموش قبر، جس کے کواڑوں پر ننھے منے ہاتھوں کی دستکیں مسلسل سنائی دیتیں۔ شاماں والی ڈانگیں احساسات پر مسلسل برستیں۔ پھر وہ اندھی فضاؤں میں ٹنگی ہوئی گردن جس کے جھکنے سے سجدہ سرزد ہو جاتا تھا۔ اشیا کو انسانوں کو سجدہ وہ جو عجائب گھر کی مورتیوں کے روبرو جھکنے کے شرک سے آلودہ ہو چکی تھی۔ جس کی سزا اُگلتے ہوئے زہر آلود لوتھڑے، یخ حنوطی چہرہ۔

پھر وہ سنی کے پھولوں سی رنگت والا زرد بت جو اُس سے صنوبر سے کھولے کی وٹوانی سے معافی کا طلب گار رہوا تھا۔

اگر وہ امتحان والی کیفیت اور دباؤ سے ہمہ وقت دوچار نہ رہتی تو ان سارے دباؤں تلے مر نہ جاتی۔ یہ امتحان کی شدت ہی تو تھی جو اُسے جینے لائق خود فراموشی اور بے حسی دیے رکھتی، سوچنے دیکھنے سننے محسوس کرنے کی ہر حس کو معطل کیے رکھتی۔ چوبیس گھنٹے امتحان کی کیفیت جو لاتعلق کر دیتی ہے ماحول سے، کتابوں کے علاوہ دیکھنے سننے کو مفلوج کر دیتی ہے وہی کیفیت، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہر دو برس بعد وہ پھر خالی ہو جاتی۔ ایم اے تاریخ، ایم اے سیاسیات، ایم اے اسلامیات، ایم اے اُردو، اور پھر فارغ، خالی خولی۔

سارے علم محض ایک کاغذ کا ٹکڑا۔ اس بے شمار کے بعد پھر یکتا۔ اگرچہ کتابیں بے شمار، لیکن بھٹکانے والی، خلا پیدا کرنے والی، سوچ کا خلا، محسوسات کا خلا، دکھ پچھتاوے کا خلا، بالوں میں بھرتی سفیدی کی موہوم سی جنبش کا خلا، خلا در خلا۔ یہ کتابیں جس دنیا کی کہانیاں سناتیں وہ خلا در خلا معلق۔

اُن دنوں تو اس خلا کو بھرنے کے لیے بڑی بی بی جی کی گالیاں اور بددعائیں کو سنے بھی دستیاب نہ تھے۔ اُن کا رخ بھی اُن دونوں بھائیوں کی طرف یوں مڑ گیا تھا کہ دوسروں کے بڑے بڑے قصور بھی نظر انداز ہو جاتے تھے۔

تو آخر یہ قیامت جیسی طویل راتیں اور اَن گنت حشر دھاڑے کیونکر گزریں، بے کار

وقت کس قدر طویل اور چھیددار، جس میں اذیت دہ یادوں، پچھتاوؤں اور کرب بھرے مشکیزوں کو کوئی بھر بھر انڈیلتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا وہ آنکھیں بند کرے تو غم کا ایک پہر گزر جائے۔ پلک جھپکے تو دوسرا گزر جائے دوبارہ آنکھیں کھلنے کے عرصے میں آخری بھی تمام ہو جائے لیکن یہ وقت تو چکی کے پاٹوں کی طرح اُس کے قدموں سے بندھ گیا تھا۔ دن رات کتابوں میں کھپا دیتی تو پھر کہیں ایک چکر تمام ہوتا۔ کتابیں ختم ہو جاتیں۔ امتحان تمام ہو جاتے۔ اس جی کا جنجال وقت پھر بھی اس پر ٹھہرا رہتا۔ عمر بھر اُسے دھکیلنے کی شدید کاوشوں کے باوجود ابھی بھی اُس پر اپنی پوری سنگینیوں کے ہمراہ کڑی کمان کی طرح کسا تھا۔ وقت کے کڑے بوجھ تلے تڑپتی سسکتی مرتی بھی نہ تھی ڈھیٹ۔

اب تو اُس نے ایم اے انگریزی کی کتابیں منگوا لی تھیں۔ لگتا تھا بقیہ ساری حیاتی انہی میں کھپ جائے گی، ہلاک ہو جائے گی۔ وہ ہجے بنا بنا لفظ اُٹھاتی، ڈکشنریاں دیکھ دیکھ معانی سمجھنے کی کوشش کرتی۔ گرامر کے رٹے لگا لگا جملے بناتی اور انگریزی کے اندھے غار میں خود کو سنگ بستہ رکھتی۔ ماحول سے منہا، تنہا، حرفوں کے محشر خیال میں قید، کوئل کی کوک، ہدہد کا تاج، چڑیوں کے زمزمے، پانی کی قلقل، پھل پھول کی مہکاریں، شرینہہ کے پھول، نیم کی نمولیاں، کری کے غنچے، ٹیوب ویل کے کھاڈے میں بطخوں فاختاؤں کبوتروں کے غوطے، ان خشک کتابوں سے کہیں دلچسپ کتاب اگر اُسے پڑھنے کی اجازت ہوتی تو۔ نوکرانیوں کے قصے تو ان سے بھی بڑھ کر معلوماتی اور دلچسپ، اگر اُسے سننے کی اجازت ہوتی تو۔ پھر وہ ان مردہ تابوتوں سی کتابوں میں خود کو کیوں قبر بند رکھتی وہ اب ان سنگین تنہا راتوں کا کیا تدارک کرے۔ جو بین ڈالتی ہر ہر روز اس اجاڑ احاطے میں اُتر آتی ہیں۔

کبھی سیاہ کالی چڑیلوں سی یادوں کے لمبے کالے اُلجھے بال بکھیرے، کبھی چاندنی اوڑھے، چار کنال کے صحن میں سفید حنوطی چادریں بچھائے ماتم کناں۔ یہ سنگین راتیں جن کا گزرنا اس قدر دشوار جیسے اڑیل گھوڑیاں، ضدی، نہیں گزرتی یہ راتیں، سفاک راتیں، وہ عمر

بھر ان تنہا راتوں کی سنگ بستگی میں کرلاتی رہی تھی۔ ایک ایک رات کے پیروں سے صدی صدی بندھی ہوئی، کچھوے کے پیروں والی صدی، وہ ہر ہر روز اس ہزار پایے کے بوجھ تلے تڑپتی کچلتی رہی تھی۔ حنوطی کتابوں کی یخ بستہ انگلیوں میں جکڑی ہوئی۔

بڑی بی بی جی کی خواب آور گولیوں کی مقدار بڑھتی چلی جا رہی تھی اور صنوبر کے رت جگے، سفید چاندنی میں درختوں کے سائے فصیلوں پر یوں چھپ جاتے جیسے اُس کے وجود میں گڑھی میتوں پر پھول چڑھے ہوں اُس کا جی چاہتا وہ چیخ چیخ کر اُن کا ماتم کرے بانہیں اُلار اُلار کر بین ڈالے وجود میں بنی ان قبروں پر سر مار مار کر پھوڑ ڈالے۔

لگتا دماغ ہاتھوں سے نکل چلا ہے۔

رک رک اے دماغ کے وحشی گھوڑے رک جا۔ پہلے امتحان دے لوں پھر ماتم کروں گی۔ پہلے امتحان دے لوں پھر رووٴں گی۔ پہلے امتحان دے لوں پھر بین الاروں گی۔ یہ امتحان ہی تھے جنھوں نے اُسے بچا رکھا تھا۔ ان ڈھیر سی کتابوں میں علم تو محض مٹھی بھر، باقی سب تکرار، نقل، مقصد علم کا حصول تھوڑی تھا۔ مقصد ان سنگین راتوں کو گوارا بنانا تھا۔ دھکا لگانا تھا۔ ایک ایک صدی جیسے وقت کے ایک ایک پہر کو فنا کی گھاٹی میں دھکیلنا تھا۔ کتنا مشکل منصب تھا۔ اپنی ہی زندگی کو قطرہ قطرہ قتل کرنا۔ اپنے ہی وجود کے پتھر کو پور پور پگھلانا۔ خود کو آپ ہی واٹ بنا کر دھنکا دینا۔ حسن و شباب کے کڑے وقت کے کٹ جانے کو تڑپ تڑپ کر دعائیں مانگنا۔

ان آٹھ برس میں تو وہ بی بی جی کو بھی فراموش رہی تھی۔ ورنہ ان گالیوں بددعاؤں کی مصروفیت میں کئی پہر تو ہلاک ہو جاتے جواب پوری زندگی اور پورے زور اور توانائی کے ساتھ اُس کے مقابل کھڑے تھے۔

■■■■

اقبال بیگم

وہ نئے مالک۔

دونوں بھائی تو اپنی کرنی سے آپ ہی مٹ گئے۔ لیکن بڑی بی بی جی اپنی بددعاؤں کا تیر بہدف نتیجہ ہی قرار دیتی رہیں۔

ساری زمینیں واپس آ چکی تھیں۔ سوائے اُس آدھ مربعے کے جو اقبال بیگم کے نام لگا تھا۔

ملک اکوان سارے برسوں میں اقبال بیگم کی ہڈیاں توڑتا رہا تھا کہ وہ آدھ مربع اُس کے نام دوبارہ لگوائے۔ ملک اکو جواب پھرا کورہ گیا تھا۔ شروع میں تو اتنی طاقت رکھتا تھا کہ بالی کو ناگن گت سے جھنجھوڑ کر دس گھومنیاں دے اور ہر گلوانٹی میں پوچھے۔

''بتا زمین نام کرتی ہے کہ وڈ دوں تیری یہ تھوم کی گُلی ستواں ناک، نام کرتی ہے کہ تراش دوں تیرے یہ چنبے کی کلیاں کان، بالیوں سمیت، نام کرتی ہے کہ تکلے پرو دوں تیری ان مشعال آنکھوں میں کجلے سمیت۔''

لیکن یہ اقبال بیگم تھی جو ہر تشدد میں سرخرو ہوتی لیکن آدھ مربع واپس کرنے پر آمادہ نہ ہوئی۔

یہ آخری چند ایکڑ بیچ کر چار دیہاڑے دوبارہ ملک اکرم حسین کی زندگی جینے کی حسرت دل میں لیے ملک اکو کئی عوارض میں مبتلا گت گھما کر چک پھیریاں دینے کی طاقت بھی کھو بیٹھا۔

اس آدھ مربع کے بدلے سب سہ جانے والی اقبال بیگم۔ ان تمام برسوں میں ماتم کرتی رہی تھی۔ بالی کی موت کا ماتم جس کے جوتے کے نشانے پر کئی ملک اکو ایڑھیاں رگڑتے تھے۔ اور وہ خود چک پھیریاں دیتی تھی اُنھیں جو اُس کی مشک سونگھتے کتے کی طرح دم ہلاتے تھے۔ اس آدھ مربعے کی مالکن اقبال بیگم نے بالی کی ساری خودمختاریوں کو اس آدھ مربعے کی حفاظت میں گروی رکھ کر تپ دق کا روگ وٹا لیا تھا۔

ملک اکو تو گت وڈ نہ سکا لیکن لمبے سیاہ پشم بال آپ ہی آپ جھڑتے بکھرتے بدرنگ بھوسہ ہو گئے۔ ناک کی پھنک تو نہ کاٹ سکا۔ پر گوشت اور خون سے خالی ٹیڑھی ہڈی لونگ اور تیلی سے محروم آپ ہی مسمار ہو گئی۔ کان جھنجھناتے جھمکوں سے بچے، جری کی لویں سی لٹکنے لگے۔ قندھاری انار سی بالی کا سارا رس اس آدھ مربع زمین کے بیلنے نے نچوڑ لیا تھا۔

جس روز ملک اکو کی وفات کا اعلان مسجد کے لاؤڈ سپیکر نے کیا۔ اُس روز گاؤں کی عورتوں کو یکبارگی بالی کے اقبال بیگم ہونے کا یقین آ گیا جو اس آدھ مربع کے بدلے دق کے مرض میں چھید و چھید تھی لیکن ملک اکو کو تین وقت آدھ مربع کی آمدنی میں سے سوہنا رن پکا کر کھلاتی تھی۔ کپڑا لتا دھو کر پہناتی تھی۔ جب ملک اکو بستر پر پڑ گیا تو اُس گندی لوتھ کو نہلاتی بھی۔ دوا دارو بھی کرتی اور پیر جنڈی پر منتیں بھی مانتی۔ اُس نے پوری اقبال بیگم بن کے دکھایا۔ گاؤں کی عورتوں کی مکمل تسکین ہوئی۔ مست کجراری ہر کس کو تنبیہ کرتی آنکھیں کہیں کالے کنوؤں میں سولی چڑھ گئیں۔ جن میں کبھی دیسی گھی کے چراغ جلتے تھے اور وہ چھنگلیا سے کاجل لگا ان پونچھا چھوڑ دیتی تھی۔

سینہ دق کے چھیدوں سے پسلیوں میں دھنس گیا جو کبھی ہڑپا کی مورتیوں کی ریس کرتا

تھا۔ اور لال شیموز کی نکی بنیان سے جھلکیں مارتا تھا۔ اب کسی بنیان کی ضرورت ہی نہ رہی۔ پسلیوں کے چھید دار کھکھل آگے پیچھے پیوست اور وہ کمر جس میں کبھی سوسو بل پڑتے تھے اور کئی ملک اکو ہر بل میں ہلاک ہوتے تھے۔ کھڑکھڑاتا استخوانی پنجرہ، چلتی تو کڑک کڑک کی آوازیں نکلتیں۔ پھٹی ایڑیوں اور سوکھی سڑی ہڈیوں والے راکھ رنگے پیر جو کبھی سنہری کامدانی کھسّے سے تڑپ تڑپ باہر آتے تھے اور جوتے اردگرد موجود سبھوں کے نشانے لیتے تھے۔ گاؤں کی عورتوں نے سکھ کا سانس لیا اب اُن کے مردان نشانوں سے محفوظ تھے۔ اب وہ اُس کے گلے لگ بین ڈال سکتی تھیں۔

بوسیدہ سفید اوڑھنی میں سے بچی کھچی دانتوں کی کرچیاں گلے لگنے والیوں کو تیورا رہی تھیں۔ جن کی مہکاریں سونگھنے کو اُن کے مرد آدھی فصل لٹا دیتے تھے۔ کاڑھنی کی دھونکائی ہوئی اندھی دیوار کے آلے سے چہرے کے آنسو پونچھ سکتی تھیں جس پر راکھ کے سیاہ جالے جھریوں کی صورت لپے تھے، وہی جس چہرے کے لیے اُن کے مرد کریم پاؤڈر کے انبار لگا دیتے تھے۔

گاؤں کی عورتوں کو پکا یقین تھا کہ بالی کے سارے گناہ معاف ہو چکے ہیں کیونکہ اب اُن میں اور بالی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اب بالی مکمل اقبال بیگم ہوگئی ہے تو وہ اُس کا دکھ کیوں نہ بٹائیں۔ اب اگر اُس کا نام بگڑے بھی تو بالی نہیں اقبالاں ہوسکتا ہے۔ اب وہ قابلِ ہمدردی ہے بلکہ قابلِ ترس۔ قابلِ رشک، قابلِ نفرت دور کو وہ اپنے ہی قدموں تلے روند چکی ہے۔

عورتوں نے لمبے بین کھینچے۔

''ہائے اقبالاں رانڈ بھی ہوئی تو کن حالوں میں حویلی میں کوئی رہنے نہ دے۔
ڈھابے پر کوئی بیٹھنے نہ دے۔
ہائے اقبالاں تو بخت پٹی تو کرماں سڑی۔''

عجب تسکین آور بین۔

جیسے عمر بھر کی بے توقیریوں اور زیادتیوں کے بدلے چکا رہی ہوں جو اُن کے شوہر اسی بالی کے شوق میں اُن کے ساتھ روا رکھتے تھے۔

جس روز بڑی بی بی جی نے اقبالاں کو ملک اکو کا افسوس کرنے کے لیے حویلی میں بلوایا اور وہ بالی کی بھسم شبیہ گھسیٹتی ہوئی دروازے سے داخل ہوئی تو صنوبر کو لگا جیسے بجھی راکھ کی مٹھی کسی نے پھونک مار کر اُس کی آنکھوں میں اُڑا دی ہے۔ اس احاطے میں پھر ایک موت واقع ہو گئی ہے۔ سب سے شدید اور اندوہناک موت.... خوشی اور جنس کی موت، جوانی کی موت، جمال کی موت۔

اب دنیا میں کبھی کوئی حسین نہ ہوگا کہیں کوئی جوان نہ رہے گا۔ کوئی وصل نہ ٹھہرے گا کوئی نسل نہ چلے گی۔

کیا فطرت کو یہ حق حاصل ہے کہ صنوبر کی آنکھوں کا سب سے حسین نظارہ یوں بھسم کر دے۔ ہر سو زرد چہرہ موت جھپٹ پڑی۔ موت کو بھی موت دبوچ گئی۔ سب بھسم، سب ختم۔ کل کائنات اپنے طے شدہ بھیانک انجام کی سمت لڑھک گئی کیا اسی کو قیامت کہتے ہیں۔

راکھ رنگے ہونٹ کھلے اور کسی اندھے کنویں سے مرتی ہوئی چمگادڑوں کی چیخ سی سنائی دی۔

''سب کہتے ہیں بھوئیں بیچ دے اور پیسے علاج پر لگا دے پر میں مر جاؤں گی۔ زمین نہ بیچوں گی۔ جان دے دوں گی۔ بھوئیں نہ دوں گی۔ مروں گی تو اقبال بیگم زمیندارنی کے نام سے مروں گی۔''

وہ بھرویں ہونٹ جن پر بالی سرخی لگا سکتی تھی مسوڑھوں پر کھنچ کر ناپید ہو چکے تھے کہ منہ کھلنے کے بعد مسوڑھوں کو دوبارہ نہ ڈھانپ سکے تھے۔ بڑی بی بی جی نے نخوت سے

تیوریاں چڑھائیں۔

''مر بھی تو جائے گی پھر تجھے کیا معلوم لوگ تیرا ذکر کس نام سے کرتے ہیں۔ بالی کو دنیا بھولنے والی نہیں۔ چاہے جتنی اقبال بیگم بن جائے۔ تیرے بعد بھی تو زمین بکنی ہے نا مالکوں کو مالکوں کی شے واپس ملنی ہے۔ آپ دے جائے گی تو چار دیہاڑے اچھے گزار جائے گی۔'' جبلی غرور لہجے کی تحقیر میں ہنہنایا۔ ''بچنا تو خیر تو نے پھر بھی نہیں....''

اقبال بیگم کے لہجے میں بالی والا حتمی طنطنہ ابھرا، دق کی چھید دار نحیف پسلیاں باہم کھڑکیں۔ جن کی صوت نرخرے میں غوں غاں سی بجی۔

''جس روز مر گئی بی بی! تو مری ہوئی کے انگوٹھے چاہے لگوا لینا، جیتے جی تو نہ لگاؤں گی۔''

''ہوئی جو ذات کی کنجری اسے کیا لحاظ ملاحظہ۔''

جی چاہا ٹھوکر مار کر دروازے سے باہر اُٹھا پھینکیں لیکن زمین تو ابھی بھی اسی کے نام پر تھی۔ گالیوں کا گھونٹ بھر کر پوچھا۔

''کوئی چائے پانی اقبالاں۔''

''ماس کو من چاہے بی بی۔ کلے (کلیجی) کی دو بوٹیاں ہیں تو دے بی بی....''

صنوبر کو لگا۔

ڈھابے پر چڑھے سارے کڑاہی گوشت راکھ ہو گئے ہیں۔ سارے تکے کباب دھواں ہو چکے۔ گوشت چڑھی ساری سلاخیں اس کے سینے میں کھب گئی ہیں۔ اور ایک آواز مدفونوں میں دفن ہوتی ہے اور ڈھنڈاروں سے بازگشت پلٹتی ہے۔

''ذرا کڑاہی گوشت بھنوا کے لا چھوٹے! کرارا ساتھ میں کبابوں کی سلاخیں، بل بھبھوجٹ کے حساب میں یا پھر....پھر....پھر....پھر....''

صنوبر دروازے کی جھیت سے واپس پلٹی۔ سامنے قد آدم آئینہ کھڑا اٹھٹھہ کرتا تھا۔

ہر ایم اے بالوں میں اپنی اپنی سندیں چسپاں کر گیا تھا۔ ان گنت کتابوں کے بے شمار الفاظ چہرے پر آڑھی ترچھی لکیروں کی صورت ثبت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں جگ رتوں کے پڑھے ان گنت حروف کی مدھم سیاہی معدوم ہو رہی تھی۔

عمر بھر خود کو خود میں ہی سکیڑتے اور کتابوں پر جھکے رہنے سے پسلیاں اندر دھنس گئی تھیں اور ہنسلی کی ہڈی ہاتھ برابر الٹ آئی تھی۔ ہونٹ خون اور گوشت کی قلت سے مسوڑھوں پر کھینچی زرد باریک پھانکیں جو دانتوں کو ڈھانپنے سے عاجز تھیں۔ کبڑی مکوڑا سی۔ اپنے ہی چوکھٹے میں دھنسی ہوئی۔

کیا بالی کنجری اور یہ شریف عورت جسے سورج نے بھی ننگی آنکھ سے نہیں دیکھا۔ دونوں کا انجام یکساں ہوسکتا ہے۔ کیا فطرت کا انصاف یہی ہے کہ اپنے شہکار زوال کے بہاؤ پر رکھ دے۔

اچانک اُسے خیال آیا کہ نجانے کتنے مہینوں سے وہ بھیگی نہیں ہے۔ یعنی وہ اُس حد کو پار کر گئی جس کی کونپل پر کوئی شگوفہ کھلتا ہے۔ چشمۂ حیات خشک ہو گیا، آبِ شباب سوکھ گیا۔ وہ بوڑھی ہو گئی وہ کسی مرد کے قابل نہ رہی۔ منبعٔ روئیدگی سونٹھ۔ وہ جو عمر بھر اس عفریت سے نجات کی دعائیں کرتی رہی تھی۔ اس ناگہانی شرمندگی میں روتی کرلاتی رہی تھی وہ جو اس احساسِ گناہ میں طعنوں تشنعوں میں پروئی جاتی رہی تھی۔ ایک ایک پہر گزارنے کو ایک ایک صدی تڑپتی رہی تھی۔ بہت سے پہر اگر یکبارگی گزر گئے تو پھر دکھ کیسا۔ موت کی زرد شبیہ جو وہ کئی چہروں پر دیکھ چکی تھی اگر خود اس کے چشمہ حیات میں سیندھ لگا گئی تو غم کیسا۔ فطرت کے سینے میں دل تھوڑی ہوتا ہے۔

اگر دل ہوتا بھی ہے تو احساس تھوڑی ہوتا ہے۔ دھندلے شکستہ آئینے کے سامنے گھٹنوں پر ڈھیتی چلی گئی۔

پوروں پر رائیگانی عمر کا حساب لگایا۔ فطرت کا گونجدار ٹھٹھہ ”پینتیس سال“۔

پینتیس سال نہیں پینتیس صدیاں، وجود کو خجالت کی پوٹلی میں گھونٹتی ہوئی صدیاں جیسے ناجائز نومولودوں کو گاؤں میں پولی تھین کے لفافے میں گھونٹ دیا جاتا ہے اور پھر اروڑی کے ڈھیر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ اس چشمہ حیات کو بھی لاروؤں اور حشرات الارض بھری کھولے کی پرانی ٹاکیوں میں وہ مدتوں دفن کرتی رہی تھی تو پھر پچھتاوا کیسا۔

جس آبیاری کے خاتمے کے لیے وہ برسوں کلک کلک کر دعائیں مانگتی رہی تھی جس جرم کے سرزد ہونے کے بعد طعنوں معنوں نے جینا حرام کر دیا تھا۔ وہ طوفان کس قدر خاموشی سے آپ ہی آپ سمٹ گیا۔ کس شور ہنگامے سے چھٹی تھی یہ ندی اور کس خاموشی سے سوکھ گئی۔ اس کے خاتمے کے لیے جس تعداد میں اُس نے دعائیں مانگی تھیں تو اتنی دعائیں بے ہدف تو نہ رہ سکتی تھیں۔ اُنھیں قبولیت کا شرف ملنا ہی تھا۔ دیر سے ہی سہی۔ اسے تو اپنی دعا کی قبولیت پر خوش ہونا چاہیے پھر یہ آپ ہی آپ اُس کی آنکھیں کیوں بھیگنے لگی ہیں۔ وہ رو کیوں رہی ہے۔ اچھا ہوا ہر مہینے گندی ٹاکیاں چرانا پڑتی تھیں اور ہر بار ڈھنڈیا پڑ جاتی تھی۔ جیسے اُس نے کوئی زری و کم خواب کے پارچہ جات چھپا لیے ہوں۔

اس روئیدگی سے نفرت کرتے کرتے۔ اسے جرم کی طرح چھپاتے چھپاتے اس پر شرمندہ ہوتے ہوتے آخر اس سے نجات پا گئی تو اب یہ کیسا احساس رائیگانی کہ جوانی گزر گئی۔

حادثات اور سانحات کے پینتیس برس میں کہیں یہ جوانی بھی بے دم پڑی تھی کیا، جو کسی کو یاد نہ تھی۔ خود اسے بھی یاد نہ تھی۔ یہ بھولی بسری یاد آج کیوں ستا رہی ہے۔ جس کے طعنوں نے شرمندہ کرتے کرتے اس کا وجود مسخ کر دیا تھا۔ شرمندگی کے پسینے میں نہاتے نہاتے اپنی ہی روئیدگی سے اتنی نفرت ہو گئی کہ وجود کراہت کا ڈھیر لگنے لگا۔ آج اس نفرت اس کراہت اس گناہ، جرم، طعنے کے خاتمے کا دن ہے۔ تو یہ دکھ کیسا۔ وہ کیوں رو رہی ہے۔ جیسے عطاء اللہ کی لاش صحن میں رکھی ہو۔ جیسے افتخار امتیاز کا لہو چھلک پڑا ہو۔ جیسے وہ

زرد بت دیوتا معافی کا طلب گار ہو گیا ہو۔ جیسے بالی کی مسخ شدہ شبیہ چار کنال کے صحن میں ایڑھیاں رگڑتی ہو اور مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوتا ہو، اقبال بیگم زوجہ ملک اکرم حسین قضائے الٰہی سے.... یہ بھی کوئی زرد چہرہ موت تھی جو اسے غچہ دے گئی۔ خود اپنے وجود میں اُترتے ہوئے وہ اُسے پہچان نہ سکی وہی موت جو مرنے والے چہرے پر خود کو لکھ دیتی ہے۔ جلی حروف میں لکھ دیتی ہے۔ اور صنوبر اس خفیہ زبان کو پڑھنے کی صلاحیت پتا نہیں کیسے حاصل کر گئی تھی۔ لیکن خود اپنے اندر اُترتے ہوئے اُسے دیکھ ہی نہ سکی۔

وہ بھی جوانی رکھتی تھی لیکن اظہار نہ کر سکتی تھی۔ وہ بھی خوبصورت چہرہ رکھتی تھی مگر آئینہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ وہ بھی پُرشباب تھی پر کوئی طلب گار نہ تھا۔

اُس کے تصور میں ایک ان دیکھی تصویر کہیں چڑ مڑ پڑی تھی۔ وہ غریب کا بچہ اے سی صاحب محمد اسلم۔

کوئی تو تھا جو اُس کا طلبگار رہا۔ غلیظ تالاب کی متعفن گاب میں ڈبکیاں کھاتی اس مینڈکی کو کوئی تو مانگنے والا تھا۔ جس نے بیوی بنانے کے قابل سمجھا اُسے۔

عجب احساسِ جرم جیسے ماسٹر اللہ دتے کے بیٹے محمد اسلم سے بے وفائی سرزد ہو گئی ہو۔ وہ اُس کی امانت میں خیانت کی مرتکب ٹھہری ہو۔ یہ احساس پہلے کبھی کیوں نہ ابھرا تھا کہ محمد اسلم کو ٹھکرائے جانے کے باوجود اُس کا لاشعور محمد اسلم سے منگا گیا تھا۔ اُس کی نسبت ٹھہر گئی تھی جس کا ادراک اُسے آج ہو رہا تھا۔ جب وہ اُس کے مقابل والا زعم کھو چکی تھی۔ اُس کے پاس محمد اسلم کے لائق سبھی کچھ تھا۔ جو تتلیوں کی مانند اُڑتی اور کبوتریوں کی مانند غٹرغوں غٹرغوں کرتی ان خادماؤں کے پاس موجود تھا۔

لیکن یہ کیسی خوف اور دہشت کی کڑکی تھی جو اُس کی سوچ اور محسوسات تک کو مصلوب کیے رہی کہ وہ اس نسبت کو پا ہی نہ سکی۔ خود سے ہی اقرار کی ہمت نہ ہوئی۔ جس تشدد سے بچنے کو وہ عمر بھر سانس بھی روکے رہی۔ اگر اُس سے وہ مرجاتی تو کیا۔ نیک بیگم بھی تو مر گئی تھی

موت رنگ پہچاننے والی کو زندگی کیوں پیاری ہوگئی تھی۔ بددعاؤں کی قبولیت تو اُس تک پہنچتی ہی نہ تھی لیکن مرتو وہ پھر بھی گئی وہ غلیظ طعنے اور گالیاں جن کے دم گھوٹو شکنجے سے وہ بچ نہ پائی اور کری کی لالولال جھاڑی موسموں کے شدائد سے جل گئی جس کے میٹھے پھل وہ نہ چکھ سکا جس کی وہ امانت تھے۔ امانت میں خیانت کے تصور سے وہ گھٹ گھٹ برسنے لگی۔ کتابوں کے صفحات بھیگ کر پھٹنے لگے جیسے اُن کی بھی آج موت آئی ہو۔ آج کے بعد وہ وقت کا شمار نہ کرے گی مہینے کی تاریخیں نہ گنے گی کہ گنتی والی تسبیح ہی ٹوٹ گئی۔

کوئی خواب نہ دیکھے گی کہ خواب والی مٹھی بھر نیند ہی روٹھ گئی۔ اب عطاء اللہ والا کوئی شہزادہ ڈھونڈ کر نہ لا سکے گا کہ شہزادی تو پتھر کی مورتی ہوگئی۔

■■■■

بڑی بی بی صاحب جی

اقبال بیگم والے آدھ مربع کو واپس لینے کے بعد بڑی بی بی جی جیسے بے ہدف ہو گئی تھیں۔ دماغ کا الم غلم باہر نکال پھینکنے والی جدید بددعائیں اور مغلظات تو اب بے ہدف نہ رہ سکتی تھیں۔ جن کو یہ سوچ مزید بھڑکا رہی تھی کہ ان زمینوں جائیدادوں کا وارث کون ہو گا۔ زمینوں کی واپسی کی تگ و دو کے زمانوں میں تو یہ سوچ مؤخر رہی تھی۔ جیسے صنوبر کی بہت سی سوچیں امتحان کی ہنگامی مصروفیت میں معطل رہتی تھیں۔ لیکن اب سکون کے دنوں میں ساری معطل سوچیں بھڑک اُٹھیں۔

کیا یہ سب صنوبر کے نام چلا جائے گا۔ وہ کھولے کی وٹوانی جسے کبھی پرانی ٹاکیوں پر دسترس نہ دی تھی۔ وہ مربعوں جاگیروں کی مالک بن بیٹھے گی۔ یہ دکھ بڑی بی بی جی کی نہاد کو کھانے لگا اور دماغ کا بوجھ گالیوں بددعاؤں کی صورت میں صنوبر کو مار کرنے لگا۔ جو دنیا جہان کے ایم اے پاس کر کے بھی راتوں کی عفریت سے کبھی نجات نہ پا سکی تھی۔ ان اڑیل راتوں کو بی بی جی کی گالیاں بددعائیں ایڑھ لگانے لگیں۔ جن کا دماغ جیسے فاسد کچرے کا

ڈھیر، زہریلی بوؤں کے بھبھکے اُڑاتا ہوا۔ اضطراری کیفیت انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ نیند کی گولیاں بے اثر ہونے لگیں۔ بددعائیں برہدف نہ بیٹھتی تھیں۔ گالیوں کا کوئی جواب نہ آتا تھا۔ مقابل کوئی رہا نہ تھا۔ بے انتہا بے کاری، خالی دماغ، خالی حویلی، خالی دل، خالی مستقبل، خالی زمینیں، خلا در خلا، جس میں دن رات دماغ کی بھا اُڑتی تھی۔ جیسے حرام مغز پر شاماں والی ڈانگیں برستی ہوں۔ وہ روز پٹواری کو بلوا کر زمینوں کا حساب کتاب لگواتیں۔ صنوبر کے نام آئی زمینیں تو بہت پہلے بڑی بی بی جی کے نام منتقل ہو چکی تھیں۔ لیکن اُن کے بعد کیا وہ دوبارہ صنوبر کے نام ہو جائیں گی۔ کیا اسی لیے اتنی تگ و دو کی کہ کسی دوسرے کے نام چلی جائیں۔ وہ زمینیں جن کے بارے ہوک پڑ گئی تھی کہ جس کے نام لگیں وہی لاولد ہوا۔ برباد ہوا، مرگ ہوا، ان زمینوں کو بددعا تھی۔ شاید بابا جنڈی پیر کی کہ نیک بیگم کی کہ افتخار، امتیاز کہ خود صنوبر یہ بددعائی ہوئی زمینیں کبھی کسی کی نہ ہوئیں۔ بھکوں میں ہٹیوں، جھوکوں بیٹھکوں، بھنیوں پر، ڈھنڈاروں پر، تندوروں، ڈھابوں پر، پنچائتوں پر ایک ہی مقال پڑی۔

''ان زمینوں کے اندر لاوارثیت گھلی ہے۔ کبھی کسی ایک خانوادے ایک قوم یا ملک کی ہو کر رہی ہیں کیا۔ اپنے وارث اپنے مالک اپنے حاکم بدلتی رہتی ہیں۔ ایسی ہرجائی پر کیا حاکمیت جتانا۔ کیا ملکیت کی دعویٰ داری، کیا حصول کی کوششیں، یہ زن، زمین اور زر کسی کی ہو کر رہی ہیں کبھی، کیا معلوم کب اپنے ہی مالک سے منہ موڑ کسی اور سمت چل نکلیں۔

کب یہ زمین اپنے ہی مالک کے لہو سے دشمن کا دسترخوان سجا دے۔ یہ خود غرض بس اپنی ذات کے ساتھ جیتی ہے۔ یہ اپنی مالک آپ، دوسروں کو تو دکھ، کرودھ، جنگ، دشمنی کا کھیل رچانے کو میدان فراہم کرتی ہے۔ ڈائن ماں جیسی جو اپنی پیاس اپنے بچوں کے خون سے بجھاتی ہے۔''

پورا بار خام دانش سے چھلکتا فلسفی ہو گیا۔ اس زمین کی فطرت نے دانشور بنا دیا۔ بڑی بی بی جی اسی ہرجائی کے عذاب میں مبتلا ہو گئی تھیں۔ زمینیں جو خود اپنی فطرت سے

بغاوت کر کے اُن کے پاس واپس تو آ چکی تھیں۔لیکن اب کس سمت روانہ ہو جائیں۔کس اور اپنا رخ موڑ لیں۔کیا معلوم اس ہرجائی کے مزاج کا کیا پتا۔

کیا یہ ذراسی گٹک صنوبران پر حکمرانی کرے گی۔ یہ کیوں نہ مر گئی۔سارے وارثین مرتے رہے کیا اسے وارث بنانے کو۔کیا یہ فطرت کی کوئی بھیانک سازش تھی۔جس نے صنوبر سے ساز باز کر رکھی تھی۔

بڑی بی بی جی کے کرب ناک بین راتوں کا کرودھ چھیدتے ہوئے دکھ کے سمندر میں غوطا جاتے۔

''ہائے صنوبر بندیے میں تجھے مرتے ہوئے دیکھوں، ایڑھیاں رگڑ رگڑ دم دیتے ہوئے دیکھوں۔ساری عمر تو نے ماں سے کلام نہ کیا۔بے حرمتی کی ماں ماتا کی۔وڈھی پڑھی لکھی تیرے نصیب میں کبھی نہ ہوں میری جاگیریں،کالا چور لے جائے پر تجھ کلموہی کو چیپہ بھی نہ ملے۔''

خادمائیں دکھ سے کڑہتیں۔

''ہائے ماں کے پلو تے نری سیس ہی سیس۔ ماں دیاں گالاں گھیو دیاں نالاں۔ انویں گھابر جاتی ہیں۔آپ کے بنا ہے کون چھوٹی بی بی جی! ہائے جاگیروں کی فکر نے کملا کر دیا۔بادشاہزادی کو۔بار کی رانی کو فقیرنی کر دیا۔''

وہ کرلاتیں بانہیں اُلار اُلار بین ڈالتیں۔اُن کے بس میں ہوتا تو وہ بڑی بی بی جی کے بطن سے کوئی نر وارث پیدا کر لیتیں اور اُس کی چاکری میں خود کو مقید کر لیتیں۔

بڑی بی بی جی کو یہ زمینیں روگ بن لگ گئی تھیں۔جن کی ملکیت کی بنا پر ہی وہ وڈی ملکانی صاحب جی تھیں۔تھانیدار، تحصیل دار، پٹوار خانہ، روز حاضر ہوتا تھا۔کبھی کبھار اے سی اور ایس پی صاحب سلام کرنے چلے آتے اور ہر کام ہر مسئلے کے حل کا وعدہ کر کے جاتے تھے۔

الیکشنوں میں اُمیدوار بڑی بی بی جی کی قدم بوسی کے لیے حاضر ہوتے۔ علاقے بھر کے زمیندار بی بی جی سے افسروں کو فون کروانے آتے۔ جن کے سارے ٹیڑھے کام محض ایک فون کال کی دوری پر سیدھے ہو جاتے اور یہ وفا شعار رعیت جو دن رات خدمتوں پر مامور تھی تو اسی زمین کے کولھو کی بنا پر ہی تو یہ سب تھا۔

کیسا المیہ ہے کہ طاقت، اقتدار، اثر اختیار حاصل کرنے والا خود نہیں رہتا۔ طاقت، اقتدار، اثر، اختیار پڑا رہ جاتا ہے۔ کسی اور کے لیے.... یہ بیچ میں ضعف بیماری موت کیوں آجاتے ہیں۔ بڑی ملکیتوں والوں کو عمریں بھی جاودانی عطا ہونی چاہیں۔ جتنی بڑی ملکیتیں اس تناسب سے عمریں بھی۔ یہ کیا کہ ملکیتیں پڑی رہیں اور مالک نہ رہیں۔ موت تو کیڑے مکوڑوں جیسی اس رعیت کو ہڑپنے کے لیے ہونی چاہیے۔ نہ کہ طاقتوروں اور خداؤں جیسے حاکموں کے لیے۔ جو خود موت اور زندگی بانٹنے کا اختیار رکھتے ہوں۔

جیسے کمہار ٹیڑھے پلے برتن پھینک دیتا ہے۔ نروئے اور کھرے سنبھال لیتا ہے۔ فطرت کے کمہار کا شعار بھی یہی ہونا چاہیے۔ نہ کہ پوری آوی سے یکساں سلوک۔

یہ دکھ معمولی دکھ نہ تھا جو کھائے جاتا تھا۔ دماغ کو بھی اور جسم کو بھی۔ جو کھاد بن رہا تھا۔ دماغ کی بھی اور جسم کی بھی۔ بڑی بی بی جی کے مضبوط اعصاب کو توڑ رہا تھا۔ کسی سانحے کسی حادثے کو عمر بھر ایسی جرأت نہ ہوئی تھی۔ لیکن یہ کیسا نا اُمیدی کا جہنم تھا کہ وہ نہیں رہیں گی اُن کی ملکیتیں رہ جائیں گی۔ بھڑکتا ہوا بھانبھڑ، جس میں عقل دانش سوچ سمجھ سب بھسم۔ بی بی جی کے وجود سے احساسِ فنا چیختا دھاڑتا ہوا۔ عمر بھر کے وقار عظمت کے چیتھڑے اُڑاتا ہوا۔ اپنی موجودگی کے احساس سے ہلاک کرتا ہوا۔ دراز قامتی کوتاہ قامتی میں سمٹتی ہوئی، اکڑ کبڑی ہوتی ہوئی، طاقت کمزوری میں دھنستی ہوئی، صحت بیماری میں قلبوت ہوتی ہوئی بچا رہ گیا تھا۔ فطری گھمنڈ، یادگاری انانیت کہ خادمائیں سہارا دینے اُٹھانے بٹھانے کھلانے کو بڑھتیں تو جھانپڑ کھاتیں۔

"نہ تم سنبھالو گی مجھے۔ میں سب کو سنبھالنے والی۔تم جیسی دسیوں کو پرے پھینکنے والی۔خبردار جو چھوا بھی مجھے۔"

صنوبر انگریزی کی کتابوں میں پوری رات کو قطرہ قطرہ نچوڑ چکی تھی۔وہ کبھی گہری نیند نہ سوئی تھی۔بس ذرا سی اونگھ جو کسی نے پکار کر اُکھاڑ دی تھی اس نے میز پر رکھی کتاب پر سے ہڑبڑا کر سر اُٹھایا۔

کیا کوئی ایسا وقت آ پڑا ہوگا کہ اُسے پکارا گیا ہوگا۔اُس کی ضرورت آن پڑی ہوگی۔ یہ اُس کا واہمہ ہے کہ واقعی وہ کسی ضرورت کا باعث بن گئی ہے۔پھر تو کوئی حشر دیہاڑا ہی ہوگا۔

ریحان آنسوؤں سے تر چہرہ لیے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتا تھا۔بڑی بی بی جی جو اذان کے ساتھ ہی باہر صحن میں آ جاتی تھیں اور آنے والی خادماؤں کے لیے دروازے کھول دیے جاتے تھے۔دودھ کی چھلکتی بلٹوئیاں باڑے سے حویلی میں بھیجی جاتی تھیں۔ٹو کے چلتے تھے مویشیوں کی کھرلیاں تازہ چارے سے بھری جاتی تھیں۔لوسن اور برسیم کے ہرے چارے سفید اور کاسنی پھولوں کی خوشبوئیں لنڈھاتے تھے۔

مدھانیاں گھومتی تھیں۔لسی لینے والیاں ازدحام کرتی تھیں۔چولہے بھڑکتے تھے چائے کے دیگچے ابلتے اور پراٹھے دیسی گھی کی خوشبوئیں اُڑاتے تھے۔اور کتے بلے رالیں ٹپکاتے تھے۔چار کنال کا صحن خادماؤں کے قدموں کی دھمک سے گونجتا تھا۔مرد ملازم حلق گھونٹ کر مویشیوں کو گھڑکتے تھے کہ حویلی کو اُن کی آوازوں کا بھی پردہ تھا۔لیکن پردہ پھر بھی ٹوٹ جاتا تھا ان جنگلی نرخروں کی توانائی سے۔لیکن آج زندگی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا۔چار کنال کا صحن آنسوؤں،التجاؤں اور دعاؤں سے گونجتا تھا۔

ہر سو انتظار کا انقباض گھلا تھا،سب صنوبر کی اجازت کے طلبگار تھے۔کہ دروازہ توڑ کر بڑی بی بی جی کی خبر لی جائے جو نماز کے وقت صحن میں نکل آتی تھیں لیکن آج دن چڑھ آیا تھا

کسی دستک کسی پکار کا کوئی جواب نہ تھا۔ صنوبر حیران تھی کہ وہ اجازتوں کی اہل کیسے ہوگئی۔ وہ بھی بڑی بی بی جی کے لیے اجازت۔

وہ کہنا چاہتی تھی۔

''جو مناسب ہے وہی کرو۔''

پر زبان حلق میں جیسے بل کھا گئی۔ شدید پیاس سے ہچکی لگ گئی۔ گھٹنوں کی پشت والے گڑھے پسینے سے بھر گئے۔ سرکنڈے کی تیز نوکوں جیسے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اُس کے قدموں سے دور بیٹھے ریحانے کے دونوں جڑے ہوئے ہاتھ سر سے اوپر اُٹھے تھے اور سر صنوبر کے پیروں کی سیدھ میں جھکا تھا۔

چھوٹی بی بی جی! اجازت دیں۔ حکم بادشہزادی جی حکم.... ہم نوکر بندے فیصلے نہیں کر سکتے۔''

وہ بدن کی لرزش چھپانے کو بیٹھ گئی لیکن پنڈلیاں پھر بھی باہم ٹکراتی تھیں۔ سردی لگ کر بخار چڑھ رہا ہو جیسے۔ وہ عمر میں پہلی بار کسی حکم کی اہل قرار دی جارہی تھی۔ لیکن یہ حکم اُس کی اوقات سے بہت بھاری تھا۔ بڑی بی بی جی کے لیے حکم؟

پتا نہیں کیسے سر اثبات میں ہل گیا۔

ملازم دیوانہ وار دروازہ کھولنے کی تگ و دو میں لگ گئے۔

خادمائیں گھٹے گھٹے بین اُٹھانے لگیں۔ چہرے آنسوؤں سے تر عمر بھر کی وفاشعاریاں نبھانے لگیں۔ فطرت میں رچی نسلوں میں اُتری شدید وابستگی کرلانے لگی۔

تبھی اندر سے مہین سی صدا ابھری اور دروازہ کھل گیا۔ وہ کوئی ہیولا سا تھا جس نے چٹخنی اُتاری اور پھر بستر پر اندھا گیا۔ بڑی بی بی جی کا مسخ شدہ عکس کوئی، خود بڑی بی بی جی تو نہ تھیں۔ صنوبر ہنس دی۔ بھلا بی بی جی کی آنکھوں کے سامنے دروازہ توڑ دیا جائے۔ اتنا بڑا نقصان ان کی برداشت میں کیسے آسکتا تھا۔ وہ تو قبر میں سے بھی بول پڑیں یہ تو پھر بند کمرہ تھا۔

سبھی ملازم دروازے پر ساکت ہو گئے۔

"چھوٹی بی بی جی آپ اندر جا کر ملاحظہ کریں۔ہم خادموں کا اختیار نہیں ہے۔

وہ کب کبھی اختیار کے قابل ہوئی تھی اور پھر بڑی بی بی جی کا اختیار کہ حال احوال جان سکے اُنھیں چھو سکے۔ بات کر سکے....اس احساس نے بدن میں رعشہ دوڑا دیا۔ وہ تو کتنے طویل برسوں سے کبھی کسی سے مخاطب ہی نہ ہوئی تھی۔کبھی کبھار خود سے بول کر دیکھتی کیا قوتِ گویائی کھو چکی کہ ابھی بھی نطق زندہ ہے پھر بڑی بی بی جی سے ہم کلام ہونے کی جرأت جو دروازہ کھول کر دوبارہ بستر پر گر چکی تھیں۔شاید بے ہوش ہو گئی تھیں لیکن صنوبر پورے وجود سے لرزتی ہوئی منتظر تھی کہ ابھی دھاڑ آئے گی۔

"اے گدھی یہ کیا تماشا لگوا رکھا ہے۔تو کیا سمجھی میں مر گئی تو زمینوں جائیدادوں کی وارث ہو گئی۔ابھی جیتی ہوں تجھے مار کر ہی مروں گی۔ تیری حسرتیں نہ پوری ہونے دوں گی میں جیتی ہوں، جیتی رہوں گی،" لیکن وہ نہیں بول پا رہی تھیں۔ ہر پل دھاڑنے والا حلق خاموش تھا۔لفظوں کے انبار سنٹھ تھے۔گالیوں بددعاؤں کے سرچشمے خشک تھے۔

فطرت کا ٹھٹھہ، بڑی بی بی جی بیمار ہو سکتی ہیں۔وہ کمزور ہو سکتی ہیں۔وہ دوسروں کے فیصلے کی مرہونِ منت ہو سکتی ہیں۔وہ خاموش ہو سکتی ہیں اور کیا وہ مر بھی سکتی ہیں۔

یہ فطرت کتنی بے رحم ہے۔نہیں دیکھتی انسانوں کو، طاقتوں کو اقتدار کو، عہدوں کو، عظمتوں کو، قیمتی اناج اور بے کار جڑی بوٹی کی تمیز سے لاپروا۔ فاشسٹ، کمیونسٹ۔ ڈاکٹر نے ڈرپ لگائی وہ ہوش میں آ گئیں۔

ٹیسٹوں کے رزلٹ آئے۔وہ گردوں کی بیماری کی آخری سٹیج پر تھیں۔

خون میں یوریا اس قدر گھل چکا تھا کہ دیوانگی بن کر دماغ کو چڑھ رہا تھا۔دماغ چیخ کر حلق میں آ رہا تھا۔نیند کی گولیاں بے اثر ہو گئی تھیں۔چوبیسوں گھنٹے جاگتا دماغ جس میں بھرے واہمے اور خدشے چنگھاڑتے ادھم مچاتے تھے۔جن کا ہدف صنوبر تھی۔

یہ زمینیں اپنے مالک کی حالت سے کس قدر لا پرواتھیں۔ نہری پانیوں سے سیراب ہوتے زمے پھل سے لدے ہوئے جن کے اندر چاندی کے سکے بھرے تھے۔ چند دنوں میں یہ منہ کھول چاندی لٹانے لگیں گے۔ ابھی تجوریاں بند تھیں اور فصلوں پر سحر دوپہر میں بھی رات اُترتی تھی۔ جیسے ہری مخمل کے تھان تاحد نظر سرسراتے ہوں۔ جن پر ہرے پتوں گلابی اور موتیا رنگ پھولوں کی کشیدہ کاری ہوئی ہو۔ جو دریائی پانیوں میں دھلتے اور دکھن کی ہواؤں میں لہراتے۔ اس احساس سے قطع نظر کہ اُن کی مالکن کس قدر اذیت ناک تڑپ پھڑک سے دوچار ہے صرف اُن کے غم میں اور وہ نجانے کس کے نصیب میں ہونے والے ہیں۔

منشی ریحان صبح وشام دست بستہ حاضر ہوتا۔

''چھوٹی بی بی صاحب جی! حکم کریں۔ بڑی بی بی صاحب جی کو ہسپتال لے جائیں۔ ہماری نوکروں کی کیا مجال کہ خود سے ہسپتال لے جائیں۔ بُرا وقت آتا ہے کٹ جاتا ہے۔ آپ حوصلہ کریں چھوٹی بی بی جی۔ آپ اجازت دیں آپ ساتھ چلیں۔ آپ.... آپ.... آپ....

ساری اجازتیں اُس کی مرہونِ منت ہوگئیں۔ اب اُس کا اختیار کہ بی بی جی کا مستقبل کیا ہوگا۔ کیسا بوجھ لد گیا اُس پر۔ فیصلے کا بوجھ۔ فیصلہ بھی بڑی بی بی جی کا....''

زبان لڑکھڑانے لگی۔ خشک حلق میں لفظ کانٹا سے پروئے گئے۔

''جیسے تمہاری مرضی۔''

''نہ چھوٹی بی بی جی صاحب! مجھ ملازم کی کیا مرضی۔ مرضی تو آپ کی ہوگئی۔ فیصلہ آپ کا ہوگا۔ حکم آپ کا ہوگا جو بھی ہوگا۔ ہم حکم کے غلام۔ باندے بردے۔ حکم ہو تو ایمبولینس بلائیں۔''

منشی ریحان دس فٹ دور اکڑوں بیٹھا گردن زمین تک جھکائے آنسوؤں سے فرش

بھگوتا تھا۔

پس منظر میں بڑی بی بی جی کے چیخنے چلانے کی آوازیں جیسے اسے دکھ دیتی ہوں۔ عظمت کے مینارے تڑختے ہوں۔

''ہائے یہ گدھی کون ہوتی ہے میرے فیصلے کرنے والی۔ میں حکم دیتی ہوں مجھے ڈاکٹر کے پاس لے کر چلو۔ یہ مجھے گھر ڈال کر مارے گی ہائے میری جاگیروں پر قبضے۔ ہائے میرے رقبے.....''

ملازمائیں اُنھیں دلاسے دیتے ہوئے آنسوؤں میں ڈوب جاتی تھیں۔

''ہائے بی بی بادشہزادی۔ علاقے کی سردار، مائی باپ، نسلوں پیڑھیوں نے انہی کا رزق کھایا۔ ہم حکم کے باندے بردے۔ پر، وارثوں کی اجازت کے بنا اپنی کیسے کریں۔''

صنوبر کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے وارث! وہ بھی بڑی بی بی جی کی وارث۔ فیصلہ وہ بھی بڑی بی بی جی کے مستقبل کا فیصلہ۔

''چھوٹی بی بی صاحب جی آپ فیصلہ کریں۔ ہسپتال جانا چاہیے۔ نہیں دیکھا جاتا اُنھیں تڑپتے ہوئے چیختے چلاتے ہوئے۔ یہ ہاتھ بندھے ہیں ہمارے۔ آرڈر کریں۔ حکم.....''

بڑی بی بی جی کی چیخ پکار اور تڑپ پھڑک سے حویلی گونجتی تھی۔

''یہ ہوتی کون ہے آرڈر کرنے والی۔ ہائے تعویذ، ہائے جادو۔ مجھے مارنے کی سازش۔ بلاؤ اس گدھی کو۔ ساری عمر میری سوکن بنی رہی۔ اب میری قاتل بن رہی ہے۔ جادوٹونے بدلے لے رہی ہے۔ ہائے کوئی زہرمہرہ۔ زمینوں کے لیے ماں کو مروا رہی ہے۔ بلاؤ اس سورنی کو ذرا پوچھوں۔''

ایسے ہر موقع پر ملازمائیں اُسے بلانے کو بھاگتیں۔

''جلدی آئیں چھوٹی بی بی جی آپ کو یاد کر رہی ہیں۔''

وہ بھاگ کر آتی جیسے بروقت نہ پہنچی تو وہ مر جائیں گی۔

لیکن چوکھٹ پر قدم زنجیر ہو جاتے۔

ملازمائیں منت سماجت کرتیں۔

''اندر جائیں بی بی جی! رات بھر آپ کو یاد کیا ہے۔ جو سکون آپ کے وجود سے ملے گا وہ ہماتڑ سے تو نہیں نا۔ گھڑی دو گھڑی گوڈے سے لگ کر بیٹھیں۔ کوئی ہاتھ پیر دبائیں۔ آپ کے لمس سے ہی اُنھیں سکون ملے گا۔ آخر دھی دھیانی ہو۔ ہم تو نوکر باندے۔''

وہ کیوں دھی دھیانی کے منصب پر خود کو فائز نہیں کر پا رہی، اُس کے ہاتھ چھونے کو کیوں نہیں بڑھتے، کلائیوں کے سروں پر ٹنڈ منڈ مجمّد کیوں ہیں۔ اُس کا دل کیوں بھر بھر نہیں آتا۔ خشک تھور کیوں بنا ہے۔

کیا وڈی ملکانی صاحب سارے حکموں کی مالک چار پائی پر پڑتے ہی بے بس ہو گئیں۔ یہ سیکڑوں ملازم حکم کے غلام ڈرتے تھے۔ اگر ہسپتال میں کچھ ہو گیا تو ذمہ داری کس کی ہو گی۔ کیا وہ اپنی ذمہ داری بھی خود نہ لے سکتی تھیں۔ اپنے بارے میں کیا ہوا فیصلہ بھی اپنے ہی ملازموں سے نہ منوا سکتی تھیں۔ یہ جو بڑی بی بی جی کی ساری عقل و دانش کو زیر کر رہا ہے۔ یہ کوئی بیماری ہے مرض ہے کہ کوئی گھس بیٹھیا ہے۔

جو اُن کے وجود میں، حلق میں دماغ میں بارودی سرنگیں بچھا رہا ہے۔ جو ہر ہر لمحہ پھٹتی ہیں۔ بعض اوقات صنوبر ان شدید دھاکوں سے گھبرا کر باہر نکل آتی ہے۔ لیکن کمرے کی چوکھٹ پر پہنچ کر ساکت ہو جاتی ہے۔ یہ کون اُس کے اندر پنجے گاڑے بیٹھا ہے، سیاہ ریچھ سا۔ جو اُن کی زندگی اور موت کے بیچ حائل علاج کے حکم کو صادر نہیں ہونے دیتا یہ کون ہے جس نے صنوبر کے لب بستہ کر دیے ہیں۔

شاید وہی موت کا پُراسرار احساس جو صنوبر کو محسوس ہو جاتا ہے اور وہ جانتے ہوئے بھی موت کے زرد حنوطی ہاتھ کو اُن کی سمت بڑھنے کی اجازت دے رہی ہے۔ اُس کی زبان

ہے یہ ایک جملہ ادا نہیں ہو پا رہا۔

"بڑی بی بی جی کو ہسپتال لے چلو۔"

کوئی ہے جو اس ایک جملے کی ادائی سے روک رہا ہے۔ خادمائیں اک دوجی کے کان سے لگی رہتیں۔

"ہائے ہائے ماں کی بے حرمتی۔ نہ دکھ سنتی ہے نہ پاس بیٹھتی ہے۔ نہ علاج کی اجازت دیتی ہے۔ گھر ڈال کے مارے گی ظلمن، جیسے اس نے خود تو کبھی مرنا ہی نہیں۔ ہائے سگی ماں کی بے حرمتی....."

دہلیز پر قدم رکھتے ہی وہ رک کیوں جاتی ہے۔ پیر چوکھٹ سے آگے کیوں نہیں بڑھتا۔

وہ ساری گالیاں ساری بددعائیں جیسے رستے میں آن کھڑی ہوتیں اور قدم جکڑ لیتیں کہ فطرت کا یہ شدید المیہ وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

طاقت کو اقتدار کو یوں بوند بوند مرتے ہوئے، مٹتے ہوئے، حکم کو ساقط ہوتے ہوئے وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ سردار کو اس حال میں نہیں دیکھ سکتی۔ ہڈیوں کا پنجر، مختل دماغ، قطرہ قطرہ خوراک، جو حلق اُلٹ دیتا تھا۔ ٹھٹھہ کرتے تھے وہ کالے تیتر اور بٹیر، وہ مرغ مسلم اور بھنے بکرے۔ ٹھٹھہ کرتے تھے وہ انواع و اقسام کے پھل اور میوہ جات نہیں دیکھ سکتی تھی وہ طاقت کو فاقہ کشی میں، عقلِ کل کو حواس باختگی میں، قوت کو نزاری میں، نہیں دیکھ سکتی تھی وہ نفاست کو بدبوؤں میں.... ٹھٹھہ کرتی تھیں وہ پوشاکیں جو مہنگی خوشبوؤں میں بھیگی صندوقوں میں بند تھیں۔ بے کار پڑے تھے قیمتی خوشبوؤں والے صابن کریمیں پاؤڈر اور پرفیوم۔ جنھیں چھونے کی اجازت صنوبر کو کبھی نہ ہوئی تھی۔

ریحان ہاتھ جوڑتا تھا۔

"دیر نہ کریں چھوٹی بی بی جی! حکم کریں۔ وقت ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔"

سارے تحکم۔ گرج دار حکم۔ ساری پوشاکیں، خوراکیں، خوشبوئیں، طاقتیں اس قدر لاغر، بے بس۔ کیا بڑی بی بی جی کو اُس کے سامنے یوں کمزور پڑنا چاہیے تھا۔ اُس کے سامنے یوں ذرا ذرا مرنا چاہیے تھا۔ صنوبر جیسے فالتو سر کی اک جنبش کا محتاج ہونا چاہیے تھا۔ اُن کے احکامات کو یوں زائد المیعاد ہونا چاہیے تھا۔ اس فطرت کو بھی کیسے کیسے مذاق سوجھتے ہیں۔

"ہائے ماں کا حق معاف نہیں ہونے والا پکڑ آئے گی۔ حساب دینا ہوگا۔ جو ماں کے ساتھ کیا بھگتنا ہوگا۔ بھگت کے مرے گی۔"

اُسے لگتا یہ خادمائیں نہیں خود بڑی بی بی جی بول رہی ہیں۔ اُن کی بددعائیں ملازماؤں کی زبان پر منتقل ہوگئی ہیں۔ وہ بددعائیں جو راہ میں ہی اوندھا جاتی تھیں۔ اُنھیں اذنِ سفر مل گیا ہے۔ وہ خود تو کچھ دنوں سے قوتِ گویائی بھی کھو چکی تھیں لیکن اُن کا مافی الضمیر خادماؤں کی زبان پر جیسے منتقل ہو گیا تھا۔ وہ حلق جو عمر بھر چیختا دھاڑتا کبھی خاموش نہ ہوتا تھا۔ وہ سنٹھ ہو گیا جیسے صنوبر سنٹھ ہوگئی تھی۔ کیا گزرتی ہو گی اندر ہی اندر گھڑ گھڑاتے بجتے چٹختے دماغ پر۔

ریحانا کمر خم کیے سر سینے تک جھکائے ہاتھ باندھے پھر حاضر ہوا تھا۔

"چھوٹی بی بی جی حکم اجازت...."

دفعتاً مل جانے والی اجازتوں کا منصب استعمال کرنے کا حوصلہ کیوں نہیں تھا اُس میں۔ عمر بھر کی عادت نے لب سی دیے تھے۔ کان سیسہ بنا دیے تھے۔ ٹھنٹھ وجودرات کے پچھلے پہر برف کے بلاکوں میں یخ بستہ ہو گیا۔ نومبر کی پہلی تاریخ کو اتنی سردی تو نہ تھی۔ جتنی اُس کے وجود کو چڑھ رہی تھی، جیسے برف کے تابوت میں لیٹی ہو کہ کافور کا کفن پہنا ہو کسی یخ ٹھنڈی سرنگ میں اُترتی چلی گئی۔

جب اُس کا دروازہ دھڑ دھڑ کھڑکا۔ تو جیسے زرد حنوطی ہاتھوں کی موت انگلیاں نازک

ریشم سی شہ رگ کو دبوچتی تھیں۔ وہ تو کئی روز سے اس دستک کی منتظر تھی۔ وہ تو موت تحریر پڑھنے کے منصب پر فائز ہو گئی تھی۔

کتاب چہرہ جس پر دکھ، خوشی، کرودھ، عناد، جھوٹ سچ سب خود کو لکھ دیتا ہے تو پھر موت تار کیوں نہیں بھیجا جاتا ہے لیکن نہ سمجھ آنے والی زبان میں کھنڈروں کی مہروں جیسی زبان میں یہ تار پڑھنے کا عذاب ہر بار صنوبر کو ہی کیوں جھیلنا ہوتا تھا۔ کیا اس ہڑپا بستی میں وہی پڑھی لکھی تھی۔ دور نزدیک بیاہی ہوئی ساری لڑکیاں جمع ہو چکی تھیں۔ جن کے لمبے لمبے بین پورے گاؤں کو لپیٹے ہوئے تھے۔

''اج پنڈ اجڑ گیا۔ اج جگ مک گیا ہما شما کی سننے والی نہ رہی۔ ساری خدائی کے دکھ بانٹنے والی۔ ساری لوکائی کے کام آنے والی، وڈی ملکانی ٹر گئی۔ پنڈ لا وارثا رہ گیا جہاں چڑی پر نہ مارتی تھی۔ وہاں اب سوّر فصلیں اجاڑیں گے۔ ہائے اج سارے جگ دیاں بادشاہیاں گزر گئیاں۔''

صنوبر کے حلق سے کوئی بین کیوں نہ چھٹتا تھا۔ عورتیں منہ پر چادریں ڈالے اُسے بھینچ بھینچ کر لاتی تھیں پر اُس کی آنکھ سے کوئی آنسو کیوں نہ پھوٹتا تھا۔ ازل اور ابد کی چپ کیوں ثبت تھی ہونٹوں پر۔

جیسے کہتی ہو۔

''میں کبھی بولی جواب بولوں۔''

عورتیں دہائی دیتی تھیں۔

''آ چھوٹی بی بی اپنی ماں پر پانی کے دو بک ڈال۔ اپنا حق معاف کروا اور ان کا حق معاف کر۔ آ بی بی اپنی سردار ماں کو آپ غسل دے۔''

صنوبر حیران کھڑی تھی۔

کیا قاتل کو مقتول کے غسل میں شامل ہونا چاہیے۔ کیا قاتل کو مقتول کے ماتم میں

شریک ہونا چاہیے۔

اس خاندان کی ہر موت میں صنوبر کا شریک کار ہو جانا کیوں ضروری تھا۔ وہ جو موت سے پہلے موت کو دیکھ لیتی تھی۔ موت کی زرد تحریر پڑھ لیتی تھی اور تماشا کرتی تھی ویوچ لینے کا جیسے بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے۔ اُس کے کانوں میں بڑی بی بی جی کے بین گونجتے تھے۔

"ہائے بھائیوں کی قاتل، ہائے باپ کی قاتل، کول کھلو کے مرتے دیکھتی رہی سب کو...."

صنوبر کو لگا اُس کے حلق کے سارے توپے یکبارگی اکھڑ جائیں گے اور عمروں صدیوں کی سنتھ آواز گونجدار ہو باہر نکلے گی۔

"ہائے سگی ماں کی قاتل۔"

■■■■

چھوٹی بی بی صاحب

اس بند چار دیواری میں اتنی وسعتیں بھی چھپی تھیں۔ اتنی کشادگیاں اتنے کھلے آسمان بھی سمٹے تھے۔ اتنے پرندے بھی چہچہاتے تھے۔ اتنے چہرے اتنی کہانیاں، اتنے دکھ سکھ، اتنی زندگی، اتنی ہماہمی، اتنی ہلچل بھی بند تھی۔ اُسے تو عمر بھر کوئی حرکت محسوس ہی نہ ہوئی۔ سوائے لاروؤں کی سرسراہٹ اندھیرے کے کیڑوں کی کلبلاہٹ کتابوں کی جلدوں میں استری شدہ کرموں کی پھڑ پھڑاہٹ، حوادث کی چیخ پکار اور آنسوؤں کی ڈبڈباہٹ نمکاہٹ۔ کتابوں کے ٹھنٹھ میں پتھر دھڑ شہزادی کو زندگی کی دھڑکن کبھی سنائی ہی نہ دی۔ یہ کتابیں تو اندھی غاریں مردہ بے جان تصویریں۔ دور بین سے دیکھی ہوئی خاموش مورتیاں، کتابوں کے بے جان تابوتوں میں سڑتی ہوئی پتھر تمثیلیں۔ ان سب میں صنوبر کہاں تھی، کہیں نہ تھی کبھی نہ تھی۔ دوسرے تھے، اجنبی غیر شناسا، دوسروں کی کامیابیاں اور ناکامیاں، کشمکش اور تصادم، عمل اور ردِ عمل، زندگی اور فعالیتیں۔ اُس کی اپنی کامیابیاں اور ناکامیاں کہاں تھیں اپنا عمل اور ردِ عمل کدھر تھا۔ کارزارِ حیات سے بہت دور کہیں محبوس۔ کتابوں کے مردہ ڈھنڈاروں کی تنہا تاریک دیواروں میں چن دیا گیا تھا۔

معطل سوچ، پر کٹی فکر، گونگے حروف، جن کتابوں سے وہ عمر بھر اشاروں کی زبان میں باتیں کرتی رہی تھی۔ وہ تو لکھی ہی کسی غیر شناسا زبان میں گئی تھیں۔ نہ سمجھ آنے والی لیکن یہ مردہ تابوت زندگی کی ہمسائیگی میں گڑے تھے۔ یہ زندان خانہ، آبادی کے پڑوس میں دفن تھا۔ لیکن اُسے اوک بھر فاصلے سے کبھی جھانکنے کی اجازت نہ ہوئی۔ زندگی کُش کتابوں میں سے کبھی کوئی روزن نہ بنا، کوئی سورج کی کترن کسی بارش کی بوند، کسی ہوا کی سرسراہٹ، کسی آزاد پرندے کی چہچہاہٹ سنائی دکھائی ہی نہ دیے۔ اب یہ کیا کہ یکبارگی سارے آسمان تمام فضائیں کل کائناتیں ہوائیں ساری زمین اور کل خدائی ساری آزادیوں کے ہمراہ بازو پھیلائے چلی آتی ہیں۔ صنوبر کو حیرت ہوئی ہر ہر شے آزاد ہے۔ جو اپنی فطرت کے ساتھ جیتی مرتی ہے۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو اپنے جیسے انسانوں کی قید میں جیتا مرتا ہے۔ انسان کا انسان کو قیدی بنانے کا شوق اتنا ہی پرانا ہے جتنا پرانا خود خدا اور خدائی۔

اب جو حاکمیت اور محکومیت کا سارا عمل صنوبر تک منتقل ہو گیا تھا تو کیا اُسے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ دست بردار ہونا بھی چاہے تو یہ ازلی فلسفۂ حاکمیت خود اُسے دست بردار ہونے دے گا۔ حاکمیت و ملکیت خود ایک زندہ جسد ہے۔ جو نظریے کے مضبوط خول میں پلتا ہے۔ وہ اپنے کارکنان تبدیل تو کرتا رہتا ہے۔ خود کبھی تبدیل نہیں ہوتا۔ موت اور زوال ہر شے کی گھات میں بیٹھے ہیں۔ یہ زوال اور موت کے لیے اپنا جسد تو پیش کرتا ہے لیکن روح کسی اور جسد میں منتقل کر دیتا ہے۔ منشی ریحان کہتا تھا۔ اگر آپ چپہ چپہ کر کے اپنی ساری زمینیں ان محکوموں غلاموں میں تقسیم بھی کر دیں گی تو انھیں ملکیت کی عادت نہیں برداشت کا یارا نہیں۔

کوئی اور آئے گا جوان سے سب ہتھیا لے گا۔ کسی پرانی سائیکل، موٹر سائیکل، کسی چھلے مندری کسی پرانے ریڈیو ٹیلی ویژن کے بدلے۔ یہ سب بھی ان کے پاس نہیں رہیں گے وہ ہر فاقے میں ہر میلے شادی ختنے، بازی، تماشے میں ایک ایک شے بیچتے چلے جائیں

گے اور رہ جائیں گے بھوکے کے بھوکے۔ ابھی تو انھیں آپ کے طفیل روٹی مل رہی ہے پھر یہ بھی وسیلہ نہ رہے گا۔ اگر آپ اپنے پیسوں روپوں سے ٹھنسے بینک بھی خالی کر دیں گی تو یہ کھا اجاڑ جائیں گے۔ اتنا کھائیں گے کہ بیمار پڑ جائیں گئے۔ پھر بھی کھاتے رہیں گے۔ الٹیاں اور جلاب کرتے کرتے مر جائیں گے یا پھر اُس وقت تک کہ دوبارہ فاقوں میں نہ آجائیں۔ جیسے ملک اکو اور صابو.... ملکیتیں تو آپ کو ہی اُٹھانی پڑیں گی چھوٹی بی بی صاحب "لا ضروری ہے...."

صنوبر سوچتی تھی اگر وہ منشی ریحان کو ملکیت دے دے تو وہ برداشت تو کر جائے گا۔ لیکن فرق یہی پڑے گا کہ مالک بدل جائے گا ملازم نہیں بدلیں گے۔ بلکہ زیادہ کم ظرف مالک تو پھر ملکیت کے منصب پر موروثیت ہی کیوں نا۔ جسے برتنے سمیٹنے کا نسلی سلیقہ تو ہے۔

ملکیت اور حاکمیت کے بار تلے کپکپاتی صنوبر یہ بوجھ اُٹھا لے گی کیونکہ طاقت اور حاکمیت کے ازلی نظریے نے خود اُس کا انتخاب کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے برسوں کی حکمت عملی سے منصوبہ بنایا ہے۔ اقتدار کی منتقلی کا منصوبہ اور اقتدار بحفاظت اُس تک پہنچایا ہے۔

روئیدگی کے بادل جب کھل کر برستے ہیں تو سنٹھ شجر سرسبز ہو جاتے ہیں۔ مٹی کی کوکھ میں دفن مردہ بیج سانس لینے لگتے ہیں۔ پتھر نہنگ جاگ جاتے ہیں۔ مردہ مینڈکوں مچھلیوں میں جان پڑ جاتی ہے۔ حاکمیت و ملکیت نے بھی جب صنوبر کا انتخاب کیا تو اپنی ثمر دار بارشوں سے اُسے اپنے مطابق بنانے کا عمل بھی شروع کر دیا۔ صنوبر کے دیکھنے کا زاویہ ہی بدل گیا تھا۔ اشیا کی ہیئت ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ بلندی سے دیکھنے کا انداز فرق تھا۔ لوگ کس قدر ٹھگنے لگنے لگے تھے۔ وہ جو عمر بھر "گھٹے مٹھ" کے طعنے میں کبڑی رہی، کمر کی خمیدہ ہڈی اقتدار کی اکڑ میں سیدھی ہوئی تو سرو قد ہو گئی۔

فضائیں کس قدر کشادہ، زمینیں کس قدر وسیع اُس نے تو کبھی سر اُٹھا کر دیکھا ہی نہ تھا کہ اُس کے سر کے برابر تو کوئی دوسرا سر تھا ہی نہیں۔ سبھی چھوٹے چھوٹے بونے۔ جن لڑکیوں

کی آزادیوں پر وہ عمر بھر رشک کرتی رہی تھی۔ وہ خودرو آزادیوں کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ دس بارہ جائز اور کئی ایک ناجائز بچے جن کرانہی میں کہیں تحلیل ہو چکی تھیں۔ زہریلے آک کی خشک جھاڑیاں۔ کئی ایک تو موجود ہی نہ تھیں کسی جائز ناجائز زچگی کے دوران ہی مرگئی تھیں جو موجود تھیں اُن کی سمت بڑھتے ہوئے حنائی ہاتھ صنوبر دیکھ سکتی تھی۔ لیکن انتہائی سست روی سے، جیسے چکی کی باریک پسائی میں مرچیں پستی ہوں۔ وہ قطرہ قطرہ بوند بوند مر رہی تھیں۔ خوراک کی قلت سے، بیماریوں سے، مشقتوں سے، دکھوں سے، زچگیوں سے، آنسوؤں سے۔ الٹے ہوئے سیاہ مسوڑھے جن میں ٹنگی ہوئی بیمار دانتوں کی اِکا دُکا کرچیاں۔ کتلیوں کی طرح سیدھی کھڑی۔ گوشت اور خون کی قلت سے سینے کی ہڈیاں باہر الٹی ہوئیں جن پر سوکھا ہوا ناکافی چمڑا کھنچ کر منڈھا تھا۔ جیسے ابھی جا جا سے ترخ جائے گا۔ یہ وہی تھیں جن کے سینے پر کبوتر آلنے ڈالتے تھے اور غٹرغوں غٹرغوں کھیلتے تھے۔ اب کمزور ہڈیوں کے کڑکنے کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں۔

کیا وہ عمر بھر انہی آزادیوں پر رشک کرتی رہی تھی۔ یہی آزادیاں جنھوں نے حشر سامانیاں اُٹھادی تھیں۔ اور پھر اس قیامت میں سے کوئی بھی بچ کر نہ نکل سکی۔ لیکن ایک اور پود تیار کردی حشر سامانیاں اُٹھانے کو.... تیرہ تیرہ چودہ چودہ برس کی یہ پوری پود اس لطف اور سرخوشی کے جہنم کا ایندھن بننے کو تیار کھڑی تھی۔ جنھیں جل مرنا تھا۔ پتنگوں کی حیات جیسی۔ جن کے ڈھیر ساون بھادوں کی راتوں میں ہر روشنی ہر مشعل تلے لگے ہوتے۔ خاکستری پروں اور لاروؤں سے سوختہ بدنوں کی ڈھیریاں۔

چلو سارے حسن و شباب نخرے ناز مختصر زندگی رکھتے تھے لیکن جی بھر کر ہنڈایا تو سہی۔ ہنڈا ہنڈا کر لیرو لیر کر دیا چیتھڑے اُڑا دیے۔ اپنے ہی وجود کے، ایک ایک پل کو اتنا جیا کہ جینا ختم ہو گیا اُن پر سے۔ اتنا حصہ وصول کیا کہ یکبارگی سارا نوچ لیا۔ جیسے ملک اکو اور ملک صابو نے زمینیں دولتیں لٹادی تھیں۔ انھوں نے خود کو لٹا دیا۔ نیلامی لگا دی۔

ایک یہ صنوبر کیا کہ ابھی بونی بھی نہ ہوئی اور ہٹی بند بھی ہوگئی۔ جو راتوں کی تنہا عفریت میں قطرہ قطرہ پگھلتی۔ نیند جس کے پپوٹوں سے کہیں باہر اُس کے اردگرد پھیلے بڑے بڑے خزانوں میں سوتی تھی۔ جو بیٹھے بیٹھے اونگھ جاتی تھیں۔ کھڑے کھڑے جمائیاں لیتی تھیں۔ کھڑی بان کی چار پائی کہ کچا پکا فرش، نیند سے چور، خوابوں میں مخمور یہ چیتھڑا چیتھڑا عورتیں نیند کے خزانوں میں گچ۔

ایک یہ صنوبر جو برسوں سے جاگ رہی تھی۔ کتابیں پڑھتے پڑھتے کبھی کسی لمحے دماغ ہلکی سی جھپکی لے لیتا ورنہ وہ مدتوں سے ایک ٹک جاگتی رہی تھی۔ ہزار پاور کا بلب سر کے اندر جگتا ہوا۔ آخر وہ کیسے سوئے کہیں سے تو مٹھی بھر نیند ملے۔ کتابوں کی کال کوٹھری میں تو پھر بھی جھپکی موجود تھی۔ کتابوں کی کھال اُتار کر تو دماغ جیسے سورج کا گولا، جو سب بھسم کرتا کبھی آنکھ نہ جھپکتا۔ وہ کتابوں کے انباروں کو دیکھتی جن میں چلو بھر نیند پوشیدہ تھی۔ لیکن عجب وحشت بستی تھی۔ جیسے یہ کتابیں بھی ہڑپا کے مدفون ہوں۔ لیکن مدفونوں والے اسرار سے خالی، سب یکساں، سب ظاہر۔ مطلب ایک، لفظ ہزار۔ خود کو دہراتی اپنا ہی اعادہ کرتی دھوکا دیتی شاطر کتابیں۔ دماغ کا وحشی رسہ تڑا بھاگ نکلا تھا اور کسی ہانکے سے بھی واپس کتابوں کے باڑے میں نہ تاڑا جا رہا تھا۔

کتابوں کے اس انبار پر نظر پڑتے ہی آدھے سر کا درد، درد شقیقہ شروع ہو جاتا۔ جی متلانے لگتا۔ الٹیاں اور ابکائیاں اوندھانے لگتیں۔ زندان خانے کی سیاہ دیواریں یہ کتابیں، جن کے پیچھے اُس کی ساری جوانی مردہ پڑی تھی اُس کے جذبات واحساسات دفن۔ یہ کتابیں اُسے دشمن لگتیں۔ جنھوں نے چھین لیا تھا سب، زندگی، حسن، شباب۔ اب وہ خود کو آدھا چپہ بچا کر باہر لے ہی آئی تھی تو واپس کیوں دھکیلے۔ لیکن راتوں کی یہ عفریت اس بچے کھچے حصے کو بھی نگلنے کو دھاڑتی تھی۔

وہ غصے سے چلائی۔

''اے ستو، لکھو، بکھو بند کرو یہ خراٹے۔''

تولکھو بکھو ستو، ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتیں۔

''کیا کریں نکی بی بی جی! چہار پہر بھورے کر کر کے ہف جاتی ہیں۔ کبھی گھا پٹھا، کبھی رمبی گوڈی۔ کبھی مال منی، آخر تو یہ دو ہاتھ ہی ہیں نا، ہُٹ جاتے ہیں، تڑٹ جاتے ہیں۔''

کاش ایسا کچھ ہو کہ وہ بھی ہُٹ جائے۔ وہ بھی بھورے کر کر کے ہف جائے۔ تو اُسے بھی نیند آ جائے یہ راتوں کے نہنگ اُسے نگل نہ سکیں۔ وہ جتنی بچ پائی ہے تو بچی رہے لیکن کیسے۔ وہ خود فیصلہ کر سکتی ہے۔ لیکن فیصلہ تو اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی صورت احوال سامنے ہو۔ اُس کے پاس فیصلے والا اختیار موجود ہے۔ جو چاہے جس طرح چاہے کر سکتی ہے۔ یہ ریحان کون ہوتا ہے رکاوٹ بننے والا۔ لیکن وہ اُس کے ہر فیصلے کے سامنے غیر محسوس طریقے سے رکاوٹ بن جاتا۔ اُس کی یہ جرأت! لیکن وہ جرأت نہ رکھتے ہوئے بھی کہیں سے اُس کے اور اُس کے فیصلے کے بیچ حائل ہو جاتا۔

صنوبر نے سوچا تھا۔ اگر وہ بینکوں میں اٹی پڑی رقم سے کچھ رعیت میں تقسیم کرنے لگے تو کئی روز یہ دن رات کی مصروفیت بن سکتی ہے۔

لیکن منشی ریحان کہتا تھا۔

''چھوٹی بی بی جی! سوچ تو بہت اچھی ہے ارادہ بھی نیک ہے لیکن ہم کنگلوں نے کبھی پیسہ نہیں دیکھا۔ کوئی مرنڈ ٹانگر کوئی پکوڑا سموسہ، جو بچا وہ خویش قبیلے کو دکھا دکھا جلا جلا مار ڈالیں گے۔ ذرا ذرا کر کے سب اُڑ جائے گا۔ ابھی تو امن امان رقمیں یک مشت پڑی ہیں۔ پھر کسی کے ہاتھ کچھ بھی نہیں رہے گا جیسے آندھی بھوسے کا ڈھیر اُڑا صفا چٹ کر دیتی ہے۔''

اُس نے سوچا تھا وہ کوئی سکول بنوا دے۔

منشی ریحان کہتا تھا ''سوچ تو بہت اچھی ہے پر بچے کہاں سے آئیں گے۔ پہلے بنے ہوئے سکول سارے خالی پڑے ہیں۔ چاہے مفت بھی تعلیم ہو لیکن ان بچوں کے حصے کا کام

کون کرے گا۔ ہر ماں باپ کو پھر ایک ایک نوکر بھی رکھ کر دینا پڑے گا۔ پھر چھوٹی بی بی جی! پڑھ لکھ کر کسی کام کے نہ رہیں گے۔ شہروں میں نوکریاں مانگیں گے جو ملیں گی نہیں اور ہماری زمینیں بنا کاشت رہ جائیں گی۔

اُس نے سوچا تھا وہ ہسپتال بنوا دے۔ اس پر تو منشی ریحان بہت ہی ہنسا تھا۔

چھوٹی بی بی جی! آپ کو پتا ہے سرکاری ہسپتال خالی پڑا ہے۔ یہ جو گاؤں کا ڈاکٹر ہے نا دنیا اسی کے پاس جاتی ہے۔ نہ پڑھا نہ لکھا نہ ڈگری نہ ڈاکٹری۔ پر ایمان ہے لوگوں کا، شفا ہے اُس کے ہاتھ میں، چاہے راکھ کی چٹکی دے دے اندھا اعتماد۔ اس سے بھی زیادہ اعتبار بابا جنڈی پیر پر۔ کون انگریزی ہسپتالوں میں جائے گا خالی پڑا رہے گا۔ باقی حکم تو آپ کا ہے۔ چھوٹی بی بی جی! آرڈر کریں۔ جہاں کہیں کام شروع کروا دیتے ہیں۔ آپ مالک آپ حاکم۔ حکم آپ کا آرڈر آپ کا۔ ہم تو حکم کے غلام۔"

اس موت کے بعد صنوبر کو جو مقام و مرتبہ ملا اُس کی محدود سی سوچ میں تو کبھی سما ہی نہ سکتا تھا۔ پورے علاقے کے چھوٹے بڑے زمیندار اسمبلیوں کے ممبر اور آئندہ کے اُمیدوار، سارا پٹوار خانہ پورا تھانہ، تحصیل خانہ، اے سی، ڈی سی، جیسے سبھوں پر اس اہم موت کی تعزیت فرض تھی۔

یہ موت بھی کتنا بڑا ہنگامہ۔ خاموشی کتنی آوازوں میں رخصت ہوتی ہے۔ نیستی کتنی زندگی میں دفن ہوتی ہے۔

ساری تعزیتیں منشی ریحان وصول کرتا اور صنوبر تک پہنچاتا تھا۔ جس کی مصروفیت انتہا تھی۔ اُس کی نو جماعتیں بڑھ بڑھ کے کلام کرتی تھیں۔

"چھوٹی بی بی جی! تھانہ آیا۔ پٹوار خانہ اُترا۔

چھوٹی بی بی جی! وزیر صاحب آپ خود تشریف لائے ہیں۔"

ہر ایک کی تواضع چائے پانی کھانے طعام کا انتظام۔ منشی ریحان سب اصول و قواعد

سے خوب واقف تھا۔ وہ تو اس احساس سے ہی لرزنے لگتی کہ اتنے بڑے بڑے لوگ عہدے اور محکمے کیا اُس کے پاس چل کے آئے ہیں۔ کیونکہ وہ زمیندارنی ہوگئی ہے۔ بی بی صاحب جی ہوگئی ہے۔

سارے نوکر مزارعے سارا علاقہ سارے محکمے، سارے افسر جیسے اُس کی حفاظت پر مامور ہوگئے ہوں۔

اُس نے تو کتابوں میں پڑھا تھا کہ یوں کوئی عورت اکیلی رہ جائے تو پورا معاشرہ بھیڑیئے کے دانتوں میں کچکچاتا ہے۔ یہاں تو حالات اُلٹ تھے۔ نہ کوئی چاچا ماموں جیسا جائیداد یں ہتھیانے آیا۔ بلکہ جو کوئی قانونی وارث بھی بنے وہ دستبردار ہوگئے۔ اکو اور صابو کی مثالیں دیتے ہوئے۔

''توبہ توبہ ان زمینوں کی طرف تکنا بھی اپنے بچے مروانا ہے۔ بددعا ہے انھیں، اپنے ہر وارث کو مار دیتی ہیں۔ بددعائی ہوئی زمینیں۔''

ایک آوازہ تھا جو پورے علاقے میں گونجتا تھا۔ جیسے سبھی صنوبر کی جی داری پر اُسے اپنی حمایت دلاتے ہوں کہ اس جاگیر کا مالک ہونا کس دل گردے کا کام ہے جس کے بھیتر سیاہ چہرہ موت بستی ہے۔ ہلا شیری، مالک ہو کے دکھاؤ، شاباش قابض رہو۔ صنوبر کو تو عمر میں پہلی بار پتا چلا یہ زمینیں کتنا بڑا زعم۔ عجب اعتبار، طاقت، اقتدار، عزت، احترام، دیگر ساری طاقتیں، سارے اقتدار، ساری دولتیں، اس کے سامنے ہیچ۔

اُسے ان رشتہ داروں پر حیرت ہوئی۔ جو زمین کے نام پر ہی کانوں کی لویں چھونے لگتے۔ اُنھیں اُس تفاخر کا کیا اندازہ صنوبر کو بھی کب تھا جب تک کہ ان زمینوں نے خود بڑھ کر اُسے اپنی ملکیت کی عظمت سے سرشار نہ کر دیا۔ ملکیت کا احساس، تمام ممکنہ احساسات سے زیادہ نشیلا احساس، بے پناہ وقعت اپنے ہونے کا احساس ہوئے کا احساس۔

■■■■

ایک روز منشی ریحان جو تعزیت وصول کر کے لایا تھا۔ وہ اُس کے وجود سے کہیں بھاری تھی۔ جس کے بوجھ تلے اُس کی ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور چہرے کے سارے نقوش اصل حجم سے کہیں زیادہ پھیلاؤ میں چلے گئے تھے۔ اُس کی معتبر زبان لڑکھڑاتی تھی جیسے صنوبر کی لڑکھڑاتی تھی۔ آنکھوں کے گول گول ڈیلے دباؤ سے کھنچ کر اپنے چوکھٹے سے باہر نکل آئے تھے جیسے چھپکلی کے ڈیلے۔

''چھوٹی بی بی جی! ڈی سی صاحب آپ خود تعزیت کے لیے تشریف لائے ہیں۔''

زبان سے لفظوں کی ادائی تو ابھی صنوبر کے لیے ممکن نہ ہوئی تھی۔ لیکن اندر ہی اندر دل ہی دل میں لفظ جملوں کی شکل میں ڈھلنے لگے تھے۔

تو پھر تعزیت قبول کرلو اور کوئی تواضع.....

''چھوٹی بی بی جی! یہ ڈی سی صاحب ملک محمد اسلم صاحب ہیں۔''

''مگر وہ تو....''

پتا نہیں کس شدت سے صنوبر کی زبان کے توپے اکھڑ گئے تھے۔ حیرت، دکھ کہ خوشی کی شدت، کہ کوئی خفیہ سے فیصلے والی ممکنہ صورتِ حال کی شدت۔

''جی چھوٹی بی بی جی! زمانہ بدل گیا ہے۔ حکومت تبدیل ہوگئی ہے۔ قید و بند کی ذلتیں عدالتوں پیشیوں کی کلفتیں سہنے والے پھر سے اس ملک کے حکمران ہو گئے ہیں اور اپنے ساتھ لپیٹ میں آئے سبھی سرکاری افسروں کو اپنے عہدوں پر بحال کر دیا ہے ان میں محمد اسلم صاحب بھی ہیں جو ساہیوال ڈی سی کے عہدے پر تعینات ہوئے ہیں۔ تمام رکی ہوئی تنخواہیں واگزار ہوگئی ہیں۔ بلکہ نئے حکمرانوں کے منظورِ نظر بھی ٹھہرے ہیں۔ کیونکہ ماں کے اس جی دار نے کسی بھی تشدد ٹارچر سیل کسی بھی کال کوٹھری میں جھوٹ فریب کے سمجھوتے سے انکار کر دیا تھا۔''

جیسے ان ساری عظمتوں نے منشی ریحان کی گردن فخر سے اکڑا دی ہو اور وہ اپنے قد

سے بالشت بھر اونچا ہو گیا ہو۔

"وہی ملک محمد اسلم ڈی سی صاحب ساہیوال آپ سے خود تعزیت کرنا چاہتے ہیں۔"

صنوبر کو حیرت ہوئی نہ تو اُس کی ٹانگیں کپکپائیں نہ ہی حلق خشک ہوا۔ اُس نے اپنے جاگیرداری کے نئے نکور اعتماد سے پوچھا۔

"تو پھر"

"آپ ذرا دروازے تک تشریف لے چلیں صاحب آپ سے تعزیت کریں گے چھوٹی بی بی صاحب جی۔"

پچھلے ایک مہینے سے اُس کی باگ منشی ریحان کے ہاتھ میں تھی۔ کوئی مسئلہ کوئی فیصلہ آن پڑتا تو وہ انتظار کرتی کہ ریحان کے لفظوں کو اپنے لفظ بنا لے۔ اگر وہ بولنے میں توقف کر دیتا تو صنوبر کپکپانے لگتی۔

اب بول بھی چکو کیا کہنا ہے۔

وہ اُس کی کئی باپردہ ملاقاتیں کروا چکا تھا۔

وکیل، پٹواری، تحصیل دار، اے سی صاحبان۔

وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اُن کی بات سنتی۔ لیکن زبان سے کبھی کسی لفظ کی ادائی نہ کر پاتی۔ منشی ریحان کے لفظوں کی منتظر رہتی جو اس کی جانب سے خود ہی جواب دے دیتا۔

"بی بی صاحب جی فرما رہی ہیں کہ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائے۔ اب دوپہر کا کھانا کھا کر جایئے گا۔"

"بی بی صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ کے خاندان سے ہمارے خاندان کے تعلقات دو سو سال پرانے ہیں۔ جن کی ہم بہت قدر کرتے ہیں۔ بی بی صاحب ارشاد فرما رہی ہیں کہ....."

منشی ریحان ہر تعزیت کے لیے انتہائی موزوں و مناسب جواب تیار کر لیتا۔ جو علاقے کے ہر خاندان کے پورے شجرۂ نسب سے آگاہ تھا۔ ہر فرد کی پوری زندگی سے واقف تھا۔ ہر عہدے ہر محکمے کی پوری پہچان رکھتا تھا۔اسی سب کے تناظر میں جواب دیتا۔ اُس کی نو جماعتیں جیسے کوئی بتیس جماعتیں ہوں۔صنوبر تو ابھی لفظوں کے چناؤ کے عمل سے ہی دوچار ہوتی کہ منشی ریحان شافی جواب گھڑ کر دے بھی چکا ہوتا۔ ہر سوال کا جواب یوں مناسب و متناسب کہ صنوبر حیران کھڑی رہ جاتی کیا اُسے سوچنے دماغ میں اُترے لفظوں کو جملے میں پرونے اور پھیپھڑوں سے صوت نکالنے کے لیے وقت درکار نہیں ہوتا۔اُس کا عملِ تنفس کس سرعت سے کام کرتا۔ وہ ابھی کچھ بولنے کے لیے سانس اندر کھینچ رہی ہوتی کہ وہ جملہ اگل بھی دیتا۔

آج بھی وہ اُس کے کھونٹے سے بندھی دروازے کی اوٹ میں بڑی سی چادر میں چھپی کھڑی تھی۔

جب ماسٹر اللہ دتے کے بیٹے اچھو، محمد اسلم ڈی سی صاحب نے انتہائی گمبھیر لہجے اور نپے تلے لفظوں میں تعزیت کا آغاز کیا تو صنوبر کو لگا۔ اُس کے وجود میں گہری نیند سوئے سارے خاندانی سلسلے، سارے زعم یکبارگی بے دار ہو گئے ہیں، ساری کتابوں کے حرف اظہار پانے کو بے اختیار ہو رہے ہیں۔ سارے ایم اے یکبارگی مجتمع ہو گئے ہیں۔ سارے رٹے خود کو اگل دینا چاہتے ہیں۔ سارے از بر جملے آج ہی اپنی دہرائی چاہتے ہیں۔عمروں کے سارے سنتھ کلام بے قرار ہو اٹھے ہیں۔

منشی ریحان نے حسبِ دستور تعزیت کا جواب دینا چاہا۔

''چھوٹی بی بی صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ تشریف لائے ۔ آپ....''

صنوبر نے منشی ریحان کو یوں گھورا جیسے کہتی ہو۔بس اب تمہارے جملوں کی ضرورت

نہیں رہی۔ سنتھ حلق کو اذنِ گویائی مل گیا ہے۔ دماغ میں بنی لفظوں کی شبیہیں زبان پر اُترنے لگی ہیں۔ جو اُس پر کسی وحی کی طرح نازل ہو رہی ہیں۔

''میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں کیونکہ آپ کے قابل فخر والد صاحب نے مجھے اور میرے مرحوم بھائیوں کو لفظ کی شناخت کروائی اور ہمیں جہالت کے اندھیروں سے نکال کر علم کی روشنی سے ہمکنار کیا۔ ہمارے اندر علم و دانش کی جو بھی شمع روشن ہوئی وہ اُنہی کے طفیل تھی۔''

صنوبر کو لگا وہ کورس کی کتابوں کے جملوں کو دہرا رہی ہے۔ لفظوں کا سیلاب چڑھ دوڑا ہے۔ سارے ایم۔ اے ٹوٹ پڑے ہیں بس وہ بولتی جائے سنتی جائے۔ عمر بھر کا ان سنا ان کہا اپنا پورا حصہ وصول کر لے۔ اُس کا جی چاہا وہ اپنے لفظوں میں ملمع کرے اور خوب بڑھاتی چلی جائے کہ محمد اسلم اُس سے متاثر ہو جائے ڈی سی صاحب۔ اچانک بڑی بی بی جی کی دھاڑ کہیں سے ابھری اور وہ پیچھے دھکا کھا کر گری۔

''نہ گدھی یہ کیا کرتوت گھول رہی ہے۔ یہ ماسٹر اللہ دتے کا چھوکرا کیا ڈی سی ہو کر ہمارے مقابل آ گیا۔ یہ تیرے چہرے پر جو لالی کھِل رہی ہے تو خوب جانتی ہوں پر وہ نہ ہوگا جو تو چاہتی ہے۔ بڈھی دھتکاری ہوئی خاندان کی عزت سے کھلواڑ کر رہی ہے۔''

اُس نے منشی ریحان کو اشارہ کیا۔

ملاقات ختم۔

بڑی بی بی جی کے گونجیلے جملے اُسے مار کرتے پسپا کر گئے۔ ساری ملکیتیں تو اُس تک پہنچ گئی ہیں اور ان سے بندھے ہوئے احکامات بھی۔ پھر یہ بڑی بی بی جی ہر موقع پر کہاں سے بول پڑتی ہیں۔ شاید خود اُس کے اندر سے کہیں۔ وہ اس کے اندر کہیں دور تک گھس کے بیٹھی ہیں۔ مر کر بھی کہیں نہیں گئیں۔ تو یہ وہ شخص تھا جس نے کبھی اُس کی طلب کی تھی۔ بیوی بنانے کے قابل سمجھا تھا۔ عزت دینے کے قابل سمجھا تھا۔ تو کیا ابھی بھی۔ اُس نے گھبرا کر

اِدھر اُدھر دیکھا کہیں اس کی سوچ چہرے پر لکھی تحریر قابلِ خواندگی تو نہیں۔ وہی صنوبر کہ خوراکوں کے انبار ہونے کے باوجود جس نے عمر بھر پیٹ بھر کر کھایا نہ تھا کہ ابھی ھانک آئے گی۔

''ہائے سؤ رنی کی طرح ٹُھن رہی ہے۔ بے حیا ھابڑے کی ماری ہوئی۔ رجتی ہی نہیں دھتکاری ہوئی۔''

وہ جس نے تن پر کبھی نیا کپڑا لگا کر نہ دیکھا تھا کہ ابھی دھاڑ آ گئے گی۔

''نہ کس خصم کو دکھانے کے لیے بن تن رہی ہے۔ تجھ چوہری کو تو کسی چوہڑے مسلی نے بھی نہیں پوچھا۔ کوئی حیا والی ہوتی تو شرم کی گاب میں منہ چھپا کب کی ڈوب مری ہوتی۔''

جو کتابوں کے تابوتوں میں عمر بھر اپنی زندہ لاش دفناتی رہی تھی۔ کیا آج وہ کسی خواہش والے منصب پر فائز ہو گئی۔ زمینوں کی ملکیت نے خواہش والی بند پٹاری کا ربن کھول دیا! چاہے وہ خواہش کبھی بر نہ آئے لیکن اکھوا تو پھوٹا۔ بھلے کرنڈ ہو جانے کے لیے.... روئیدگی کے احساس کا حصول ہی کتنا امیرانہ....

زبان عمر میں پہلی بار لفظوں کے توپے توڑ گئی تھی۔ وجود میں پہلے پہلے اعتبار نے انگڑائی بھری تھی۔ زندگی کا اعتبار، جوانی کا اعتبار، حسن کا اعتبار۔

لیکن پھر ایک ٹھٹھہ، فطرت کا ٹھٹھہ۔

کتابوں کے ڈھنڈاروں میں لپٹا سب مردہ روپا مچھلی، خشک ڈھینگر پر روشن آنکھ سی وہ اکھوا جو پھوٹا تو اس کی روئیدگی کا موسم لد چکا تھا۔

کرنڈ بیج جس کے حصے کی سیرابی سوکھ گئی تھی۔ پرانا دبا ہوا تخم جو سرزمین نکلا بھی لیکن موسم سازگار نہ تھا۔

گئے موسموں کی نوید لے کر آنے والے کو خالی ہاتھ ہی لوٹنا ہوگا کہ موسم پت جھڑ کا

ہے۔ شاخیں ہریالی سے خالی ہیں۔ پھولوں کی کٹوریاں زردانوں سے تہی ہیں۔ لیکن یہ کیسا درد تھا سینے میں جو ساری پسلیوں کو توڑتا تھا شاید حرکت قلب بند ہو جائے۔

چنی کہیں سے بولتی تھی۔

بی بی تو نے ڈھنڈاروں کی زندگی پر کبھی غور کیا۔ کتنی زندگی، کتنا فن، کتنا ہنر، کتنی ترقی۔ سب فنا، دفن، سب کو لپیٹتا ہوا فطرت کا ایک ٹھٹھہ۔

▪▪▪▪

چاند بی بی

چنی جب ڈھنڈاروں کی حفاظت پر مامور چھڑی پکڑے اکڑ کر کھڑی ہوتی تو مرد پہرے دار ٹھگنے لگنے لگتے۔ وہ چنی کے مقابل اپنی دھنسی ہوئی قامتوں سے خوف زدہ ہوجاتے۔ آخر یہ چھے چھے فٹے اس ساڑھے چار فٹ کی دنیا بھر کی دھتکاری ہوئی عورت سے کوتاہ قامت کیسے ہو گئے۔ یہ چنی ڈھنڈاروں کی غلاظت عصمت دری کی مثال۔ جس کے چرچے پوری دنیا میں لگے۔ وہ کس بلند قامت مضبوطی سے کھڑی ہوتی ہے جیسے زمین کے اندر سے کوئی درخت سی پھوٹ نکلی ہو۔

عجب سانحہ ہوا تھا کہ بدنامی نیک نامی بن گئی۔ بے عزتی عزت ہوگئی۔ بے حرمتی حرمت بن گئی۔

وہ فعل جس سے کوئی بھی عورت کنویں میں ڈوب مرتی ہے۔ وہی فعل چنی کا افتخار بن گیا۔ وہ چنی سے چاند بی بی ہوگئی۔

کس شان سے آثاروں کے تماشائیوں کو خود پر گزرے واقعات مرچ مسالے لگا کر

سناتی۔ جیسے یہ بھی کوئی آثارِ قدیمہ کی نایاب تاریخ ہو۔

لگتا لوگ کھنڈرات دیکھنے کم آتے ہیں۔ چنی کا دیدار کرنے زیادہ..... ہر سیاح آثاروں کی تاریخ چاند بی بی کی زبانی سننا چاہتا۔ جو کھنڈرات کی لاکھوں بار دہرائی ہوئی کہانی یوں چھیڑتی جیسے خود اپنی بپتا سنا رہی ہو۔

''ہڑپہ یہاں ایک ترقی یافتہ تہذیب دفن ہے۔ دنیا کے پہلے پہلے تہذیب یافتہ باشندے، جن کی شاندار رہتل اُن کے مکانوں اُن کے ہنر اور فن سے عیاں ہے۔ یہ امن پسند اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ لوگ یہ مجسمہ سازی اور ظروف سازی میں کمال رکھنے والے فنکار، ہنر مند، امن پسند لوگ عورت کو بہت عزت دیتے تھے۔

ہڑپہ یہاں موجود مورتیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ عورت دیوی سمان تھی۔

عورت مرد نسل کو بڑھاتے ضرور تھے لیکن کسی کی بے عزتی کا تصور نہ تھا۔

وہ بات کو اُس مقام پر لے آتی جہاں سیاح کھنڈروں کی تفصیل بھول کر چنی کی بپتا سننا چاہتے۔

وہ تفصیلات سناتی اور قابلِ ہمدردی ہوتی چلی جاتی کیونکہ یہ سب بڑی محنت سے ماہر وکیلوں نے اُسے ازبر کروایا تھا۔ اور ہمدردیاں بٹورنے کا تو باقاعدہ پیشہ وارانہ ہنر سکھایا گیا تھا جس کے بدلے سکھانے والوں نے ڈالروں کے انبار بٹورے تھے۔ وہاں مرد گائیڈ اور پہرے داروں کی تو کوئی اہمیت ہی نہ رہی تھی۔ یہ چنی گھٹے مٹھ اپنی کوتاہ قامتی سے نکل کر کہیں فضاؤں میں سرو قامت ہوتی چلی گئی تھی۔ اُس کی انگریزی فرفر ہو گئی تھی وہ تو فلسفے اور نظریے بیان کرنے لگی تھی۔ چرواہے، بھک منگے، گارڈ، گائیڈ اور ڈھنڈاروں کے نلکوں سے پانی بھرتی بستی کی عورتیں گھٹے گھٹے قہقہے لگاتیں۔

''پڑھی نہ پاتے بن بیٹھی علما۔''

''کبھی ایسا بھی جگ میں ہوا کہ بے عزت ہو کر کوئی زیادہ باعزت ہو جائے۔ بے

بے عزتی چھپانے کی بجائے اشتہار لگا پھرے۔''
رمت ہو کر باحرمت ہو جائے۔
حد یہ کہ اُس کے ملزم عدم شہادت کی بنا پر باعزت بری ہونے کے باوجود رہا نہ ہو سکے تھے کیونکہ تمام انسانی حقوق کی تنظیمیں اور خواتین کی عالمی این جی اوز کے لیے چنی زندگی موت کا مسئلہ تھی یہ ہڑپا کے ڈھنڈاروں کی چرواہی چنی جو چاند بی بی ہو گئی تھی جسے بے عزتی راس آ گئی تھی۔ پکا مکان پکی نوکری اُس کے اندر پورے وجود سے در آئی چاند بی بی، حاسدین اور مخالفین میں گھرتی چلی گئی۔ آخر کوئی ایک ضرب ہو تو ارد گرد والے سہ بھی جائیں۔ یہاں تو پورا وجود ایک کاری ضرب تھا۔ جو افسروں پہرے داروں سے لے کر چرواہوں بھک منگوں تک پر سارسار برستا تھا۔ مزید کئی ضربیں اُس کے الفاظ اور مزاج کی تاڑ تاڑ پڑتیں۔ چھینی ناک پر رکھا ہوا تیکھا نخرہ، چندھی آنکھوں میں کٹورہ کٹورہ بھری تحقیر، موٹے بھدے ہونٹوں سے چھلکتے تمسخر کے جام۔ اگر چنی کے وجود میں یہ سب ٹھونسا ہی تھا تو پھر اُسے یہاں سرعام سب، کی نمائش لگانے کو کیوں کھلا چھوڑ دیا گیا۔ کم از کم ان سب کو دیکھنے اور سہنے کی اذیت سے بچایا جا سکتا تھا۔ وہ سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے کہ نہ کرتے وہ تو بالمقابل آ کر اُن کے اعتماد کو اُن کی خصلتوں کو چنوتی دینے لگی۔ آخر مرد ذات۔ اُسے اُن کے سینوں پر مونگ چھوڑ چنے دلنے کو چھوڑ دیا گیا۔ یہ سب کب تک سہا جاتا۔ مرد کی برداشت عورت جیسی نہیں ہوتی۔ جو رو رو کر بین ڈال ڈال کر کوسنے بددعائیں دے دے کر ہواؤں فضاؤں میں اندر کا غبار نکال پھینکے۔ وہ تو مرد ہیں جو نہ روتے ہیں نہ بین ڈالتے ہیں نہ کوسنے دیتے ہیں۔ اُن کے اندر یہ سب کچھ بھاری سِل کی طرح جم جاتا ہے جو یکبارگی تڑخ کر باہر نکلتا ہے اور مدمقابل کو مضروب کر جاتا ہے۔

آخر ایک صبح چنی اپنی ڈیوٹی پر حاضر نہ ہو سکی اور دوپہر چڑھے متاج بھاگاں کی چیخ و پکار نے ڈھنڈاروں کو دہلا دیا۔

سارے پہرے دار، سارے گائیڈ چرواہے سارے ملازم تیورا کر پلٹے۔ دم گھٹے

تین پہر گزر چکے تھے، شک کا دائرہ وسیع تھا۔ ہر ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ہی چنی کا پھڈا رہا ضرور تھا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے اُس نے گارڈ اکبر کی بے عزتی کی تھی۔ اُس سے پہلے ٹکٹ چیکر مجید کی تذلیل۔ اُس سے پہلے گائیڈ نذیر اور یہ سلسلہ تو بڑا طویل تھا۔ اور یہ سلسلہ اُس وقت سے چل رہا تھا جب سے ذرا سی چنی کے اندر بڑی سی چاند بی بی گھس آئی تھی۔ اُسے چاند بی بی بنانے والے ملنگ بھی برسوں بعد چند روز پہلے ہی رہا ہوئے تھے۔ یعنی شکوک وشبہات کے سائے بہت دراز تھے۔ کون کب کیسے آیا اور گلے میں پھندہ لگا کر چلا گیا۔ محتاج بھاگاں کو تو خبر ہی نہ ہوئی حالانکہ وہ اب محتاج نہ تھی آنکھوں میں اُترے سفید جالے میں کسی بڑے ڈاکٹر نے نور کی پھریری بھر دی تھی لیکن ''محتاج'' نام کا ایسا حصہ بن چکا تھا کہ کبھی جدا نہ ہوا۔ وہ محتاج نہ ہوتے ہوئے بھی محتاج ہی رہی کہ اُس کی موجودگی میں ہی کوئی چنی کو گھونٹ گیا۔ جیسے کبھی اُس کی موجودگی میں بھیڑ بکری اُٹھالی جاتی تھی۔ اور اُسے کوئی شناخت نہ ہو پاتی تھی۔ عورتیں محتاج کے گلے لگ لگ الگ ہوتیں تو ایک دوسری کے ٹہوکے دیتیں۔

''عورت ذات ہو کر مردوں کو ذلیل کرتی تھی۔ آخر کسی کی غیرت طیش کھا گئی۔'' عورت کی عورت کے ساتھ جو ایک پُراسرار سوتیا ڈھاہے وہ رخ بدل بدل کر نہال ہوتی کہ وہ مرد کی تو ہر طرح کی حصول یابی اور تصرف برداشت کر جاتی ہے لیکن اپنے جیسی کمزور محکوم عورت کو طاقت ور یا حاکم ہوتے برداشت نہیں کر پاتی۔ عورتوں نے ایک دوسری کے چپے دیے۔

''کب تک آخر کب تک۔ آپ سیانی ہو آخر مرد مرد ہوتا ہے۔ اُس روز میں نے خود دیکھا انو چوکیدار کے بکھی پڑتے ہوئے۔ چیر ڈالا اُس کا گریبان سینے تک، کسی میں منہ توڑنے کی جرأت نہ تھی کہ گھنٹیاں بج جاتی تھیں اوپر تک۔ بے عزت ہو کر کعبے کا کنگرا بن گئی تھی۔''

بھکوں میں مقال پڑی۔

''ڈھنڈاروں میں یوں رعب جماتی تھی جیسے یہی سب کی ماسٹرنی ہو۔ بھئی عورت ذات ہو عورت بن کر رہو۔ ریوڑ میں بھی رہنا اور بکروں سے سینگ بھی لڑانے آ گئی کسی کو غیرت ۔''

رمو قصائی، مہرو دھوبا، نیاز وتر کھان، صفدر جٹ، ریاض گجر، کتنے گواہ جنھوں نے چنی کی تجاوزات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور محسوس کیا تھا کہ چنی زیادہ جینے والی نہیں۔ بچپن سے ہی مردوں کے بکھی پڑنے والی چنی سپاہین ہو کر تو اپنی اوقات ہی بھول گئی۔ بھلا مرد ہو کر عورت ذات سے کون بے عزت ہوتا ہے۔ مرد کی اونچی شان اپنے کرتوں کی آپ بھگت گئی، ایسی نافرمان عورت کا تو خود اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خون معاف کیا ہے۔ ریاض گجر نے اپنے اعتبار کی گرہ لگائی۔

''ابھی کل پرسوں کی بات ہے کہ انو ڈھابے والے کے میز پر سپاہی والا بوٹ رکھ جھگڑ رہی تھی کہ دودھ میں پانی ملاتا ہے آئی وڈی انسپکٹر۔ ایک روز تو خود آپ میرے گلے پڑ گئی کہ تو مجھے بری نظر سے دیکھتا ہے۔ اندر سے تو بات یہی کہ مجھے دیکھتے کیوں نہیں ہو۔ گھاس کیوں نہیں ڈالتے ہو۔ نہ تو کوئی بالی ہے جو تجھے کوئی دیکھے۔''

''اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نام لینے والے بابرکت لوگ اللہ لوگ ساری دنیا میں بھنڈی لگائی۔ دس سال کی ناجائز قید کاٹ کر چھٹے ہیں۔ ابھی پچھلے مہینے کیا پتا بدلہ لے لیا ہو۔''

''آئی بڑی عصمت دار، جنمی تو ہر ایک سے ہاتھ پھروانے لگی ایسی بدذاتوں کے ساتھ ایسے ہی ہونا چاہیے، ہر ایک سے پنگا، ہر ایک کے بکھی، ہر ایک کی بے عزتی، ایسیوں کے تو ٹوٹے ٹوٹے کر نہر میں بہا دینا چاہیے۔''

بھکوں میں پنچائتوں میں ہٹیوں ڈھابے پر مقال دور تک گئی۔

''جو اپنی اوقات سے تجاوز کرتا ہے وہ ہلدی کی گانٹھ میں وجود بند ہو جاتا ہے۔ ایسی کو تو مارنے میں دیر ہو گئی۔ بہت پہلے دھرتی کو پاک کر دینا چاہیے تھا۔ نافرمان ناپاک وجود سے....''

گزشتہ روز ہی تو وہ صنوبر کو یہ بتانے آئی تھی کہ

''وہ جو آریا ہے نا آریا۔ وہ منتیں ترلے ڈال رہا ہے کہ میں اُس کی دوسری بیوی بن جاؤں۔ بنوں گی بنوں گی بر ضرور پر سارے بدلے پورے کر کے، تڑپا تڑپا کر، قدموں میں لا کر کیا سمجھتا تھا خود کو کیسے کیسے رُلایا مجھے۔ ایسے ہی رُلا کر.....

ارے بی بی! میں چاند بی بی ہوں چھینک ماروں تو مردوں کی قطاریں لگ جائیں۔ ہاتھ باندھے درباریوں کی قطاریں۔ اتنے تو بالی کے گرد بھی کیا ہوں گے۔ بڑا سکھ ملتا ہے۔ بی بی بدلے لے کر، ستا کر تڑپا کر، افسروں سے بھی بھڑ جاتی ہوں۔ نہیں جرأت کسی کی میری شان میں گستاخی کی جیسے تُو یہاں ملکانی صاحب جی ہے۔ زمینوں کی حاکم۔ اسی طرح ڈھنڈاروں کی حاکم ہوں میں۔ مورتیوں جیسی دیوی، جوتے کی نوک پر ہیں سارے۔''

بالی بھی کبھی یہاں تلے دار کھسے کے نشانے لیتی اور قہقہے تضحیک اُڑاتی تھی۔ لیکن ایک تھپکی پر سدھائی ہوئی بلی کی مانند آغوش بھی تو بھر دیتی تھی۔ جملے بازی میں بھی اک لگاوٹ اور خود سپردگی ہوتی۔ لگتا جوتے کے اندر بھی بالی بھر کر کسی کی کمر سے آن ٹھکی ہے۔ مرد بے عزت ہو کر بھی لطف اندوز ہوتے تھے۔ دھول دھپا کھا کر بھی بدمزا نہ ہوتے۔

یہ چناں تو چلتا پھرتا، انتباہ کا اشتہار، پرے پرے جو قریب لگا جل جائے گا۔ میں چاند بی بی ہوں جس کے پیچھے اک دنیا دیوار بنائے کھڑی ہے۔ ہے کسی میں جرأت اس فصیل کو پھاندنے کی۔

صنوبر کو لگا تو تھا کہ اس فصیل میں کہیں سیندھ لگی ہے۔ چنی زعفران سی کھل رہی ہے۔ پوری توانا زندگی ساری طاقت، سارا زعم، ہلدی کی گانٹھ ہو رہا ہے۔ چنی کی پھسی پھسی سی ناک پر سرسوں پھوٹ رہی ہے۔ لیکن صنوبر نے سوچا تھا۔ یہ بھلیکھا ہے۔ سراسر واہمہ، چنی اتنی مضبوط، اتنی جوان، اتنی پُر اعتماد ہڑپا کی سوختہ مٹی کی تاج دار دیویوں جیسی چنی جو موت

کے وحشی گھوڑے کو بھی پچھاڑ سکتی ہے۔

پر کوئی تو تھا۔فطرت جیسا حوصلے والا جس کے راز دار سبھی تھے۔شاید وہی زرد حنوطی ہاتھ جو اپنے جواز اور محرک خود بنا تا ہے۔ساری دلیلوں اور منطقوں سے ماورا۔

انسانی حقوق کی ساری تنظیمیں،عورتوں کی سبھی این جی اوز شور مچاتی رہ گئیں۔کوئی پکڑ میں ہی نہ آیا۔

اور یہ دیوی سمان سوختہ مٹی سے گھڑی چنی،اچانک حادثاتی جس کے سر کے پیچھے تاج لگ گیا تھا۔جس کے چیونٹی والے پر نکل آئے تھے۔اپنی شبیہ ڈھنڈاروں میں چھوڑ کر ڈھنڈاروں کے قبرستان میں دفن ہوگئی پھل جھڑی سی بھڑک کے۔کیا کچھ سمیٹ کر بجھ گئی۔ ڈھنڈاروں کی جھوٹی سچی تاریخ،انگریزی کے رٹے رٹائے جملے،بھڑ جانے کا عجب حوصلہ، اپنی بے توقیری بے عزتی کا طنطنہ،ستا کر،رُلا کر،ہر حد توڑ کر مسرور ہونے والی چنی۔ہر ایک کو للکارنے والی چنی،مردوں کی برداشت کا امتحان لینے والی چنی،چناں،چاند بی بی۔

■■■■

ماروی

عورتوں کے متعلق مردوں کی نفسیاتی توجیہات ناقابلِ فہم ہیں۔ صنوبر کو ماروی یاد آئی۔ جسے ملک صابو کہیں سے پکڑ لایا تھا۔ جس نے بتایا تھا کہ وہ سندھ کے کسی نواب کی بیٹی ہے۔ اپنے ہی کام دار کے بیٹے سے عشق ہو گیا۔ وہ بھگا کر پنجاب لے آیا۔ لیکن پھر حوصلہ اور جیب جواب دے گئے تو ایک بس اڈے پر لاوارث چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ اُسی اڈے پر جہاں کبھی ملک صابو ہا کر ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں اب وہ اپنی قلب ماہیئت کی نمائش لگانے آتا جاتا رہتا تھا۔ جہاں بہت سوں نے مل کر ملک ٹرانسپورٹ کمپنی کا خواب بنا تھا۔ جس خواب کی نذر نیاز میں سب لٹ گیا تھا۔ وہیں وہ دو روز کی بھوکی پیاسی ملی تھی۔ ملک صابو اُسے اپنی پجارو جیپ میں بٹھا لایا تھا کہ جہاں اُس کے ٹکڑوں پر اک دنیا پل رہی ہے۔ وہیں یہ غریب مسکین بھی سہی۔

لیکن اس جذبہ ترحم پر پورا گاؤں بھڑک اُٹھا جو دونوں بھائیوں سے ناانصافی والی نفرت رکھتے تھے۔ جنھیں کسی نئے مالک کی برداشت نہیں تھی۔ جیسے وہ قانوناً وارث نہ بنے ہوں ناجائز قابض ہوں۔ جیسے ملکوں کی ملکیتوں کے ناجائز حصے دار ہی نہ بنے ہوں بلکہ ہر

ایک کا اپنا بھی کچھ نہ کچھ ہتھیا لیا ہو۔ اُن کے جذبات کے پٹرول میں تیلی چھوڑ دی گئی تھی۔ شور مچ گیا۔

بے نکاحی عورت، ادھالا، زنا، گناہ، امام مسجد نے جمعہ کے خطبے میں باقاعدہ فتویٰ جاری کر دیا۔

گاؤں کی آبادی جن میں سے بیشتر کلمہ پڑھنا بھی نہ جانتی تھی۔ جو فتویٰ کا مطلب بھی نہ سمجھتی تھی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ بعد از نمازِ عصر دونوں کو گڑھا کھود کر آدھا آدھا گاڑ دیا جائے گا اور پھر پتھروں روڑوں کی بارش میں دفن کر دیا جائے گا۔

اک نئے ذائقے کی سرگرمی سے عوام الناس کے مشترکہ ذہن سے رالیں ٹپکنے لگیں۔ قریب تھا کہ صابو اور ماروی دونوں کو نگل کر فرحت بخش ڈکار لیتے کہ ملک صابو نے اس سندھی لاوارث لڑکی سے نکاح کرنے کا اعلان کر کے سبھوں کی تشدد پسند رال حلق میں ہی کرنڈ کر دی۔ یہ لڑکی جو ہڑپا کی مورتیوں کی ہم شکل تھی۔ ہو بہو چنی۔ مہنجو داڑو کی نواب زادیاں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اسی دھرتی کی جلتی بلتی کھڑانڈ اینٹ سی کوکھ سے جنمی۔ جو ہزاروں برس سے اپنے ناک نقشے اپنی ساختیں اور منہ مہاندرے کبھی بدلتی ہی نہیں۔ بدلے ہوئے منہ مہاندرے تو اس دھرتی کے ناجائز قابضین کے ہیں جن کی شباہتیں اس سوختہ مٹی نے نہیں گھڑیں۔ جیسے خود صنوبر۔ جو کبھی سنگِ مرمر کی وادیوں سے اُترے اور سوختہ مٹی کے قابض ہو گئے۔

یہ مہنجو داڑو کی نواب زادی ملک صابو کے دھپے ٹُھڈے کھاتے رن پکا کر مانجھ دھو کر سامنے رکھنے لگی۔ پیر ٹانگیں دباتے اور یہی ٹانگیں کھاتے کھاتے دو بچوں کی ماں بھی بن گئی پھر ایک روز کہیں غائب ہو گئی۔ ملک صابو نے شور مچا دیا۔

جس طرح پہلے کسی کے ساتھ نکل کر آئی تھی اُسی طرح پھر کسی کے ساتھ نکل گئی کہ اگلے روز وہ پلٹ بھی آئی اور عجب کہانی سنائی۔

ملک صابو نے کرایے کے قاتل کو اُسے قتل کرنے کو پیسے دیے لیکن قاتل کو اس ننھی سی لڑکی پر ترس آ گیا اور کہا۔

"بتا تجھے کہاں چھوڑ کر آؤں۔ تجھے مارنے کو جی نہیں چاہتا" اُس نے جواب دیا۔

ماں باپ کے ہاں جگہ نہیں کہ وہ بھی مجھے ماردیں گے کوئی دوسرا ٹھکانہ ہے نہیں۔ مجھے واپس ملک صابو کے پاس چھوڑ آؤ۔

کرایے کے قاتل نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ پھر تجھے مرواوے گا پھر بھی....."

"مرواوے۔ شوہر مروائے گا نا باہر کہیں بھی نکلی تو کوئی دوسرا مرواوے گا۔"

وہ اپنے دونوں بچوں سے لپٹتی روتی کرلاتی، ملک صابو سے معافیاں مانگتی کہ اپنے مجازی خدا کی حکم عدولی کی مرتکب ٹھہری کہ اُسے قتل کا حکم تھا اور وہ زندہ لوٹ آئی اور مزید ہاتھ جوڑتے پیر پکڑتے منہ ماری بھی کرتی تھی۔

"سائیں مجھ بے کس کو مارنے کے لیے پیسے کیوں ضائع کیے آپ اپنے ہاتھوں سے مارنا میں نے اپنا خون تجھے بخشا۔"

اب کی بار نہ ہجوم مشتعل ہوا نہ امام مسجد نے کوئی فتویٰ جاری کیا۔ میاں بیوی کا آپسی معاملہ تھا آپس میں حل ہو گیا۔ وہ پھر رنّے پکانے دھونے مانجھنے لگی۔ پیر ٹانگیں دبانے لگی اور تیسرے بچے کی ماں بن گئی کہ ایک روز پھر غائب ہو گئی۔ ملک صابو سے لوگ پوچھتے رہے "کیا مروادی کہ بیچ دی۔"

لیکن اُس نے لب سی لیے۔ جیسے ماروی کی لاش دانتوں تلے دبا رکھی ہو منہ کھولا تو گر جائے گی۔

پتا نہیں ملک صابو کو فائدہ کیا ہوا۔ مفت کی نوکرانی بے زبان، تین بچوں کی ماں، کہے بھوکی بیٹھی رہ تو بھوکی بیٹھی رہے۔ کہے مر جا تو وہ مر جائے۔

عورتوں نے دوہتڑ پیٹے۔

"ہائے ظلمی! تیرا لے کیا رہی تھی ماریں کٹریں کملی تھی ہم سو ستاروں پکا سامنے رکھتی۔ دھو پیستی۔ مانجھو کملی۔ ہائے چھوٹے چھوٹے بال رل گئے طلاق دے دیتے محنت کرتی مزدوری کرتی تو پال لیتی۔ پر ماروی۔"

عورت سے روا رکھے سلوک کی کوئی وجہ یا منطق تھوڑی ہوتی ہے۔ خوبصورت خاندانی بیوی کی موجودگی میں نوکرانی اچھی لگتی ہے۔ کبھی رنڈی کبھی پڑوسن کبھی راہ چلتی۔ یہ دریا تبھی اترتا ہے۔ جب پانی سوکھ جاتے ہیں تو پھر کھوئے سے رنڈی تر جائی گئے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو اس منہ ماری میں جیتی کڑھتی ہنستی چلاتی خاموش ہو چکی ہوتی ہے۔

لیکن اس چپ کے الاؤ میں بدلے کا جہنم دہکتا ہے اور یہ اللہ میاں کی گائے ایک ہی کھونٹے سے بندھے بندھے شیرنی بن چکی ہوتی ہے جس کے چیرنے والے دانت گوشت خور ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کے طعنے تشنے دھاڑ بن چکے ہوتے ہیں۔ آغوش کے پالے بھی چھوٹے چھوٹے شیر، جب وہ دھاڑتی ہے تو وہ بھی اپنی آواز ساتھ ملاتے ہیں۔

ماروی کے تینوں بچے تو اُس کے انجام سے بھی آگاہ نہ تھے۔ لڑکے لونڈے ہو گئے لڑکی شاید بالی ہو جائے۔

جس در پر ان پانی کے لیے جا بیٹھتے وہی پوچھتا۔

"ہیں وے۔ ماں مار سٹی کہ وتج سٹی ہیں۔"

ملک صابو محض صابو ہو کر مر گیا۔ لیکن ماروی کے ذکر پر بھی منہ نہ کھولا۔

جیسے ماروی کا تعفن پوچھنے والوں کو تیورا دے گا۔

* * * *

ڈی سی صاحب
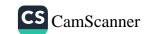
منشی ریحان اپنے وجود سے بھاری بوجھ اٹھائے منہ کھولے ہونکتے ہوئے برآمدے کی پہلی سیڑھی پر ہاتھ باندھے اکڑوں کھڑا تھا۔ جیسے یہاں تک پہنچتے پہنچتے سانس کا پیالہ اوندھا گیا ہو۔ گھٹنے دوہرے ہو گئے ہوں اور لفظ ایک دوسرے سے جڑ نہ پا رہے ہوں۔ جملے کی مالا نہ پرو پا رہے ہوں۔ دھاگہ جا جا سے ٹوٹ جاتا ہو۔ موتی بکھر جاتے ہوں۔ جیسے بوجھ کی یہ پنڈ سر اور کندھوں پر نہ ہو۔ بلکہ کہیں دل پھیپھڑوں نے اٹھا رکھی ہو۔ جو ناگہانی بار سے پھولے جا رہے ہوں۔

''چھوٹی بی بی صاحب جی! ڈی سی صاحب تشریف لائے ہیں۔ محمد اسلم صاحب''

صنوبر کے اندر سر ابھارتے ہوئے اعتماد کا جیسے دل بیٹھ گیا۔ صنوبر کو لگا کہ اس روز اس کی آواز میں ایسا کچھ ضرور پوشیدہ تھا جو ''اچھو'' ماسٹر اللہ دتے کے چھوکرے کو یہاں دوبارہ آنے کی ہمت دے گیا۔

بڑی بی بی جی کی چنگھاڑ اس کے اندر سیندھ لگا گئی۔

''یہ کلموہی کیا کالک ملنے چلی ہے عزت دار خاندان کے منہ پہ۔ اس ماسٹر کے چھوکرے کو اتنا حوصلہ دلا دیا کہ وہ خاندانی پردہ دار حویلی کے یوں چکر لگانے لگا جیسے لونڈے لپاڑے بازاروں کے لگاتے ہیں۔''

''کھیچل تو ہوگی چھوٹی بی بی صاحب جی! پر ذرا دروازے تک بات ضروری ہے۔ تشریف لے چلیں بڑی ضروری۔''

صنوبر کو لگا اس کی ڈور ریحان کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسے کسی سدھائی ہوئی گائے کی طرح کھینچے چلا جا رہا ہے۔ کسی باڑے کی اور جہاں اس کا گاہک کھڑا ہے۔۔۔ وہ ڈھیلی ڈھالی باگ کے سہارے بڑھتی چلی آئی۔

''بی بی صاحب! اگر میں کسی کام آسکوں تو۔'' عجب حکمیا التجا جیسے کہتا ہو۔ کسی بھی کام کے لیے میرے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ جی تو چاہا تھا ذرا چھاتی مار لے۔ صوت کے ساتھ صورت بھی جیسے سینگل گائے بے مقصد ہی سینگ مار دیتی ہے۔

''چھوٹی بی بی صاحب! اگر کوئی ضرورت ہو۔ اگر کوئی کام ہو تو۔ حاضر۔''

صنوبر کو لگا گھنے بادل سے گھمبیر لہجے نے بہت سا پانی برسا دیا ہے۔ ٹھنڈا اور میٹھا پانی۔ جو اس نے سارا پی لیا ہے۔ جو ایک ایک خلیے ہر ہر نس رگ کو سیراب کر گیا ہے۔ یہ لفظ نہیں مصری گھلا چشمۂ شفا ہے۔ جس نے رگِ جاں تک کو فیض یاب کر دیا ہے۔ جو پہاڑی بلندیوں پر سے اس کے وجود کے بھیتر چھٹا ہے۔ محمد اسلم کی آواز میں یہ کیا تھا۔ کچھ بہت گہرا اور راز جیسا۔ جو اس کے اندر اتر کر ٹھہر گیا ہے۔ کبھی نہ جانے کے لیے۔ ان دو جملوں میں سے کچھ چھن چھن کر سیدھا اس کے دل جگر کو مار کر گیا ہے۔ کچھ انوکھا، نادر، بھرپور زندگی جیسا، امید جیسا، موت کی بے اعتباری کو، خزاں کو مات کرتا ہوا۔ یہ جو لہجہ ہے کیا یہ صرف اس کے لیے ہے کہ اس کا طرزِ بیاں ہی یہی ہے۔ یہ اس کا واہمہ ہی سی لیکن لگا ٹھنٹھ وجود ہرا ہو گیا ہے۔ کوئی کونپل پھوٹنے کو ہمک رہی ہے۔ برسوں کا کرنڈ بیج خشک زمین سے جیسے انگور نکال

لانے کو تیار ہے۔ زمین وتر پر ہے۔ تبھی کڑکتی ہوئی آسمانی بجلی برسی اور ہمکتی ہوئی کونپل بھسم ہو گئی۔

''اے بدذات! تو مر کیوں نہ گئی؟ کیا اسی بے شرمی کے دیہاڑے کے لیے سبھی مرتے چلے گئے اور تو جیتی رہی؟ اس بڑے خاندان کی عزت کا کوئی پاس لحاظ۔ بے شرم، بے حیا.....''

قدم پسپا ہو گئے۔ اکھوے پھوٹا خشک ڈھینگر تندور برد ہوا۔

ملاقات ختم۔

منشی ریحان اس کی طرف سے اختتامی کلمات ادا کرتا رہ گیا۔

''بی بی صاحب کہہ رہی ہیں کہ آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔ آپ کی آمد ہمارے لیے.....''

■■■■

وہ ٹیوب ویل کے کھاڑے میں پیر بھگوئے جیسے جلے ہوئے پر ٹھنڈے ترونکے مارتی ہو۔ صریح کے پیلے پشم پھول خوشبوئیں لنڈھانے لگے اور پرندے بلاوجہ گانے لگے ہوں۔ یہاں فطرت اپنے سارے رنگ اور وجود کے ساتھ یکسر آزاد تھی۔ طوطے چونچیں لڑاتے ہوئے، کبوتریاں پنکھ بٹھاتی ہوئیں۔ پہلے تو اسے یہ سب اتنی شدت سے اتنا کھلا کھلا اتنا آزاد آزاد کبھی محسوس نہ ہوا۔ آج سارا منظر جیسے اس کے وجود میں چھکتا مہکتا ہو۔ جیسے سارا دھو مانجھ کر اجال دیا ہو کسی نے۔ تراشا اور سنوارا ہوا معطر اور تر و تازہ۔ پیڑوں میں اتنی ہریاول پہلے تو کبھی نہ ہوئی۔ پرندوں کی چہکار میں اتنی نغمگی بھی کبھی نہ ہوئی پھولوں کی مہکار میں اتنی خوشبو کبھی نہ ہوئی۔ بلکہ یہ تو وہ علاقہ تھا جہاں اس کا داخلہ ممنوع تھا۔ لیکن اب یہ سب اس کی ملکیت میں ہے۔ جس کے سارے مناظر اس کے ہیں۔ وہ جب چاہے

جہاں چاہے جا سکتی ہے۔صدیوں کے مروج اصول وقواعد بدل سکتی ہے اور جو چاہے اصول بنا سکتی ہے کوئی روک نہیں، یہ جو ہر حد پر ایک وعید ایک دھاڑ آتی ہے تو یہ اس کا واہمہ ہے اب دنیا میں اسے ڈانٹنے والا کوئی نہیں رہا۔روکنے والا بھی کوئی نہیں بچا، اصول اور قاعدے بنانے والا کوئی نہیں بلکہ یہ سب کچھ وہ خود بنا سکتی ہے۔ساری جاگیر وہ خود ہے سارے اصول قاعدے وہ خود ہے، اسے اپنی طاقت کا اندازہ شدت سے ہوا۔جی چاہا وہ چیخ کر کہے:

''آئیں دیکھیں بڑی بی بی جی! آپ کی ملکیتیں آج میرے رحم وکرم پر ہیں مگر آپ کہیں نہیں ہیں۔''

اس کے حلق سے عجیب قہقہہ ابھرا جس سے پرندوں میں کھلبلی مچ گئی جیسے قہقہہ نہ ہو ''ہلا ہلا'' کی جنگلی آوازیں ہوں، ازحد جنونی اور انتقامی اور بہت ساری۔

لالی میرا ستا بھنیا، میں لالی دا گھٹا بھنیا
لالی ہولا، لالی ہولا آ آ۔

طاقت اور اختیار کا نیا نیا تجربہ،ہوا عجب زعم۔

وہ چاہے تو سارے خربوزوں تربوز کے ڈھیر، ساری روٹیوں کے چھکو، ساری چائے کی کیتلیاں، سارے گوشت کے دیگچے سب کھا جائے ان کے مضر نتائج کی نشاندہی کرنے والا کوئی نہیں۔ بڑی بی بی جی کہیں نہیں ہیں جو دیکھیں کہ جسے کوئی مسلی بھی نہ پوچھتا تھا اس کا سوالی چوکھٹ سے لگا ہے، ڈی سی صاحب ضلع کا حاکم.....بدلے والی کیفیت جیسے دیوانگی کی بڑھکیں مارنے لگی۔

منشی ریحان دونوں ہاتھ باندھے مؤدب کھڑا تھا۔اس نے پانی کے کھاڈے سے پیر باہر نکالے۔شلوار کے پائینچے درست کیے۔کہیں سے بے حیا، بدذات کا آوازہ نہ آیا۔

ریحان اکڑوں ڈھ گیا، گردن زمین تک جھکائے ہوئے زمین کا چھوٹا سا دائرہ بھیگتا

ہوا جیسے نسلی وفا شعاریاں آنسوؤں میں نچڑتی ہوں۔

صنوبر دونوں گھٹنوں کو بازوؤں کے کلاوے میں لیے آنسوؤں کی جھڑی کو ایک ٹک دیکھتی تھی۔ جیسے گہرائی کا اندازہ لگاتی ہو، ندی میں ڈوبنے سے پہلے۔

چھوٹی بی بی صاحب جی! مُدِ قدیم سے، نسلوں پیڑھیوں سے آپ کا خادم بردہ۔ مجال گستاخی کی نہیں۔ کسی زبان درازی کسی مشورے کی بھی نہیں....''

آواز میں آنسوؤں کی کھکھیاہٹ رندھ گئی۔ خشک گڑھا پُرآب ہو گیا۔

''پر دکھ ہوتا ہے یہ جاگیریں یہ جائیدادیں، یہ زمینیں، یہ دولتیں لاوارثی!..... درد ہوتا ہے۔''

''بی بی صاحب جی! مجھ خادم پر کرم کریں۔ میں نسلوں کا غلام، پیڑھیوں کی مٹی، مُدِ قدیم کی خاک، مجھ نوکر کی کیا مجال مجھ پر خاص کرم کریں....''

صنوبر کو تو لگا جیسے وہ زمین کے کسی ٹکڑے کا مطالبہ کرنے والا ہے اور اس میں تو شاید اتنی برداشت بھی ہے۔ کہ وہ ملکیت کا بوجھ سہار سکے۔

''کیا کہتے ہو منشی....''

صنوبر کھاڈے کی سیمنٹڈ دیوار سے اٹھی اور رہائشی علاقے کی طرف چلی۔ جیسے کوئی ناجائز فرمائش نہ سننا چاہتی ہو۔ درمیانی چار کنال کے دھوپ صحرا صحن میں آواز اوندھا گئی تھی۔

''میں باندہ بردہ کچھ کہنے کی کیا جرأت بس ایک پیغام ہے جو آپ تک پہنچانا ضروری ہے۔

اگر گستاخی ہو تو جو حد جرم کی وہی سزا مجرم کی۔''

ہچکیاں روکنے کی کوشش میں منشی ریحان کی نسلی کمزور پسلیاں کھڑکھڑاتی تھیں۔ دراوڑی حلق سے لفظوں کے موگھے گھٹ گھٹ بہتے تھے۔

"کیا پیغام۔"

صنوبر کے قدموں کو جیسے پیغام کی شدت نے سبک گام کر دیا۔ پچھا [illegible]
آواز جیسے زنجیر کر گئی تھی...."

"وہی پیغام جو برسوں پہلے ان کے والد صاحب بڑے ملک صاحب [illegible]
لائے تھے۔ پر قبولیت نہ ہوئی تھی۔"

ڈھیرے بگلوں نے یکبارگی ٹیوب ویل کے کھاؤے میں غوطے لگا [illegible]
بھریں، پھواریں صنوبر پر برسیں۔ جیسے پیٹ ابھرے بادل کا کوئی ٹکڑا صرف [illegible]
والے آسمان کے حصے سے اچانک پھٹ پڑا ہو۔ بھیگنے سے بچنے کے لیے قدم تیز تر [illegible]
ٹانگیں باہم ٹکرانے لگیں۔ جیسے بھیگنے سے بچ بھی گئی تو ریحان کے آنسوؤں کے [illegible]
ضرور گر جائے گی۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ اب قبولیت ہو جائے گی منشی...."

ریحان کی ہچکیاں تیز تر ہو گئیں۔ وہ اس کے قدموں کے سامنے پورے قد سے [illegible]
اور اس کے پیچھے ہاتھ جوڑے گھٹنوں پر اندھائی خادماؤں کا خلط ملط ڈھیر۔

وہ عمر بھر دوسروں کے فیصلوں پر جیتی رہی تھی۔ جیسے چاہتی ہو اب بھی اس کے لیے
کوئی فیصلہ کرے وہی فیصلہ جو وہ خود چاہتی ہے۔ لیکن ذمہ داری اس پر نہ آئے۔ فیصلے کی
ذمہ داری کوئی دوسرا لے، جیسے منشی ریحان۔

"تم کیا چاہتے ہو منشی"

"وہی جو ڈی سی صاحب چاہتے ہیں۔"

ترلا ہے! چھوٹی بی بی صاحب جی! ترلا۔ ان زمینوں کا ترلا، جائیدادوں، وراثتوں کا
ترلا۔ ان باندے بردوں کا ترلا۔"

صنوبر کا جی چاہا وہ قہقہہ لگائے، فطرت والا بھرپور ٹھٹھہ۔

''فطرت تو پچھاڑ چکی ان وراثتوں کو، ریحانے!''

اتنا بھرپور قہقہہ کہ وجود کے سارے بند مساموں سے انگور پھوٹنے لگیں۔ جیسے مٹی پتھر اٹا حلق بند چشمہ، کسی اندرونی جوش سے اچانک اپنا رستہ بنا لیتا ہے اور پانی کی پھوٹتی ہوئی باریک باریک دھاریاں اپنا وجود منوانے کو ہمکنے لگتی ہیں۔

''میں آپ کا بردہ منشی ریحانا۔ اٹی اٹی وٹی وٹی کی حفاظت کا ذمہ دار۔ چھوٹی بی بی صاحب جی! زمینوں کی فکر نہ کریں۔ ساری آمدنی سارا پیسہ دولتیں جیسے اب آپ کے اکاؤنٹ میں سمولی جمع ہوتی ہیں۔ ایسے ہی آگے بھی میں حاضر، میں غلام، نوکر....''

ساری خادمائیں آنسوؤں میں گچ ریحانے کی امامت میں جیسے سجدہ ریز تھیں۔ ہاتھ باندھے سر جھکائے جیسے وہ بھی کوئی پیر جنڈی ہو۔

''بی بی صاحب جی! ترلا ہے، واسطہ ہے۔ تیری نسلوں کے خادم، تیرے پرکھوں کے خدمت گار۔''

صنوبر آنسوؤں کے سیلاب میں بہنے لگی۔ فیصلے کی ذمہ داری اٹھانے کو اک جم غفیر موجود تھا۔

''ان زمینوں کا ترلا، ان وراثتوں کا ترلا۔''

اگر یہ زمینیں بانٹ دی جائیں۔ ان دھرتی کے کیڑوں میں دھرتی کے اصل وارثوں میں، ان جانگلیوں مسلیوں میں، باندوں بردوں میں تو زمینوں کی ذمہ داری کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سوچ کی کمزور سی لہر کو ایک پُرشور لہر نے خود میں سمو لیا۔

آخر صنوبر کو کیا حق پہنچتا ہے کہ نسلوں، عمروں، صدیوں کے برابر معمول کو اتھل پتھل کر دے۔ کتنی بڑی دولت قناعت صبر اور برداشت کی دولت جسے وہ آزمائش میں ڈال دے۔ ماورا کی چاہت سے تہی صبر کی آزمائش، صدیوں برابر قناعت کی آزمائش۔

آسمان چاند ستارے جس طرح پہنچ سے باہر ہیں اسی طرح یہ دولت، ملکیت، خواہش

رکھنے اور پانے کی جدوجہد کا تصور بھی ان کے دماغ کی پہنچ سے بعید۔ اس دھرتی کے کیڑے جن کی نسلوں میں باہر کا کوئی کھوٹ نہ تھا جو اسی مٹی سے یوں جنمتے مرتے ہیں۔ جیسے مٹی کے وجود سے گڈووے نکلتے ہیں۔ جو پورا فرش زمین بھر دیتے ہیں اور پھر اسی سرعت سے اسی مٹی کے اندر غائب بھی ہو جاتے ہیں پھر سے نکلنے کے لیے۔

کتنا سکون تھا اس صبر میں، برداشت اور اطمینان کا گہرا سمندر، جس میں کبھی کسی منصوبے یا جدوجہد نے ہلچل نہ مچائی تھی۔ جیسا ملا اسی حالت میں قبولیت۔ دکھوں کے ڈھولے دردوں کے ماہیے.... ان کے سامنے کتنا اچھا کھایا جائے کبھی رال نہ ٹپکتی۔ دولت کے انبار چڑھے رہیں۔ کبھی خواہش نہ ابھری۔ کیسا بڑھیا زیب تن کر لیا جائے کبھی چیتھڑوں کا احساس نہ ہوا۔ کبھی سنبھالنے حاصل کرنے کی پریشانی ہی نہ بتائی۔

ان کے برعکس یہ جٹ، آرائیں، گجر یہ سارے مہاجر کس قدر، ندیدے، رالیں ٹپکاتے ہوئے۔ لالچی چھینا جھپٹی کرتے ہوئے۔ اسی لیے یہ جو کبھی نوکر مزارعے تھے اب خود نوکر مزارعے رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ صبر کی سل سینوں پر رکھ کر کبھی قناعت کی بکل اوڑھ نہ بیٹھے تھے۔ حصول، تگ و دو، محنت، کوشش۔

ایک یہ مسلی، کھوجے، مسلم شیخ، چوہڑے، بھیل، دراوڑ، راضی بر رضائے مالک، آسمانی کہ زمینی دونوں مالک۔ بھوک ننگ مست الست۔

مالکوں کی خدمتوں میں جٹے رہنے والے۔ وفا شعاری میں خود سے بے خبر، مٹی میں مٹی، پاؤں کی ٹھوکر میں رہنے والے۔ روتے دھوتے نصیب اور مقدر پر شاکر رہنے والے۔ زبان پر ایک ہی ورد۔

"تیرا شکر اللہ سائیں! تو جس حال میں رکھے تیرا شکر۔

شکر مالک تیرا لکھ لکھ شکر تو مائی باپ تیرے حکم کے باندے بردے۔"

ہر غلامی، محکومی، غربت، افلاس، بے بسی، کمزوری کے رستے کی بڑی رکاوٹ یہ صبر و

برداشت یہ قناعت اور اطمینان۔ جس روز صبر اور برداشت کی زنجیریں کٹ جائیں گی یہ گورے غلام بھی نہ رہیں گے۔

ان دکھوں، بھوکوں اور غلامیوں نے جو خام دانش کے یہ سرچشمے ان جانگلیوں دڑاوڑیوں میں وافر بھر دیے ہیں جب کبھی وہ انقلاب اور مزاحمت کا روپ دھار لیں گے تو پھر شاید یہ بے پناہ طمانیت بے تحاشا سکون، راتوں کا رومان، رقص وسرود اور شباب کی چند روزہ سرشاری بھی نہ رہے گی۔ یہ مقصد کا لالچ، حصول کا طمع، نسلوں کا سکون نوچ لے گا۔ برباد کر دے گا۔

تدبیر، سنجیدگی، فکر، مستقبل کی فکر، پڑھائی کی فکر، نوکری کی فکر، روزگار کی فکر، روٹی کپڑا مکان کی فکر۔

کتنی فکروں سے نجات تھی اس ایک غلامی میں کتنی لاغرضی معطلی اور کاہلی کا سکون آور سمندر ٹھہرا ہوا جامد۔

جسم و جاں کا رشتہ جوڑے رکھنے جوگا چوگا موجود۔ سر ڈھانپنے کو جھونپڑی کتنی آسانی سے چھتی جا سکتی تھی۔ پورا دن کھیت کھلیان سے مولی گاجر ککڑی تربوز کس مہارت سے چرا کر منہ مارتے رہنا۔

کتنی مطمئن محدود اور سرشار زندگی۔ آخر صنوبر کو اس نسلی اور دائمی طمانیت کو چھیننے کا کیا حق ہے۔ گھر سے کھیت تک پہنچتے پہنچتے راہ میں کتنے کھال۔ کتنی پلیاں، کتنے گنے، کپاس اور شالے چری کے گھنے کھیت پڑتے ہیں۔ ہر جا جوانی کی گواہیاں ثبت۔ اور کپڑے جھاڑ کر یوں اٹھ جانا جیسے باہر جھاڑا پھر آئے ہوں۔ دس سال سے اسی سال تک سارے مرد جوان، ساری عورتیں مجبور۔ مجبوری بھیتر کی بھی اور خارج کی بھی۔

بڑے بڑے قہقہے، کوکاریں، آوازے، جملے بازی، بے ساختہ جنس کی فوری تسکین، کسی قطع و برید کسی کتر و بیونت کسی روک ٹوک سے آزاد، فطرت کی شدت سے جیتے

ہوئے۔ اتنی شدت سے کہ سارا جینا دنوں میں نچڑ جاتا اور جلد مر جاتے۔

صنوبر کو کیا حق حاصل ہے۔ سکول کی چھڑی سے فطرت کی بے ساختگی کو سدھانے لگے۔ ہسپتال کی بندش سے زندگیوں کو پابند کرنے لگے۔ پیسے کے برمے سے صبر کی سِل میں چھید ڈالنے لگے۔ زمین کی تقسیم سے محبت و ایثار کے بیچ طمع و لالچ کا ڈانگ سوٹا کروانے لگے۔

کتنی مطمئن زندگیاں لاعلمی والے سکون سے لبریز۔ کھن کھن بجتی اور بج بج کر تڑختی ہوئیں۔

یہ زمینیں جاگیریں تو اپنی مالک آپ.... خود ہی فیصلہ کریں گی کہ اپنا رخ انھیں کس اور موڑنا ہے۔ مالکان کی تبدیلی کا فیصلہ خود زمینوں کا ہوا کرتا ہے۔ مالکان تو آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ زمینیں ہیں جو پڑی رہتی ہیں ایک تھاں۔ جیسے ہڑپا کے ڈھنڈار پڑے رہ گئے ہیں۔ پتانہیں کس کس کی ملکیتوں کو پچھاڑتے ہوئے پڑے رہ گئے ہیں۔ آج کون جانے کیسے کیسے عظیم اللشان مالکان ہو کر گزر گئے اور کن کن کو ملکیت کا تحفہ ان زمینوں نے بڑھ کر پیش کیا۔ پھر اطمینان دلا کر چھین لیا بھروسہ دلا کر اچک لیا۔ زمینوں کی عینِ فطرت کے مطابق۔

زور لگا کر کھینچ تان کر اب کی بار صنوبر کے تصرف میں یہ ہرجائی زمینیں دے دی گئی تھیں۔ جو زمینوں کے فلسفے کو بخوبی جانتی تھی کہ یہ ملکیت وقتی ہے۔ تصرف لمحاتی ہے۔ ایک عہد سے دوسرے عہد تک ایک ملکیت سے دوسری ملکیت کا درمیانی وقفہ۔ بحرحال وقفہ ختم ہوتا ہے۔ اسے اختتام پذیر ہونا ہوتا ہے۔

لیکن جو وقفہ ملا ہے جو موقع دستیاب ہوا ہے اس کی وہ عظیم الشان مالک ہے۔ اسی ملکیت کے زعم میں وہ ایسے کام کر سکتی ہے جن کی اجازت اس کی اوقات سے کہیں زیادہ ہے۔

وہ اکٹھے چار جوڑے خرید سکتی ہے۔ وہ ساہیوال کے پرانے درزی سے انھیں سلا سکتی ہے۔ صحن میں لگے ڈھیروں میں سے خربوزے تربوز جس قدر چاہے کھا سکتی ہے۔ وہ کڑک چائے پی سکتی ہے۔ وہ بھنا گوشت کھا سکتی ہے۔ خوراک کے مضر نتائج کا طعنہ دینے والا کوئی نہیں ہے۔ وہ چنی کی طرح اونچی آواز میں بول سکتی ہے۔ بالی کی طرح چھوٹی بنیان بھی پہن سکتی ہے۔ کوئی روکنے والا نہیں۔ حد یہ کہ اس روز ایک خادمہ رازداری کی تجوری میں پوری کی پوری مقید اس کے کان سے آن لگی تھی۔

''چھوٹی بی بی جی! یہ بال صفا کریم۔''

وہ ساری کی ساری پسینے میں نچڑنے لگی۔ ایک بار تو جی چاہا پوری جاگیر حلق میں بھر کر گرج اٹھے۔

''تیری یہ جرأت چوہری مسلن۔''

لیکن پھر جاہنکوں کے بیچ اگے گھنے جنگل میں بھرے گرمی دانوں، ساون بھادوں کی پھنسیوں اور ہاڑ جیٹھ کے پھوڑوں میں ٹیسیں اٹھنے لگیں۔

استعمال کا طریقہ اوپر لکھا تھا۔ جس نے شرم کے تلاؤ میں غوطے دے دیے۔ کئی روز وہ اس نوکرانی سے منہ چھپاتی رہی تھی۔ جیسے کسی انتہائی بے شرمی والے فعل کی وہ چشم دید گواہ ہو۔ ایسا شرمناک فعل کہ جس کے گواہ کو قتل کرنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔

وہ خجالت کے پسینوں میں تو نچڑ رہی تھی لیکن کتنی فرحت بخش نجات، جو پینتیس برس میں پہلی بار تجربہ ہوئی۔ کہیں سے اس کی بے حیائی پر کوئی دھاڑ بھی نہ ابھری۔ وہ جو مدتوں خود کو بلوغت کے جرم کی شدتوں میں گھونٹتی رہی تھی کہ یہ فعل بھی اس کی کسی بے حیائی کا شاخسانہ ہے۔ اگر وہ ایسے انتہائی فیصلے کر سکتی ہے تو ایک اور فیصلہ کیوں نہیں۔

▪▪▪▪

کیا اب صنوبر کی بھی کوئی کہانی بننے والی ہے۔ وہ بھی ڈھنڈاروں کی رانی بننے جا رہی ہے۔ جیسے کبھی بالی تھی۔ چنی تھی۔ اس کی بھی کوئی جیون کتھا ہوگی۔ کہانیاں تو ان غریبوں ناداروں کی بنتی ہیں ان خاندانی حویلیوں سے تو کبھی کوئی کہانی نکلنے ہی نہیں دی جاتی۔ اب کیا وہ بھی زندگی جیے گی۔ وہی زندگی جو کتابوں میں بند مردہ پڑی تھی۔ مدتوں برسوں سے اُس کے روبرو پڑی، کتابوں میں مقید زندگی۔ کیا اب اس کے وجود میں ہمکے گی۔ اب ان جاگیروں، زمینوں کے مقدر کو پھر سے لکھنے کا وقت آ گیا ہے۔ کیا حاکمیت، طاقت، اقتدار، زعم اور رعیت کی ادلا بدلی کا وقت ہے۔ پھر سے ہڑپا اجڑنے اور بسنے کا وقت۔

جیسے بال صفا کریم نے عمروں کے بوجھ کو اتار پھینکا تھا اور کہیں سے اس شرمناک فعل کی تعذیر بھی نہ آئی تھی۔

جب وہ بولی تو پوری ملکیتوں کا اعتماد اس کی آواز میں فیصلے کی قطعیت بھر گیا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری انجانے میں خود اپنے سر آ گئی تھی۔ کہیں اندر گہری نیند سویا ہوا کوئی گھمنڈ انگڑائی توڑ کر اٹھا اور فیصلے کی پوری ذمہ داری قبول کر لی۔

''انھیں ملاقات کا پیغام پہنچاؤ۔ روبرو....''

عمر بھر کی صلواتیں اور بد دعائیں جیسے ٹیوب ویل کے کھاڈے میں اندھاتی تھیں۔

جیسے بال صفا کریم نے عمروں برابر بوجھ کو اتار پھینکا تھا۔

صنوبر کی آنکھوں کی اجنبی نخوت نے اپنے سینگوں پر ساری کی ساری زمینیں ملکیتیں اٹھا رکھی تھیں۔ جنھوں نے محمد اسلم کو اچانک ٹکر دے ماری۔

''آپ کا یہ جاننا ضروری ہے کہ

I am 36 years old

باقی آپ خود سمجھ دار ہیں۔''

وہ بولی تو جیسے یہ تیکھے نوک دار سینگ کسی پتھر سے بج کر ٹیڑھے کند ہو گئے۔

بھرے پیٹ بادل میں برق کا گولا پھٹا اور دھرتی سے ٹکرا کر واپس پلٹ گیا۔
گڑگڑاہٹ تادیر گونجتی رہی۔

''آپ کا یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ زندگی کے دس بہترین سال بدترین ٹارچر سیل کی نذر ہو گئے۔ وجود کے خلیے خلیے کو یوں داغا گیا کہ پورا وجود کرنٹڈ ہو گیا۔ کہ شاید اب شجر زیست پر کوئی شگوفہ کبھی نہ کھلے۔''

کند سینگوں پر دھری زمینوں جائیدادوں کی پنڈ اوندھا گئی۔ ساختہ غرور کی نیم وا آنکھیں اپنی پوری اصل ساخت میں کھل گئیں۔ جن میں نہ حیرت نہ استفسار اک ہما آہنگی۔ تیکھے نقوش سانولی رنگت میں مزید ترچھے ہو گئے۔ جن پر عہدے کا رعب تھا کہ حقیقت کا ادراک، عجب سکون، اعتماد۔

طویل و عریض دیوان خانے میں بھرے بوسیدہ فرنیچر کی ساری پوششیں جیسے بدل دی گئی ہوں۔ ہری گلابی شنیل کئی رنگوں میں منعکس ہوتی تھی۔ جس کی چھوٹیں محمد اسلم کے تیکھے نقوش والے سانولے چہرے پر مار کرتی تھیں۔ صنوبر کی آنکھیں پھٹی پھٹی سیاہ روشنائی کے کالے حرفوں کو نچوڑ چکی تھیں۔ کتابوں میں بند سنٹھ حرف لایعنی، جن کی کوئی تحریر بھی محفوظ رہنے والی نہیں ہوتی۔ معنی تو صرف ان حرفوں میں تھے جو محمد اسلم کے بھرویں ہونٹوں سے چھلکتے تھے اور صنوبر کی آنکھوں میں تحریر ہوتے تھے۔

''کیا ساتھ رہنے کو کسی مقصد کی برآوری ضروری ہے۔ کسی طمع کسی توقع کسی نتیجے کے بنا محض اپنی خواہش پر عمل کر نہیں رہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ رہا جا سکتا ہے.... زیادہ اطمینان سے زیادہ قناعت سے، بنا کسی فیوچر پلاننگ کسی نتیجے کی آس میں رہنے کی بجائے محض ساتھ رہنے کو رہنا۔ اپنے لیے رہنا کسی نسل کی آبیاری کے لیے نہیں رہنا۔ نسلیں تو بہت بارآور ہو رہی ہیں۔ اگر ہم اپنا حصہ نہیں ڈالیں گے تو شاید نیکی کریں گے۔ اس بڑھتی ہوئی دنیا پر۔ ہم ساتھ رہیں گے ساتھ رہنے کو۔ دنیا بڑھانے کو نہیں، کسی نسل کے لیے نہیں ایک

دوسرے کے لیے۔ کسی اور وجود کے لیے نہیں۔ اپنے اپنے وجود کے لیے۔

''بولیں ساتھ رہنے کو میرا ساتھ قبول ہے بی بی صاحب!

جیسے ساری عمر کی پڑھی کتابوں کو گھول کر تعویذ بنا دیا ہو اس ماسٹر اللہ دتے کے بیٹے نے۔ اس کے تیکھے تیکھے نقوش ہر جملے کی ساخت میں خود کو لپیٹ رہے تھے۔ تیز اور برہدف۔

جن کے تانے بانے میں وہ جکڑی گئی ہے۔ جیسے گئے وقتوں میں کبھی پیر جنڈی کی شاخوں پتوں میں جکڑی گئی تھی اور شرک کی مرتکب ہوگئی تھی۔ آج بھی کسی شرک کا دن تھا۔ کسی ناخدا کو سجدے کا دن۔ بنا کسی مقصد، کسی ہدف کسی نتیجے کسی مستقبل بندی، کسی آس کے بنا کسی جنت دوزخ کے وعدے کے بنا۔ جنڈی پیر کو سجدہ۔

زہر میں بجھی الماریوں میں محفوظ سوختہ مٹی کی مورتیوں کو سجدۂ شرک، الحاد۔ گردن فضاؤں میں ٹنگی رہ گئی۔

آواز حلق سے حیرت انگیز طور پر بلند ہو کر نکلی ''میری زمینیں جائیدادیں۔''

''تقسیم کر دیجیے ان نسلی اور موروثی وفاداروں میں بانٹ دیجیے۔ ہم ساتھ رہنے کو رہیں گے۔ کسی بوجھ، طمع کا گلا گھونٹ دیجیے۔ اس سفر کی شروعات سے پہلے۔''

بنا کسی جاگیر کسی دولت کے محمد اسلم کے اندر کیا صرف اس کا عہدہ بولتا تھا۔ اتنا حتمی لہجہ اس قدر قطعیت، اتنی وضاحت اور شفافیت۔

''میں بھی بہت اہمیت دیتا تھا ان دنیاوی امارتوں کو کبھی، انہی کے حصول کی خاطر اس عہدے کی تگ و دو کی، اپنے خاندانی پس منظر کو بدلنے کے لیے کتنا بے تاب تھا میں لیکن اک حادثے نے ٹارچر سیل کے دس سالوں نے بتا دیا یہ مقصد یہ ارادے تو کہیں اور ڈیپازٹ ہیں۔

کیا آپ کی خادمائیں، یہ مسلنیں، یہ پکھی واشنیں آپ کی نسبت زیادہ نہیں جئیں۔

ہمیں انہی کی طرح جینا ہے۔ بے لوث جینا۔ کسی لو بھ بناوٹ کسی لوازم کے بنا جینا.... جینے کو جینا۔ خود اپنے لیے جینا۔

ساتھ رہنے کو رہنا....۔"

****

دیویاں

پورے گاؤں میں ہوک پڑ گئی تھی۔ ''ساتھ رہنے کو رہنا'' دور نزدیک بیاہی ساری لڑکیاں چڑیوں کی مانند اڑ آئیں بھرتی جمع ہو گئی تھیں اور چہچہانے لگیں۔ گھڑے کے منہ پر چوڑی ہتھیلی کی تھاپ اور پرات کی پشت پر دھپ دھپ بجتی چھلے والی انگلیوں کی ضرب کے بعد ہتھیلی کا زوردار دھماکہ اک ردھم، جنگلی میوزک

ہو گوری تیرے مگر پرآندہ
بھلا ہو گوری رب رانجھے نوں آندہ
ہو گوری تیرے کول نہ بہے
بھلا ہو گوری تیرے نوکر ہو رہے

شادی کے گیت جیسے عمروں صدیوں کی ساٹھ حویلی کے خشک گلے نے کھنگار کر فضا میں بکھیر دیے ہوں۔ پھر وہ لڑکی جو گھڑے کے منہ پر منہ رکھ ایک کرب ناک حقیقت کو

بیان کرتی تھی۔ جس کی آواز گھڑے کے پیٹ میں سے یوں ابھرتی جیسے ہڈبیتی کی تمثالت میں لتھڑی کنویں کے پیٹ میں گھڑگھڑاتی ہو۔ جو پورے گاؤں کے مردوں کے نام لے لے کر دہائی دیتی اور ان کی بدنیتی کا قصہ سناتی۔

جے میں ریحانے ویہڑے جا، وڑی
اس ریحانے نے کیتی بدنیتی
انھیں پھڑ لئی میری تہدتی
توں چھڈ دے میری تہدتی
اس گلاں نوں رکھ لے توں کول وے
مینوں کڈ دے اندروں باہر وے

باری باری ہر مرد کی نیت کو وہ شک کے ترکلے میں پروتی اور اپنی بے بسی کا رونا گھڑے کے پیٹ میں گھڑگھڑاتی جیسے کسی لٹی پٹی کی آواز اندھے کنویں سے آتی ہو جو کسی مرد کے ظلم سے ڈوب مری ہو۔لیکن روح حال دہائی دیتی زندہ ہو۔

اس کی نیم رضامندی سے ان لڑکیوں عورتوں نے دکھ کے ڈھنڈار اس قدیمی اُداس حویلی کو شادی والا گھر بنا دیا تھا۔

دائرے میں چینا چھنڈتیں گیت الاپتیں، مہندی کے تھال گھولتیں جو کے آٹے اور ہلدی سے ابٹن بناتیں کسی کو فراغت ہی نہ تھی۔ جیسے ایک دوسری سے بازی لے جانا چاہتی ہوں۔اس موت حویلی کی پہلی اور آخری خوشی میں اپنی اپنی خوشی کی آخری بوند بھی نچوڑ دینا چاہتی ہوں۔

ان کے بس میں ہو تو وہ صنوبر کے بگے سیاہ کر دیں۔ چہرے کی چنٹوں کو ابٹن مل مل استری کر دیں۔اور وہ بہت کامیاب بھی رہی تھیں۔

صنوبر نے جب قد آدم دھندلے شیشے میں خود کو دیکھا تو کھڑی دیکھتی رہ گئی۔ نکھری ہوئی رنگت میں دوڑتی فیصلے کی سرشاری، ساتھ رہنے کو رہنے کی سرخوشی۔ کٹورہ آنکھیں جو آنسوؤں کے تالاب بنی کبھی اصل ساخت میں کھلی ہی نہ تھیں۔ کتابوں زدہ کرم خوردہ چہرہ جیسے ساتھ رہنے کو رہنے والے شفا چشمے میں ڈھل کر گلابی مخمل ہو گیا ہو۔

کیا وہ عمر بھر جھوٹے طعنوں والے احساس کمتری میں بدصورت رہی۔ اس بدصورت چہرے میں یہ سب کہاں چھپا تھا۔ پتھر اتا چشمہ، ذرا سا عصا چھوا تو شفاف تازہ آبدار۔ اس نے عمر بھر شیشہ کیوں نہ دیکھا۔ خود کو ہی دیکھنے کی اجازت کیوں نہ دی گئی کہ کہیں خود کو پہچان نہ جائے۔ سنگ مرمر کی تراشی ہوئی یہ مورتی پتا نہیں کن کھنڈروں میں دفن رہی۔ صدیوں سالوں۔ جسے عمروں بعد باہر نکالا گیا ہو۔ لیکن کسی تیشے کسی کدال سے کہیں ذرہ بھی نہ بھری نہ ٹوٹی پھوٹی پورا چہرہ محفوظ۔ ناک کان دانت ہونٹ پیشانی کسی ماہر سنگ تراش کا شہکار، مٹی کی سوختہ مورتیوں سے افضل تر۔ زہر بجھے شلف میں بند سنگِ مرمر کی تراشی ہوئی دیوی سی مورتی۔ اس کے اردگرد سوختہ مٹی سے گھڑی، مٹے مٹے نقوش اور گہری رنگتوں والی مورتیاں جو اس کی خوشی میں چور گانے ناچنے میں مست اپنی سدھ بدھ کھو رہی تھیں۔

یہ ہڈیوں کے پنجر، نحیف ونزار۔ قبل از وقت بوڑھے بیمار، قبل از وقت موت۔ آخری ماہوری تک ان گنت زچگیاں کربل کربل کیڑے لاروؤں اور پسوؤں کی طرح پھوٹتے ہوئے۔ ہاتھ کے پیالے میں مڑی ہوئی تنوری روٹی جس پر کٹی ہوئی لال مرچ کا لاون، گھی مکھن دودھ دہی تو جٹوں گجروں کو میسر ہے۔ ان کی جھگیوں میں تو بس سال بھر کا اناج۔ وہ بھی کسی سگھڑ سیانی کے گھر میں جو ذائقے اور چٹخارے پر پتھر کی سیل رکھ جیتی ہے۔ ورنہ ٹانگر مرنڈے وٹا بھر ولا خالی ہو گیا۔

اس بڑی زمینداری کی آغوش میں پلتی ہوئی وفا شعار غربت۔ سال بھر کی جی توڑ محنت

فصل کے دسویں حصے کی حقدار۔ بڑی جاگیر بڑی حویلی کی شادی میں دیونی، ناچتی گاتیں۔ بس میں ہو تو صنوبر بی بی کے پیٹ میں کوئی نر بیج آج ہی اگا دیں۔ جاگیروں کا وارث۔ مزارعیت کا رکھوالا۔ خود جنھیں بچا کر سنبھال کر کچھ بھی رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ بس اتنا کہ جسم و جاں کا رشتہ قائم رہے۔ اتنا ہر گز نہیں کہ جسم پر گوشت چڑھ جائے اور آنکھوں پر چربی۔ بس اتنا کہ ڈھچر ڈھکے رہیں۔ اتنا ہر گز نہیں کہ لباس کا شعور پیدا ہو جائے۔

ڈنگ بھر کا کھانا جسم بھر کا ڈھک۔ اس سے بڑھ کر بوجھ اور طمع جو وفا شعاری اور تابعداری کو مات دے دیتا ہے۔ فطرت سے پھوٹے فطرت زادے جنھیں کسی مذہب تعلیم کی تراش خراش میں لانا فطرت سے لڑائی ہے۔

جڑی بوٹیوں کی طرح اگتے اور موسمی زندگیاں جیتے مرتے۔ جن کی نہاد میں تابع فرمائی، وفا شعاری، صبر، برداشت اور خدمت گزاری گندھی ہے۔ وہ انھیں ان کے نسلی اوصاف سے محروم کرنے والی کون ہے جو کچھ بھی سینت سنبھال رکھنے کے عادی نہیں ہیں۔ نہ حسن نہ شباب، نہ تعلیم، نہ پیسہ۔ یہ کہیں باہر سے نہیں آئے۔ اسی خاک سے گھڑی سوختہ مٹی کی نسلی مورتیاں.... بس عمروں صدیوں میں کبھی کہیں اس مٹی کی خام دانش جوش مارتی ہے۔ تو کوئی بالی، کوئی چنی یا پھر کوئی ریحانا ساری خام دانشوں کو مجتمع کر دیتا ہے۔ ڈھولوں اور ماہیوں والی دانش مجسم ہو جاتی ہے۔ یہ زمین زادے اس زمین پر ملکیت کے لیے نہیں پیدا ہوئے۔ اس زمین کی خدمتوں کے لیے مرتے جیتے ہیں۔ قابض تو باہر والے ہوتے ہیں گھر والے تو خدمت گزار۔ صنوبر کو کیا حق ہے۔ ان کے قناعت اور صبر کے بھاری پتھر کو چھید لگا دے۔ جو اس کی اس وقت خوشی میں دیوانہ وار رقص کناں تھے۔ ''شادی بی بی دی سانوں خوشیاں بہوں چڑھیاں۔''

■■■■

سارے جاہل اجڈ، غریب غربا عجیب برات اتری تھی۔ کچے پیتل کے زیورات، گلابی لال رنگ زدہ چہروں والی شوہدی شوہدی عورتیں۔ جیسے چوک میں کھڑا امیاری والے کا ٹھیلا۔ چہروں پر نسلی کمینگی افلاس اور بے رنگی اپنے پورے اعتماد کے ساتھ بڑھ چڑھ کر بول رہی تھی۔ غربت، افلاس، بے توقیری بے بضاعتی پورے وجود سے بڑبڑ متعارف ہونے لگی۔

نوعمر خادماؤں نے ایک دوسری کی بغلوں میں منہ چھپا چھپا کر قہقہے دبائے۔

''نی ذوبی نی ذوباں! ڈونگھوں کے ڈھکنے اتار کر سالن والے چمچے دکھا آؤ۔ انھیں کیا خبر ڈونگھوں ڈشوں کی، کہیں ڈونگھوں میں سے ہی برکیاں نہ لگانے لگ جائیں۔''

بڑی بوڑھیوں نے دھیمے دھیمے بین کھینچے۔

''ہائے ڈاہڈے مقدر برے، کوئی کہہ سکتا تھا کہ وڈھے ملک صاحب علاقے کے بادشاہ صاحب نسلوں کے رئیس صاحب اور ان شہدوں سے رشتہ داری، ہائے اوئے ربا! نیچ پلیچ گئے آں۔ بھاویں ڈی سی صاحب ہوویں پر مقابلہ تو کوئی نہیں۔ دھرتی تے آسمان دا مقابلہ کوئی نا۔''

صنوبر کمرے میں بند باہر برآمدے میں لگے تماشے کو کھڑکی کی جھیت سے دیکھتی تھی۔ اُس جھیت سے جہاں سے وہ صحن میں چوری چوری جھانکتی تھی، خبر لگنے پر جس کے سامنے چارپائی کھڑی کر دی جاتی تھی۔ آج وہ روبرو دیکھتی تھی۔ افلاس کی بدتہذیبی کا تماشا۔ وہ ان خادماؤں جیسے تھوڑی تھے۔ جنھوں نے ہوش سنبھالتے ہی بڑی حویلی کی جھاڑ پونجھ کی۔ امیرانہ خوراکوں سے لبڑے برتن دھوئے۔ مہنگے پھلوں کے چھلکے اور کیک مٹھائیوں بسکٹوں کے خالی ڈبے کوڑے میں پھینکے۔ قیمتی پوشاکیں اس احتیاط سے دھوئیں اور استری کیں کہ کہیں خراب نہ ہو جائیں۔ لیکن دیکھ تو سب لیا۔ برت تو سب لیا نا۔ سیکھ تو سب لیا۔

ان کی طرح تھوڑی کہ پہلی بار اتنا سب دیکھ کر آنکھوں کے ساتھ حلق بھی پھٹ جائیں۔
''نی امی میں اے پھلاں آلا گلاس لینا۔ میں اے کارنس والا گھوڑا لینا۔ نی خالاں یہ کیا ہے۔ بتا، نی پھوپھی یہ کیا ہوتا ہے۔'' محمد اسلم دس سال جو ٹار چر سیل میں سہتا رہا اس کا سارا ادگاڑ خاندان بھر پر نازل ہوتا رہا تھا۔
ہڈیاں چچوڑتے بچے، کھانے میں سنے ہاتھ پردوں صوفوں پر ملتے ہوئے۔ پورے گھر میں بھاگتے دوڑتے اشیا گراتے پھینکتے توڑتے پھوڑتے۔ صدیوں کی خاموشی کو ہلاک کرتے جیسے آثاروں کی صوفیانہ خاموشی میں کسی دیہاتی سکول کے بچوں کا ٹرپ گھس آیا ہو اور پہرے داروں کو آپا دھاپی پڑ گئی ہو۔
کئی ڈیکوریشن پیس ٹوٹ گئے۔ کئی ایک ماؤں نے زبردستی چھینتے چھینتے توڑے۔ پھولوں کی کیاریاں لتاڑی گئیں۔
ٹیوب ویل کے کھاڈے میں نئے جوتوں اور کپڑوں سمیت چھلانگیں لگا صوفوں پر لوٹیں لگاتے۔ اجڈ بچے۔
سارے پرندے شور مچاتے اڑ گئے۔
مویشی ڈکرانے لگے۔ خادمائیں گھٹے گھٹے بین اٹھانے لگیں۔
اس نے چاہا وہ منشی ریحان کو بلا کر خوب ڈپٹے اور چیخ کر کہے۔
''دفع کرو انھیں یہاں سے نکال باہر کرو۔ شہدے کمینے! کوئی نکاح وکاح نہیں ہو رہا یہاں.....''
اسے لگا اس کے اندر کہیں سے بڑی بی بی جی چیخ پڑی ہیں۔
''گدھی! رشتہ دار تو دیکھو کیسے ڈھونڈے ہیں۔ کمینے، اسفل، رذیل۔ کوئی خیال بھی، اپنے بڑے خاندان کا، باپ دادے کی عزت کا، نکالو انھیں میرے گھر سے۔ خبردار جو چوکھٹ سے پیر باہر دھرا ان اسفلوں کے ساتھ....''

بڑی بی بی جی کا یہ حق تھا کہ وہ اپنے گھر کو اپنی جاگیر کو مرنے کے بعد بھی اسفلاوں رذیلوں کی دست برد سے بچائیں۔لیکن وہ تو اس ملکیت کا حصہ نہ رہی تھی۔ مالک بھی نہ رہی تھی۔ اس روز سے جس روز سے معاہدہ طے پا گیا تھا۔ ساتھ رہنے کو رہنا بنا کسی مقصد کسی آس کسی لوبھ، کسی پلاننگ کے رہنا ساتھ رہنے کو رہنا۔ وہ اس ہڑ بونگ میں اپنے فیصلے کے روبرو چپ کھڑی تھی جیسے آثاروں کی کھدائی کے دوران نکلے عجیب و غریب انلیکز ششدر کرتے ہوں۔ بونے بونے بھوت ازدحام کرتے نکل آئے ہوں۔ نہ کھدا ہوا بند کیا جا سکے نہ مزید کھودا جا سکے۔ نجانے مزید کیا کیا خوفناک سامنے آ جائے۔ ریحان رجسٹر کے کھلے پرت پر کھلا پن رکھے منتظر تھا۔

آسمانی رنگ کے نئے نکور کپڑوں کو گھٹنوں سے کھینچ کر جھولی میں سمیٹے گردن سینے میں دھنسائے اس کے قدموں میں بیٹھا تھا۔عروسی جوڑے کے موتی دبکے اپنی لشک ریحانے کے سوتی آسمانی کپڑوں پر چھوڑتے تھے۔ریحانے کے آنسوؤں کی جھڑی گلابی قالین کو بھگو رہی تھی۔جس میں دھنسی گرد کا ملگجا رنگ، مٹیالا ہو گیا تھا۔رجسٹر پر نام ثبت ہو چکے تھے۔

دلہن کا نام۔صنوبر خانم ولد ملک ولایت اللہ خان۔

دولہے کا نام۔محمد اسلم ولد ماسٹر اللہ دتا۔

زمین کا دائروی ٹکڑا آنسوؤں سے گچ ہوتا تھا اور ہچکیاں جیسے ٹوٹے پھوٹے جملوں میں تڑختی تھیں۔

''اب تو ہو گیا بی بی صاحب! اب تو دستخط کرنے ہی ہوں گے۔ چھوٹی بی بی صاحب جی۔ لاضروری مجبوری ہے۔''

ریحان نے قلم رجسٹر کے دونوں پرتوں کی آغوش سے اٹھا کر فضا میں بلند کیا اور سر گھٹنوں کی جھولی میں مزید دھنسا لیا۔ ہچکیوں سے کمزور پسلیاں کھڑکھڑانے لگیں۔

جیسے ساری دراوڑی نسلیں مل کر روتی ہوں۔

صنوبر کو لگا یہ ریحان نہیں فطرت کی وہ اندھی طاقت ہے جو منہ زور ہے۔ جسے تقدیر کہتے ہیں۔ جو تمام رکاوٹوں سے ٹکراتی ہوئی اپنا راستہ آپ بناتی ہے۔ جس کی لکھت فطرت کی خدائی ہے۔ جس کے فیصلے ان مٹ ہیں۔ وہ اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔

پورے گاؤں کی عورتیں اک دوجی کے گلے سے چمٹی تھیں۔ اور چیخوں کوکوں اور رخصتی کے گیت نما بینوں سے حویلی کے ڈھنڈار گونجتے خالی رہ گئے تھے۔

▪▪▪▪

ہڑپا زندہ ہے

زندگی میں پہلی بار وہ کسی مرد کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیاں باہم پھنسائے یہ کسی مرد کے ہاتھ تھے۔ جن کی ساخت وہ عمر میں پہلی بار مشاہدہ کرتی تھی۔ منشی ریحان کے ہاتھ تو بردے غلام کے ہاتھ۔ اُن پر نظر ٹکنے کا جرم تھوڑی سرزد ہو سکتا تھا۔ سفید شلوار سوٹ میں ملبوس آزاد مرد جس کے تیکھے نقوش زردی ستولاہٹ میں گہرے گہرے کھبے تھے۔ جس کا لمس پہلی بار اتنا قریب تھا کہ سانسوں کی حرارت اور دل کی دھڑ دھڑ مدغم ہو رہی تھیں۔

وہ تو ایسی قربت کے تصور سے ہی دل کے دورے جیسی کیفیت سے دوچار ہو جایا کرتی تھی لیکن آج یہ کیا تھا۔ اس قدر نئے، انوکھے، ہٹ کر پہلی بار کے تجربے کا احساس کوئی تھرتھلی کیوں نہ مچا رہا تھا۔ خوف، خوشی یا پھر حیرت کی بے ترتیب دھڑکنیں کیوں شانت تھیں۔ وہ تو عمر بھر پل پل اُس مرغابی کی طرح خوف بھری دھڑکنوں میں بجتی رہی تھی۔ جو چھرے کھا کر دلدلی سرکنڈوں اور سیلابی دبڑے میں چھپتی، لمبی سیاہ چونچ گارے میں کھبوتی

اور زخمی پروں کے قوسِ قزح پھیلاتی سمیٹتی، جس کے ننھے سے دل کی تیز آواز اُس کی پناہ گاہ کا پتا دیتی ہے۔ جو شکاری کے چھُرے تلے آنے سے بہت پہلے خوف سے ہی بے دَم ہو جاتی ہے۔ حیرت انگیز تو یہ تھا کہ کوئی دھاڑ بھی نہ آئی تھی۔ شاید ابھری تو ہو لیکن منوں ٹنوں مٹی تلے دب کے رہ گئی ہو۔ ڈھنڈاروں میں دفن ہو گئی ہو۔

آج وہ ایک اجنبی مرد کے ساتھ یوں بیٹھی ہے۔ جیسے یہ اُس کی زندگی کا معمول ہو۔ عمروں سے ساتھ رہنے بسنے والا مرد۔ ماضی کا طویل اشتراک۔ وہ محمد اسلم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ بھی کسی جذبے سے یکسر عاری ہے، جیسے آج کچھ نیا کچھ انوکھا نہ ہوا ہو بلکہ جس روز ماسٹر اللہ دتہ ایک ناجائز خواہش لے کر حاضر ہوا تھا اُسی روز سے دونوں کے بیچ معمول کی زندگی استوار ہو گئی ہو۔ دونوں ایک دوسرے سے منگے گئے ہوں۔

اس معمول کے درمیان میں ایک لمبا وقفۂ جدائی آیا ضرور، دس سال کا ٹارچر سیل حائل ہوا ضرور، لیکن عادات، گفتگو، خواہشات سب معمولات کا حصہ رہے۔ جس مکان میں اک عمر گزاری ہو۔ اگر لمبے وقفے کے بعد کسی رات کے تاریک پہر میں داخل ہوا جائے تو ہاتھ اسی سوئچ پر پڑتا ہے جس سے بلب جلتا ہے، پنکھا چلتا ہے۔ بخوبی علم میں ہوتا ہے کہ کس غسل خانے کی ٹونٹی ٹپکتی تھی۔ کونسا چولہا تیز جلتا تھا۔ کس کمرے کی چٹخنی ٹوٹی ہوئی تھی۔ کس کا دروازہ پھنستا تھا۔ کس صوفے کی پوشش گھسی ہوئی تھی۔ کس کرسی کی ٹانگ کھسکی ہوئی تھی۔ دستی سامان رکھنے کو ہاتھ بغیر دیکھے اُس تپائی کی سمت بڑھتا ہے جہاں رکھنے کی عادت تھی۔

صنوبر کو بخوبی معلوم تھا کہ ساتھ بیٹھے شخص نے بچپن کی شرارتوں اور نوجوانی کی ترنگوں کو صبر کے دم تلے مستقبل کی منصوبہ بندی میں گھونٹے رکھا۔ خاندانی پس منظر بدلنے کی خواہش میں جو آج اُس کے پہلو سے لگا بیٹھا ہے تو درمیان میں در آیا دس سال کا ٹارچر سیل دونوں کا اشتراک ہے، جس نے ساری اجنبیت، سارا بُعد اور عمروں کی مسافرت ہڑپ لی ہے۔ دونوں اک دوجے کے راز داں محرم۔ دونوں یکساں ذہنی ونفسیاتی کیفیات کے پروردہ۔

صنوبر اس بڑی حویلی سے نجات کی دعائیں کرتی ہوئی چاہے یہ نجات موت کی شکل میں ہو۔ محمد اسلم ایسی حویلی کے حصول کی تگ و دو میں کہ جو تگ و دو ہلاک بھی کر سکتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے محور سے نکل کر کسی ایک نقطہ اتصال پر آ گئے تھے۔ ساتھ رہنے کو رہنا۔ دس سال کا بن باس دونوں کا اشتراک، جس نے مغائرت کو اپنی زخمی انگلیوں سے چن لیا ہے۔ اب وہ باقی ساری عمر ساتھ گزار سکتے ہیں۔ بنا کسی سوال جواب، بنا کسی باہمی گفتگو، خاموشی کی بکل میں، اک دوجے سے بندھے، معمول کے بہاؤ میں۔

معمول کے بہاؤ میں یک دم غیر معمولیت آ گئی۔

''ہڑپا آثارِ قدیمہ''

ایک بڑا سا بورڈ رستہ کاٹ گیا۔

بے حس، جذبات سے عاری زندگی جیسے معمول کے وقفے میں، یہ ہڑپا اپنی تمامتر اضطراریت اور پُرشور شدتوں کے ساتھ گھس آیا تھا۔

''ہڑپا آثارِ قدیمہ''

عمروں برابر خواہش کی شدت میں اُس کی زبان سے الفاظ اتنی آواز سے بلند ہوئے کہ ڈرائیور کا اسٹیرنگ بھی ڈول گیا۔ مدفون شہر قدیم، شہر ہڑپا، زندگی سے چھلکتا ہوا جہاں بالی کا شہر رنگین آباد تھا۔ چنی کی نخوت کا نگر تھا۔ جہاں سوختہ مٹی کی مورتیاں بستی تھیں جن کو سجدے کا شرک سرزد ہوا تھا۔ جس کی بھینٹ پورا ایک خاندان چڑھ گیا تھا لیکن جس کے نظاروں سے صنوبر محروم رہی تھی۔ وہی ہڑپا اُس کی راہ میں خود آ پڑا تھا۔ آثارِ قدیمہ کے اوقاتِ کار ختم ہو چکے تھے۔ تالے پڑ چکے تھے اور چوکیدار اپنی تلے کی تارسی دُلہنوں سے جڑے تھے کہ ہنگامہ مچ گیا۔ ضلع کے حاکم ڈی سی صاحب کے لیے کون سے اوقات مقرر ہوتے ہیں۔ سارے دروازے تالے کھلتے چلے گئے۔

ٹیلوں کی پشت پر ڈوبتے سورج کی شفق، کچی دھول میں گھل کر زرد غبار بن چکی تھی۔

یہ وہی غبار تھا جس میں سے بالی پھوٹ کر چھتنار ہوئی اور پھر اقبال بیگم کے ڈھینگر میں تبدیل ہو کر بالن بن گئی۔ وہی دھول کا زرد غبار جس میں سے چنی کی کونپل پھوٹی اور چاند بی بی ہو کر یہیں کہیں سوختہ مٹی کی مورتیوں میں مجسم ہو گئی۔ وہی مورتیاں جن کے سامنے ایک سر جھک گیا تھا اور شرک کا احساس سب بھسم کر گیا تھا۔

سارے ٹیلے ٹبے، آثار نشیب ڈوبتے سورج کی زردی چہروں پر ملے سوگوریت میں ڈوبے تھے۔ دن بھر کی بے شمار آوازیں اَن گنت قدموں سے اُڑتی دھول میں لپٹی آثاروں میں دفن ہوتی تھیں۔ پژمردہ سورج صفِ ماتم بچھائے منہ بند ٹیلوں کو خونی تاریکی میں تابوت کرتا تھا۔ جن کے اندر کتنی زندگی، کتنے ہنر کمال اپنا اپنا حصہ ڈال کر چپ تھے۔ یہیں سے زندگی پھوٹتی اور پھر یہیں دفن ہوتی تھی۔ کتنی بھرپور زندگی کتنے ہنر کمال ہماہمی گہما گہمی، نسلوں اور پیڑھیوں کی بندھی۔ آثاروں کے خار دار حصوں کے اردگرد گھومتی پٹڑی سے اُترتی بے شمار پگڈنڈیاں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئی چھوٹی چھوٹی بستیوں کو آپس میں ملاتی تھیں۔ جن پر سے گزرتے ریوڑ دھول کے مٹیالے خیموں کی طنابیں تانتے تھے۔

پورے آسمان کے گولے کو ڈھانپے ہوئے۔ مدقوق چہرہ غبار میں چھپے چرواہے آج کا آخری گیت الاپتے اُنھیں دیکھ کر ٹھٹھک گئے اور تماش بینی والی فطرت کے مطابق اُن کے گرد جمع ہو گئے، چوکیدار ڈنڈے سونت کر لپکے تو صنوبر نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

چیکٹ، بالوں کی لٹیں بکھیرے، میل کی تہیں چڑھے منہ پر ایک ایک ہاتھ رکھ چھوٹی لڑکیاں ان دونوں پر ہنستی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنی کھسکتی ہوئی شلوار سمیٹتی تھیں۔ یہ بھی مورتیوں جیسی کوئی عجیب الخلقت چیز ہوں گے جن کی حفاظت کے لیے اتنے پہرے دار اتنے گارڈ الرٹ کھڑے تھے۔ میل کی پپڑی میں چھپے تیکھے نقوش والی چھوٹی لڑکی کو صنوبر نے قریب بلایا۔

''تم بالی ہونا؟''
''نہیں بالی میری پھوپھی لگتی تھی پر وہ گندی تھی۔''
اب گہری سانولی رنگت میں دھنسے دھنسے نقوش والی لڑکی کو صنوبر نے قریب آنے کا اشارہ کیا۔
''تم چنی ہونا؟''
''نہیں چناں تو میری ماسی لگتی تھی۔ وہ بھی گندی تھی۔''
''میں جانتی ہوں، تمہاری ماسیاں پھوپھیاں سب کو جانتی ہوں۔''
''آپ کو کیسے معلوم، آپ تو پہلے یہاں کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔'' لڑکیوں کے گھٹے گھٹے قہقہے اُس کے جھوٹ کا مذاق اُڑاتے ہوں جیسے، وہ ساری ایک دوسرے کو اوڑ نگے لگاتی ایک دوسری میں چھپتی انسانی گولا سا بن گئی تھیں۔ محمد اسلم کا اَن کہا سوال بھی جیسے بچیوں کے سوال میں موجود تھا۔
''آپ کیسے پہچانتی ہیں کبھی چار دیواری سے تو نکلی نہیں ہیں۔''
دھول کے زرد غلاف، ٹیلوں ٹبوں کو ہموار کر چکے تھے۔ سب دیکھا اندھا، ساری رنگا رنگی تو اس نور کی پتلی کے طفیل جسے تاریکی نابینا کر رہی تھی۔
''میں پہچانتی ہوں افراد کو نہیں سلسلوں کو، وہی سلسلے جو افراد کے جثّوں پر خود کو کندہ کر دیتے ہیں۔ ہر خاندان قبیلے کے نین نقش، آواز، ٹور، چال ڈھال، قدبت.... کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلۂ انسانی، جسے آج تک کوئی آثارِ قدیمہ نگل نہیں سکا، افراد مٹ جاتے ہیں سلسلے نہیں۔ جیسے یہاں کی مہریں، افراد کی نہیں سلسلوں کی نشانیاں ہیں۔ اسی طرح یہ نقوش، صدا، رنگ ڈھال پورے قبیلے کی شناختیں، پکی مہریں، نسل در نسل....''
سورج کی ٹکیا ملگجی زردی میں پھیلتے پھیلتے معدوم ہو گئی تھی۔ افق سونا رنگے پانیوں میں ڈوب چکے تھے۔ آثاروں کے گڑھوں سے پیلی پیلی سیال تاریکی کا گاڑھا دھواں اُٹھ

رہا تھا۔ جس میں معدوم ہوتے ریوڑوں کے بڑے بڑے دھبے، پگڈنڈیاں اُترتے چرواہے، آج دن کے آخری گیت کی بازگشت کھنڈروں میں اوندھاتے ہوئے۔ زرد تاریکی کے گولے میں سب بھرتا ہوا۔ بے شناخت ہوتا ہوا، کالی رات کی اندھی قبر میں دفن ہوتا ہوا جیسے قدیمی ٹیلوں میں نسلیں اور ادوار دفن ہیں۔

جس جنڈ کے نیچے چرواہے بچوں میں وہ گھرے تھے اُس کی صدیوں پرانی شاخوں اور نئے نئے پھوٹتے پتوں سے بھی زیادہ وہاں پرندے بھرے تھے جو سبھی مل کر آج کا اپنا آخری گیت گا رہے تھے بھرپور زندگی کی گواہیاں۔ اتنی آوازیں اتنی چہچہاہٹ پورے ماحول کو ڈھانپتی ہوئی زرد رو دھول، سبھی عناصرِ فطرت اندھیرے کی آغوش میں سونے کی تیاری میں مشغول، آج کے دن کی زندگی کا خاتمہ، آج کی ہنوز کی تمامیت۔ سب ایک زرد رو سرمئی گولے میں معدوم۔ جنھیں تاریکی کی کافوری ٹھنڈ منجمد کر رہی تھی۔

پرانے جنڈ کے گرد گھومتے بینچ پر محمد اسلم یوں ذرا سا ٹکا تھا جیسے کوچ کے نقارے کا منتظر ہو۔ یوں راہ میں اچانک آ پڑے اس کھنڈر کی ساری بے زاری چہرے پر لیپے ہوئے زبردستی مسکراتا ہوا جیسے اپنے بے اختیار حکم کو بمشکل روکتا ہو کہ مسمار کر دو ان کھنڈروں کو جو ازدواج کے پہلے روز اپنی ساری ویرانیوں اور وحشتوں کے ساتھ اُن کے درمیان در آئے تھے۔ صنوبر کی نگاہیں اس زرد اندھیرے کے گولے کو چیرتے ہوئے ابھی اُٹھ کر چل دینے کے انداز میں بیٹھے ہوئے محمد اسلم کے چہرے پر جم گئیں۔

جیسے ڈھنڈاروں میں پھیلا سارا زرد اندھیرا دراصل اسی چہرے سے پھوٹتا ہو، یا شاید ڈھنڈاروں سے اُٹھتا سیال زرد سیلاب اُسی چہرے کو مار کرتا ہو۔ وہ دھک سے رہ گئی کیکروں کے پھولوں کا پیلا پیلا گودا، ناک کی پھنک اور رخساروں کی نوکوں پر چپکا تھا۔ صرتج کا سونا رنگ پشم نیم کی نمولیوں کا گودا، سرسوں کے پھولوں کے پانی میں جیسے سب کھرل ہو کر اُس چہرے سے نچڑتا ہو۔ اُس نے آنکھیں جھپکیں۔ گدھ جیسی قوت شامہ

بلا وجہ ہی متحرک ہو گئی تھی کہ واقعی موت مہک کہیں قریب میں پھیلی تھی۔ اُس کے وجود میں کہ سانجھ والے وجود سے، کچی دھندسی چھاتی تھی۔ وہی موت مہک جس کی انکاری وہ بارہا ہوئی لیکن ہر بار وہ اُس کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے اپنے شکار کو دبوچ لے گئی۔

وہ زرد دھواں لپٹا چہرہ کسی گہری ڈوبتی سوچ میں تھا کہ سوچ کے زرد سیال میں سے نچڑتا تھا۔

''کیا خیال ہے چلیں نا.... ڈی سی ہاؤس آپ کے اعزاز میں اس وقت ظہرانہ ہو رہا ہوا ہے۔ سارے دوست اور اُن کی بیگمات آپ کی منتظر ہیں۔'' سانولی رنگت میں مزید تیکھے ہوتے نقوش جیسے گیندے کی پنکھڑیوں کے کنارے، زردانوں کی کٹوری کو ڈھانپے ہوں۔ صنوبر کی نگاہیں کھب گئیں۔ زرد پپڑی جمے ہونٹ جن کے کنارے پیلاہٹ میں ناپید ہو رہے تھے۔ وہ مسکرایا تو ہونٹوں کی مسمار قوسیں، نتھنے کے ابھار، سانس کے زیر و بم میں ذرا ذرا پھیلتے ہوئے جیسے انقباض میں ہوں۔ جن پر ہلدی کا قطرہ قطرہ ٹپکتا تھا۔

وہ منہ کھولے دیکھتی رہ گئی۔ کہیں دل کا دورہ کہ نسوں میں جمتا ہوا لہو، جس کی گردش ہونٹوں، ہاتھوں کی پوروں، ناک کی پھنک اور کانوں کی لوؤں تک نہیں پہنچ پا رہی۔ اُبٹن کے سیال میں ڈوبتے چہرے کو وہ بے بسی سے دیکھتی چلی گئی۔ وہی موت ابٹن جو وہ پہلے بھی کئی چہروں کو چڑھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ وہ ہنسا تو ہلدی بیسن ملے پانی کے چھینٹے جیسے صنوبر کے چہرے پر برسے۔ اُس نے جھرجھری لی۔ جیسے ان چھینٹوں کو کافور چڑھا ہو۔

''کیا دیکھتی ہیں۔ یہ معمولی چہرہ پسند نہیں آیا؟ حنائی چہرہ کھلکھلایا۔ جی چاہا چیخ کر آگاہ کرے۔ خطرہ خطرہ خطرہ۔ سائرن بجادے۔''

''شدید خطرہ۔'' دل خون کی گردش نہیں کر پا رہا۔ اعضا تک سپلائی نہیں پہنچ رہی۔ سارے اعضا پژمردہ کونپلیں، درخت سے کٹی ہوئی شاخیں جو کچھ عرصہ سرسبز رہتی ہیں پھر پتے مڑنے لگتے ہیں۔ نئی نئی پھوٹتی لغریں مرجھانے لگتی ہیں، لیکن جب وہ خطرے کا سائرن

بجائے گی تو وہ قہقہہ لگا کر کہے گا۔

''میری مسیحا تو میرے ساتھ ہے۔آپ کی معیت میں کسی دل کے دورے کسی موت کے ہاتھ کی جرأت کہ مجھ تک پہنچے۔''

اُن کے درمیان جاری مکالمہ بند لبوں کے ساتھ محوِ گفتگو تھا۔ جیسے توتا مینا کوئی کتھا کرتے ہوں۔

''اچھا تو پھر جب تم یہاں سے اُٹھو گے تو پیر رپٹ جائے گا اور ٹیلے کے قدموں میں بھیجا اُلٹا پڑا ہوگا۔زرد جھلی سے ابلتا ہوا دندانے دار مغز۔'' وہ جوابی قہقہہ لگا کر کہے گا۔

''آپ ہیں نا سہارا دینے کو....گرنے لگوں گا تو آپ سنبھال لیں گی۔گروں گا تھوڑی۔''

اچھا اگر یہاں سے بچ گئے تو....

تو پھر گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوجائے گا اور سب چور چور فنا۔''

وہ تفاخر سے کہے گا۔

''اسی لیے تو کسی دوست کی لینڈ کروزر لے کر آیا ہوں کہ کسی بھی ایکسیڈنٹ میں محفوظ رہے۔میرے پاس اس قدر قیمتی انسان ہے۔اس کی حفاظت کے لیے ہر ممکن خطرے کو دھیان میں رکھ کر انتظامات کیے گئے ہیں۔''

توتا مینا کا مکالمہ جاری رہے گا....

''اچھا اگر یہاں سے بھی بچ گئے تو پھر رستے میں بلوائی ٹوٹ پڑیں گے اور گاڑی کو پتھر مار مار جلا دیں گے، باہر نکلنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔''

توتا مینا کی پیشن گوئی پر ہنسے گا۔

''آپ فکر نہ کریں۔پورا روٹ لگا ہوا ہے۔آپ کو سرکاری پروٹوکول میں لے جایا جا رہا ہے۔گاڑی کے رستے کی ساری ٹریفک جام ہے۔سڑک پر انسان چھوڑ پرندوں کا داخلہ

بھی ممنوع ہے۔"

"اگر یہاں سے بھی بچ گئے تو پھر...."

تو پھر یہیں بیٹھے بیٹھے پہنچ جائے گی وہ زرد چہرہ جو اس وقت پورے آثاروں کو اپنے سیاہ پروں سے لپیٹ چکی ہے۔ جس نے یہاں ہزاروں برس نسل در نسل کو ہڑپا ہے۔ وہ اب بھی ہڑپ لے گی۔ وہ ہر تدبیر ہر حفاظتی بند کو توڑ ڈالنے کے بے شمار داؤ پیچ جانتی ہے۔ ہر طریقہ اُس کی اپنی ایجاد ہے اور اتنے ہی مختلف طریقے جیسے آدم زاد ایک ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے مختلف فرق فرق۔ ایسے ہی ہر ایک کا موت طریقہ بھی ایک دوسرے سے مختلف۔ ایک ہوتے ہوئے بھی فرق فرق، زبردست ورائٹی

"اگر یہاں سے بھی بچ نکلے تو۔"

مینا توتے کی معصومیت پر مسکرائے گی، جیسے کہتی ہو اس کہانی کا انجام وہ نہیں ہے جس میں مینا کہتی ہے،"اگر یہاں سے بچ گئے تو سمجھو بچ گئے۔"

اس کہانی کا انجام صدیوں کا انجام ہے جس میں مینا بتاتی ہے۔"تو پھر کہیں اور ہونی گھیر لے گی۔"

محمد اسلم نے اُسے اُٹھانے کو ہاتھ بڑھایا۔ کیونکہ اُسے فکر تھی۔ دیر ہو جانے کی فکر۔ ڈی سی ہاؤس کے انتظامات باسی ہو جانے کی فکر۔ حجلۂ عروسی کے پھولوں کے مرجھانے کی فکر جس میں سے کسی نئی کونپل کے پھوٹنے کا امکان چاہے معدوم ہو لیکن ناممکن تو نہ تھا۔

صنوبر نے اپنا ہاتھ محمد اسلم کے مضبوط ہاتھ میں تھما دیا۔

"ہاں جانا تو ہوگا مگر کیا جانے سے پہلے ہم یہاں اپنے نام کندہ کر کے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔"

درختوں کے جھنڈ کے ہر تنے پر اَن گنت نام کندہ تھے۔ ایک دوسرے کے اوپر

کھدے ہوئے۔ جیسے قبریں منزل در منزل بنی ہوتی ہیں۔ پرانے نام ہموار کر کے نئے نام کھدے ہوئے نام در نام....

صنوبر نے ان گنت نام پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس زرد رو چہرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ماس بو ہر کہیں پھیلی تھی اور لٹی آنکھوں والا سیاہ فا کروب پوری طرح خبردار مخمور آنکھیں ذرا ذرا کھول کر جائزہ لیتا ہوا۔ موقع کے حصول کا جائزہ''ماس بو ماس بو'' کسی ضدی بچے کی احمقانہ خواہش اور ناراضی کی کلفت میں زردی لپٹی مسکراہٹ مزید پھیل کر ہونٹوں کی زرد قاشوں میں جم گئی۔

''اوئے دستگیرے! چاقو ہے تیرے پاس؟''

''یس سر۔ جی سر۔''

دستگیر دونوں ہاتھوں کی پلیٹ پر چاقو رکھے حاضر ہوا۔

محمد اسلم نے پرانے نام ہموار کر کے نئی جگہ نہیں بنائی۔ درخت کی سیاہ چھال اُکھاڑ کر چھوٹا سا قطعہ تراشنے لگا، زرد برادے اُڑے کچی کچی لکڑی کے اندر بھیگی بھیگی تراوٹ اٹھی۔ جو سانس لیتی تھی۔ جیسے جیسے نام کھد رہے تھے ویسے ویسے لکڑی کے زندہ بدن کی حرارت چھٹتی تھی۔

گرم چوبی سانس صنوبر کو اپنے سانسوں میں حلول ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ یہ پُرحرارت جاگتی لکڑی اپنے گرم سانسوں سے پورے ماحول کو زندہ کرتی ہوئی۔

محمد اسلم انتہائی مہارت سے نام گود رہا تھا۔ دونوں نام ساتھ ساتھ کھدے تھے جیسے گیلی سانس لیتی چوب کے سینے پر اکٹھے دھڑکتے ہوں۔ آدم۔ حوا۔

■■■■

اُردو ناول میں پنجاب اپنی تاریخ و تہذیب کے ساتھ مختلف سماجی طبقوں، علاقائی روایات اور زرعی بُو باس و متنوع پہلوؤں کے ساتھ، تفصیل میں دریافت ہو چکا ہے لیکن کسی ناول نگار نے بھولی بسری قومیتوں، نظر انداز کیے گئے قبیلوں اور زندگی کی لکیر کے نیچے دبے ہوئے انسانوں، نسلوں، ذاتوں اور اُن کی بولیوں کے ساتھ اُن کے رسوم و رواج کو جڑوں کے ساتھ کھوجنے کی وہ کوشش نہیں کی جو ناول نگار طاہرہ اقبال نے کی ہے۔ مشترکہ ہندوستان کے پنجاب کا ماضی اور تاریخ اپنی تہ دار پرتوں اور انسانی تجربوں کے لامحدود زاویوں کے ساتھ صرف طاہرہ اقبال کے ناولوں ہی میں ظاہر ہو سکا ہے۔ ''نیلی بار'' اور ''گراں'' کے بعد اب وہ ہڑپا تہذیب میں شامل انسانی زندگی کے تحرک کو زبان، سماج، روایات اور مزاج کے ساتھ دریافت کرنے کا تجربہ کر رہی ہیں۔

''ھڑپا'' میں محض ایک علاقے کی دنیا کے کردار اپنی جڑوں کے ساتھ دریافت نہیں ہوئے۔ یوں سمجھیں کہ ''ہڑپا'' پنجاب کا بحرِ بیکراں ہے جہاں تاریخی جدلیات انسانی رشتوں کے خمیر میں جس طرح جاگزیں ہے اُس کی خبر طاہرہ اقبال لے کر آئی ہیں۔ طاہرہ اقبال واحد ناول نگار ہے جو تحقیقی مطالعے کے زعم میں ناول نہیں لکھتیں۔ بہت سے ناول نگار گلبرگ میں بیٹھ کر بھولی بسری اور متروک تہذیبوں پر کی گئی تحقیق کے زور پر ناول لکھ کر نامور ہو جاتے ہیں، جبکہ طاہرہ اقبال کے آبا و اجداد اور اُس پر وہ تہذیب گزری ہے، اُس نے اُس میں سانس لے رکھا ہے۔ اُس میں زندہ ہے اور یہی اُس کی تخلیقی سچائی ہے۔ ''ہڑپا'' کی دنیا محدود نہیں ہے، وہ ہزاروں سال کی برصغیر کی تاریخی جدلیات میں ایسے شامل ہو جاتی ہے جیسے زیرِ زمین دریا آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے پنجاب کی رہتل اور اُس میں آباد انسانوں میں عورت کو جس رنگ روپ میں دیکھا ہے، ایسے دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد کی عورت کو کوئی ناول نگار نہیں دیکھ سکا۔ اگرچہ قرۃ العین حیدر، واجدہ تبسّم اور عصمت چغتائی جزوی طور پر اپنے اپنے علاقوں سے انصاف کر سکی ہیں مگر طاہرہ اقبال کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔

اصغر ندیم سیّد

BookCornerJlm
bookcornershowroom
bookcornerjhelum
bookcorner
0321-5440882
Jhelum (Pakistan)